اسلم کمال کی خطاطی کا ایک شاہکار نمونہ

اُردو ڈائجسٹ

جولائی 2014ء
رمضان المبارک 1435ھ
جلد نمبر 54 شمارہ نمبر 07

urdudigest.com www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ایڈیٹر: پروفیسر محمد فاروق قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: سید عاصم محمود
سب ایڈیٹر: غلام [illegible]
مجلس تحریر: جاوید فروغ حسن [illegible]
[illegible]: فاروق اعجاز قریشی
انچارج [illegible]: [illegible]
[illegible]: [illegible]
[illegible]: اشرف [illegible]

مارکیٹنگ

[illegible] 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com
[illegible] 0300-4116792
[illegible]
کراچی: [illegible] 0345-2558648

سالانہ خریداری

560 روپے کی بچت کے ساتھ
subscription@urdu-digest.com خریداری کے لیے رابطہ
[illegible] 19/21 92 42 37589957
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

URDU DIGEST Current A/C No. 803380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 • فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

قیمت 100 روپے

[illegible]

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

رمضان المبارک کا بابرکت مہینا شروع ہونے جا رہا ہے جس میں کائنات کا مالک اپنی رحمتوں کے دروازے اپنی مخلوق پر کھول دیتا ہے اور شیطان پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرتے ہوئے اس ماہ کی رحمتیں اور برکتیں سمیٹنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اس وقت عراق، لیبیا، مصر اور پاکستان کے مسلمان آپس کے اختلافات اور بداعمالیوں کی وجہ سے انتہائی مشکلات کا شکار ہیں اور ہر جگہ خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ پہلے کراچی ایئرپورٹ پر دہشت گردوں کا حملہ، پھر طاہر القادری کا امیریٹس ایئرلائن کے ساتھ بے ہودہ سلوک اور اب پشاور ایئرپورٹ پر پی آئی اے کے مسافر طیارے کی لینڈنگ کے دوران فائرنگ سے طیارے کے اندر موجود ایک خاتون جاں بحق اور کئی زخمی ہونے جیسے واقعات نے پاکستان کا دنیا بھر میں بڑا خوفناک تاثر قائم کر دیا ہے۔

غیر معمولی حالات غیر معمولی اقدامات کے متقاضی ہیں۔ ہماری افواج اس وقت آپریشن ضرب عضب میں مصروف ہیں۔ شدید گرمی میں لاکھوں افراد بے گھر ہو چکے ہیں لیکن بدقسمتی سے اس وقت ہمارے سیاسی قائدین سے جس سنجیدگی کی توقع تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ عمران خان حکومت کو الٹی میٹم دیتے اور جلسے کرتے نہیں تھکتے۔ ڈاکٹر طاہر القادری جو کینیڈا میں ایک پتا بھی نہیں ہلا سکتے، وہ پاکستان آ کر حالات کی سنگینی کا اندازہ کیے بغیر سارے معاملات زندگی درہم برہم کر دیتے ہیں اور حکومت جو صرف معیشت کے اہداف کنٹرول کرنے ہی کو اپنی کامیابی سمجھتی ہے حماقتوں پہ حماقتیں کیے جا رہی ہے۔ تمام سیاسی قائدین خصوصاً نواز شریف اور عمران خان کو اپنے اختلافات پس پشت ڈال کر قوم کو متحد کر کے اپنی افواج کے شانہ بشانہ کھڑا

فہرست

ہونا ہوگا۔ دنیا میں کوئی جنگ صرف فوج تنہا نہیں جیت سکتی۔ اس وقت پوری قوم کو ان کے ساتھ ۱۹۶۵ء کی طرح کھڑا نظر آنا چاہیے۔ نصف صدی قبل کا وہی جذبہ آج دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جب مساجد سے اعلان کیا گیا کہ دشمن کے چھاتہ بردار رات کے اندھیرے میں پاک سرزمین پر اتر آئے ہیں تو اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر لوگ ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں لیے انھیں ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اس کے برعکس گزشتہ دنوں اسلام آباد میں ڈاکٹر طاہر القادری کے جیالوں کا پولیس پر پتھراؤ اور کیلوں والے ڈنڈوں سے وردی میں ملبوس پولیس اہلکاروں کی دھنائی.. اور لاہور میں پولیس کی ان پر اندھادھند فائرنگ جس کے نتیجے میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں ایسے واقعات کا گہرائی سے جائزہ لینا ہوگا۔ گلو بٹ کا "کمانڈو ایکشن" اور پھر عدالت کے باہر وکلا اور شہریوں کے ہاتھوں اس کی پٹائی تیزی سے تبدیل ہوتے حالات کا اشارہ دے رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ۱۹۸۰ء میں برلن ہارٹز کا واقعہ جرائم اور دہشت کے گڑھ نیویارک شہر کے حالات تبدیل کرنے کے حوالے سے ٹپنگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ آج شکست خوردہ گلو بٹ، پولیس، حکمران، صحافی اور عوام سب ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ اس دباؤ سے نکلنے کے لیے ہمیں اپنے اردگرد کے ماحول کو بہتر بنانا ہوگا۔ معمولی جرائم، بدنظمی اور اخلاقی زوال کی روک تھام بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ کیلنگ، برٹن، ذیوڈ اور جیولانی..... اگر یہ چار افراد "ٹوٹی کھڑکی تھیوری" پر عمل کرکے نیویارک کو زندگی لوٹا سکتے ہیں تو کیا ہم ہر صوبے اور شہر سے ایسے چند افراد نہیں ڈھونڈ سکتے؟ میرے نزدیک ذوالفقار احمد چیمہ جیسی صفات کے حامل چند افراد یہ معرکہ احسن طریقے سے سر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

انتشار زدہ نیویارک شہر کی رونقیں کیسے بحال ہوئیں؟ صفحہ نمبر ۹۴ پر پورے ہوش و حواس کے ساتھ پڑھیے۔

طیب اعجاز قریشی

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

فہرست

گوشۂ رمضان

کشمیریات

سید علی شاہ گیلانی

بھارتی آمریت جنہیں خرید سکی نہ جھکا سکی

محبوب جیلانی

پاکستانیات

امریکا آباد ہوں یا کینیڈا؟

بھارتی نئی نسل کا سوال

ذوالفقار احمد چیمہ

فہرست

اُردو ادب

طب و صحت

دلچسپ و عجیب

ملکی بقا کی جنگ میں عوام کا اہم کردار

ہماری پُرعزم اور بہادر فوج شمالی وزیرستان میں قومی سلامتی اور آئندہ نسلوں کے تحفظ کی جنگ لڑ رہی ہے جو روایتی جنگوں کے مقابلے میں بڑی جاں گسل اور صبر آزما ہے۔ وزیراعظم نواز شریف امن کو ایک اور موقع دینے کے لیے طالبان سے مذاکرات کا آپشن آزمانا چاہتے تھے مگر مختلف وجوہ سے بیل منڈھے نہ چڑھی اور کراچی ایئرپورٹ پر ازبک دہشت گردوں کا خونخوار حملہ ہو گیا۔ اس حادثے کے بعد سیاسی اور عسکری قیادت سر جوڑ کر بیٹھی اور تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد شمالی وزیرستان میں ایک مکمل فوجی آپریشن کا فیصلہ ہوا جہاں ازبک جنگجوؤں کے محفوظ ٹھکانے بتائے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں وزیراعظم کی طرف سے آپریشن کے اعلان کی بیشتر سیاسی جماعتوں نے کھل کر حمایت کی البتہ چند آوازیں یہ بھی سنائی دیں کہ حکومت نے مذاکرات کے پورے احوال کے بارے میں قوم کو اعتماد میں نہیں لیا اور اگر ایک ٹھیک حکمت عملی اپنائی جاتی تو بات چیت سے مثبت نتائج حاصل کیے جا سکتے تھے۔ اب حالات اس بحث و تکرار سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور قوم کو پوری طرح یکسو ہو کر "ضربِ عضب" کو ایک پائیدار کامیابی سے ہمکنار کرنا ہو گا۔

آج کے زمانے میں گوریلوں کے خلاف جنگ پوری قوم اپنی تمام تر توانائیوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہی جیت سکتی ہے۔ روایتی جنگ میں دشمن سامنے ہوتا ہے اور اس کی طاقت کا اندازہ اس کی تعداد اور اسلحے کی نوعیت سے لگایا جا سکتا ہے لیکن گوریلا جنگ میں دشمن جنگلوں، غاروں یا اپنے درمیان ہی چھپا ہوتا اور اس کی حمایت کا سرچشمہ وہ عام آبادی ہوتی ہے جو نظریے کی بنیاد پر اس کے ساتھ پیوست ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے مذہبی انتہاپسندوں کا مکمل صفایا کرنے کے لیے منظم فوجی طاقت کے علاوہ علما، اہلِ دانش اور میڈیا کی بڑے پیمانے پر کمک درکار ہوتی ہے۔ عام شہریوں کو نہایت آسان اور سہل انداز میں بار بار یہ بتانے اور ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر شریعت نافذ کرنے کا نعرہ بلند کرنے والے اور بے گناہ لوگوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے والے اسلام اور انسانیت کے دشمن اور اللہ تعالیٰ کے شدید عذاب کے مستحق ہیں۔ ہر مسجد سے یہ آواز بلند ہونی چاہیے کہ جو شخص ان خودکش حملہ آوروں سے کوئی تعلق رکھے گا یا انھیں پناہ دے گا یا انھیں کسی طرح کی امداد فراہم کرے گا تو اس کا شمار ریاست کے دشمنوں اور اللہ تعالیٰ کے دھتکارے ہوئے بندوں میں ہو گا۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت دین کی آگہی اور عام ذہنی بیداری پھیلانے کی ہے اور یہ سارا کام بڑی حکمت اور نہایت

دانائی کے ساتھ کرنے کا ہے اور اس میں انسانی نفسیات کو مرکزی حیثیت دینا ہو گی۔ اس محاذ پر ہمیں جس قدر کامیابی حاصل ہو گی اسی قدر قومی بقا کی جنگ جیت لینے کے امکانات یقینی ہوتے جائیں گے۔

اس جنگ کا دوسرا بڑا محاذ شمالی وزیرستان سے بےگھر ہونے والے لاکھوں افراد کی دیکھ بھال کا ہے۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اجنبی علاقوں میں آ رہے ہیں اور اپنے وطن کی خاطر بے مثال قربانیاں دے رہے ہیں۔ ان کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھا جاتا رہا تو وہ دشمن کے مقابلے میں ایک سیسہ پلائی چٹان ثابت ہوں گے۔ اس کے برعکس ان کی آزمائش کا دورانیہ ناقابلِ برداشت ہونے لگا تو خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر حملہ آوروں میں تبدیل ہو جائیں۔ سوات میں آپریشن سے پہلے آبادی کی وسیع پیمانے پر نقل مکانی ہوئی تھی اور اہلِ وطن ان کی مدد کے لیے کشاں کشاں آئے تھے۔ کراچی کے صنعت کار اور کاروباری طبقوں نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ پنجاب کے لوگوں نے زبردست جذبۂ اخوت کا ثبوت دیا تھا اور مردان اور صوابی کے پختونوں نے انہیں اپنے گھروں میں مہمانوں کی طرح ٹھہرایا تھا۔ آج بھی حکومتِ پنجاب نے ۵۰ کروڑ اور حکومتِ سندھ نے ۵ کروڑ روپے دینے کا اعلان کیا ہے مگر خبریں آ رہی ہیں کہ حکومت نے بنوں میں جو کیمپ قائم کیے ہیں وہ ہر اعتبار سے حد درجہ ناقص اور تکلیف دہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں قیام کرنے والے خاندانوں کی تعداد صرف سیکڑوں میں ہے جبکہ چار لاکھ سے زائد افراد نقل مکانی کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں عوامی سطح پر تنظیمات دینے کی ایک طاقتور تحریک شروع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دینی جماعتوں کو ایک فلاحی فنڈ قائم کرنے میں اب تاخیر نہیں کرنی چاہیے جس میں باوسائل اور مخیر حضرات دل کھول کر چندہ دیں اور سماجی تنظیموں کے رضاکار جوق در جوق ان علاقوں کا رخ کریں جہاں بےگھر خاندان منتقل ہو رہے ہیں۔

ہمارے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو عوام کے اندر وہ جذبہ اور جوش پیدا کرنے کا سلسلہ اب تک شروع کر دینا چاہیے تھا جو ہم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران دیکھا تھا۔ ریڈیو پاکستان سے قومی ملی ترانے اور نغمے نشر ہو رہے تھے مساجد سے جذبۂ جہاد ابھارا جا رہا تھا اور خون دینے کے لیے نوجوان رضاکارانہ طور پر نکل آئے تھے۔ شہری اپنے شیر دل فوجیوں پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے اور ان کے قدموں میں اپنا دل بچھا رہے تھے۔ دونوں زمانوں کی جذباتی کیفیتوں میں اگرچہ بہت فرق ہے مگر دونوں ہی میں آزمائش کی گھڑی بہت کڑی تھی۔ ہمیں اپنی فوج کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا اور ان کی جرأتوں اور قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا اور اپنی حمایت کا عملی ثبوت دینا ہو گا۔

ہمارے سیاسی قائدین کو مختلف تنازعات میں الجھنے اور ذہنی انتشار پھیلانے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ ضربِ عضب کی مستحکم کامیابی پر مرکوز کر دینے کی راہ اختیار کرنا ہو گی۔ آج ہمیں اپنی بقا کا ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے جو قومی یک جہتی ہی سے سر کیا جا سکے گا۔ فوج کامیاب ہو گی تو قوم سربلند رہے گی اور عظیم الشان ترقیاتی منصوبوں کے خواب پورے ہو سکیں گے۔ یہ بات بار بار دہرائی جانی چاہیے اور اس کا چرچا ہر محفل میں ہونا چاہیے کہ دہشت گردوں کی سرکوبی ہی میں ہماری فلاح اور بقا مضمر ہے ورنہ باہر سے سرمایہ کاری ہو گی نہ ہماری عزتیں محفوظ رہیں گی نہ ہم اپنے ہی ملک میں محفوظ سفر کر سکیں گے۔ عوام ایک جذبے کے ساتھ اٹھیں گے تو سیاسی تفرقوں کے الاؤ بھی بجھنے لگیں گے اور انتقام کا تباہ کن کلچر بھی دم توڑ دے گا اور ہم سلامتی کے راستے پر نکل کھڑے ہوں گے۔

الطاف حسن قریشی

آزمائشوں میں جکڑا ہوا پاکستان

مملکتِ خداداد اپنی بقا اور سلامتی کے لیے چوتھی جنگ لڑ رہی ہے۔

گزشتہ چھ سات ماہ میں بڑے دلدوز واقعات رونما ہوئے ہیں اور آئندہ کون کون سے فیصلہ کن مراحل آنے اور امکانات پیدا ہونے والے ہیں' ان اہم سوالات کا تجزیہ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

شیخ الاسلام علامہ طاہر القادری اپنے چھ نکات حکومت سے تسلیم کروا کر منہاج القرآن سیکرٹریٹ ماڈل ٹاؤن خیریت سے پہنچ گئے ہیں جہاں سے وہ عوامی انقلاب کی قیادت فرمائیں گے۔ اُن کا بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ وہ اس وقت تک امارات ایئرلائن کے طیارے سے باہر نہیں آئیں گے جب تک فوج ان کی سیکورٹی کی ضمانت نہیں دے گی اور کور کمانڈر یا ان کا نمائندہ ائیر پورٹ پر نہیں آئے گا' مگر جب انہیں گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد نے دوٹوک لہجے میں بتایا کہ ان کے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے سول حکومت متاثر ہوگی' تو وہ گورنر پنجاب چودھری محمد سرور کی حفاظت اور چودھری پرویز الٰہی کی رفاقت میں ائیرپورٹ سے باہر آنے پر آمادہ ہوگئے۔ تحصیلن کے لیے انہوں نے چاند مانگا تھا' مگر وہ بڑی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے چھ مطالبات کی زینی سطح پر آ گئے جو درج ذیل ہیں اور انہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ان کے عزائم کیا ہوں گے:

۱۔ انہیں ذاتی سیکورٹی میں گھر جانے دیا جائے۔

۲۔ ذاتی محافظوں کو طیارے تک آنے کی اجازت ہو۔

۳۔ حکومت بلٹ پروف گاڑیاں فراہم کرے۔

۴۔ میڈیا پورے سفر کی لائیو کوریج کرنے کا پابند ہو۔

۵۔ گھر تک واپسی کے سفر میں گورنر پنجاب اُن کے ساتھ رہیں۔

۶۔ اُن کے سیکرٹریٹ کے سامنے بیریئر دوبارہ لگائے جائیں۔

ڈاکٹر طاہر القادری ایک طویل سفر طے کر کے پہلے کینیڈا سے لندن آئے اور ہیتھرو ائیرپورٹ سے دبئی روانہ ہوتے وقت میڈیا سے خطاب میں اپنے پیروکاروں سے کہا کہ اگر میں شہید کر دیا گیا' تو وہ میرے خون کا انتقام لینے کے بجائے پُرامن رہیں اور میرے خون سے جو انقلاب آئے گا' اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے سر

دھڑ کی بازی لگا دیں۔ وہ فلائٹ نمبر پی کے ۲۱۲ سے اسلام آباد روانہ ہوئے۔ ان کے طیارے کو صبح ساڑھے آٹھ بجے راولپنڈی ایئرپورٹ پر اترنا تھا جسے شیخ الاسلام طاہر القادری کے جاں نثاروں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور انتظامیہ کی طرف سے کھڑی کی جانے والی تمام رکاوٹیں ہٹاتے اور سو کے لگ بھگ پولیس والوں کو زخمی کرتے فرنٹ گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ کسی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے ایئرایوی ایشن کے حکام نے طیارے کے ہواباز کو فلائٹ کا رخ لاہور کی طرف موڑ دینے کے لیے کہا اور طیارہ بحفاظت لاہور ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ اس میں شیخ الاسلام کے علاوہ دو سو کے لگ بھگ ان کے متوالے سفر کر رہے تھے جو اپنی نشستوں پر کھڑے ہو کر پرواز کے دوران فلک شگاف نعرے لگاتے رہے۔ عملے نے انہیں سمجھایا کہ اس طرح جہاز کا توازن بگڑ سکتا ہے اور کوئی بھی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے۔ لاہور ایئرپورٹ پہنچنے کے بعد جناب طاہر القادری نے اپنی شرائط پیش کیں اور دھمکی دی کہ اگر انہیں تسلیم نہ کیا گیا، تو وہ طیارے سے باہر نہیں آئیں گے۔ اس پر گورنر عشرت العباد نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ ان سے بہت باتیں کرتے اور تاویلیں کی لاتے رہے۔ انہیں بتایا کہ اگر وقت زیادہ گزر گیا تو ان پر طیارے کو ہائی جیک کرنے کا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ اس وقت علامہ صاحب کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اگر پندرہ منٹ میں طیارے سے باہر نہ آئے، تو ایئرکنڈیشننگ کا سسٹم بند کر دیا جائے گا۔ ایک ماہر قانون کی حیثیت سے انہوں نے سارے مضمرات کا اندازہ لگاتے ہوئے گورنر پنجاب چودھری محمد سرور کی طرف سے تحفظ کی پیشکش قبول کر لی اور یوں خوش اسلوبی سے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق ڈیڈلاک سات سیاسی شخصیات کے تدبر سے ختم ہوا جن میں وزیراعظم نواز شریف، وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف، وزیر داخلہ چودھری نثار علی خان، چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی کے علاوہ گورنر سندھ عشرت العباد اور گورنر پنجاب چودھری محمد سرور شامل ہیں۔ جناب چودھری محمد سرور کی شخصیت کو شیخ الاسلام طاہر القادری نے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور اپنا قابلِ اعتماد دوست قرار دیا تھا۔

⁂

منہاج القرآن کے سیکرٹریٹ پہنچ جانے کے بعد اور جناح ہسپتال میں زخمی کارکنوں کی عیادت کے دوران جناب طاہر القادری نے عالمِ طیش میں بڑی سخت باتیں کیں۔ فرمایا میرا جہاز ہائی جیک کیا گیا، اس کا انتقام لوں گا۔ نواز شریف اور شہباز شریف جو آج کے ہٹلر اور مسولینی ہیں، وہ گولیوں سے جسم چھلنی تو کر سکتے ہیں، لیکن انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتے۔ میری ان سے جنگ ہو گی، یا میں نہیں رہوں گا یا وہ نہیں رہیں گے۔ میرا سفر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک عوام کا مقدر نہیں بدل جاتا۔ میں خونِ شہیداں کے ایک ایک قطرے کا انتقام لوں گا اور انہیں شہیدوں اور زخمیوں کو انصاف دینا ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ حکمرانوں سے لوٹی ہوئی جائدادیں واپس لیں گے اور انہیں ملک سے بھاگنے نہیں دیا جائے گا۔ عوامی انقلاب کے بعد نظام بدلے گا جس کے بعد میں خود ملک میں شفاف انتخابات کراؤں گا۔ وہ یہ بھی فرماتے رہے کہ مجھے کوئی لالچ نہیں، اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت دی ہے۔ ان کا یہ بھی فرمان تھا کہ سیاسی جماعتوں کے ساتھ مشاورت کے بعد وہ جلد ہی انقلاب کی کال دیں گے۔ پاکستان میں بیشتر فی

ٹی وی چینلز نے ان کی سرگرمیوں کی دن رات چار دنوں تک لائیو کوریج کی' لاکھوں لوگوں نے اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھے' اُن کے جذبات سے لرزتے الفاظ سنے اور اُن پر طاری ہونے والی ہذیانی کیفیت کا بھی مشاہدہ کیا۔ ڈرامے کے ڈراپ سین پر سوشل میڈیا میں عجب عجب تبصرے ہوتے اور فقرے کسے جاتے رہے۔ اس پورے منظر نامے میں حیران کن بات یہ تھی کہ عالمی میڈیا میں وہ اس بار کوئی قابلِ ذکر جگہ نہ بنا سکے حالانکہ اُن کے بارے میں یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ وہ خارجی طاقتوں اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے اشارے پر پاکستان آئے ہیں۔ یہ بھی عجب ہوا کہ وہ فوج کو آواز دیتے رہے' لیکن اُدھر سے کوئی جواب ہی نہ آیا' چنانچہ قادری صاحب کو اُن یقین دہانیوں پر اعتبار کرنا پڑا جو پنجاب کے غیر سیاسی گورنر کی طرف سے دی گئی تھیں۔

پاکستان کے لیے جناب طاہر القادری ایک بہت بڑا اثاثہ بھی ہیں اور ایک نہایت کڑی آزمائش بھی۔ انہوں نے کمال ریاضت اور غیر معمولی ذہانت سے اپنی علمیت کا سکہ قائم کیا۔ وہ ایک دور افتادہ علاقے جھنگ سے لاہور آئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی' لا کالج ہی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں اسلامی علوم و فنون میں بھی ایک مقام حاصل کیا۔ اُن کی خطابت کا فسوں پھیلتا گیا اور عقیدت کا جادو جگاتا رہا اور انہوں نے خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے پورے ملک میں کالجوں اور درسگاہوں کا ایک سلسلہ قائم کیا۔ بریلوی مکتبِ فکر کے لاکھوں نوجوان پاکستان عوامی تحریک سے وابستہ ہوتے گئے۔ اب وہ سالہا سال سے کینیڈا میں اقامت پذیر ہیں اور مختلف زبانوں میں اسلام کی تبلیغ یورپ میں کر رہے ہیں۔ انہوں نے علم و تحقیق کا ایک ایسا مرکز قائم کر لیا ہے جس کے لیے اُن کے پرستار ہر سال کروڑوں روپے کا عطیہ بھی کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کا فائدہ پاکستان بھی اٹھا سکتا ہے۔ یہ قادری صاحب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے طالبان کے خلاف مضبوط دلائل کے ساتھ فتویٰ جاری کرتے ہوئے انہیں اسلام کا دشمن قرار دیا تھا۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ وہ ہمارے نظام کی جن خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں' اُن کی اصلاح کے لیے آگے بڑھنے کے لیے ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ ملک سے کرپشن کا خاتمہ ہو اور دیانت داری کا چلن عام ہو جائے۔ ہم سب یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری اسمبلیوں میں جو لوگ بیٹھے ہیں' اُن میں سے ۸۰ فی صد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونے چاہئیں۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں امیروں اور غریبوں کے درمیان فاصلے ہولناک حد تک بڑھتے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور بے آسرا آدمی کے لیے عزت کے ساتھ سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا ہے۔ اب اگر ڈاکٹر طاہر القادری معاشرے میں عدل اور انصاف کی بنیاد پر انقلاب لانے کا نیک نیتی سے بیڑا اٹھاتے ہیں' تو انہیں عوام کے بہت بڑے طبقے کی حمایت حاصل ہونے کا قوی امکان پایا جاتا ہے۔

☆

اس بحث میں اُلجھنے کے بجائے کہ ڈاکٹر طاہر القادری عوامی انقلاب لانے میں کتنے سنجیدہ ہیں اور اُن میں اتنا عظیم کارنامہ سرانجام دینے کی صلاحیت کس قدر ہے' ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ وہ اس وقت پاکستان کو آزمائشوں کے شکنجے سے رہائی دلانے میں کیا کیا کام کر سکتے ہیں۔ اُن کے جناب چودھری محمد سرور سے اچھے

تعلقات ہیں جن کو وزیراعظم نے مفاہمت کی راہیں کھولنے کا جو مشن تفویض کیا ہے، اس کا اولین تقاضا یہی ہے کہ جن نکات پر اتفاق ہو سکتا ہے انہیں اہمیت دی جائے۔ آج کی پریشان کن صورتِ حال میں ڈاکٹر قادری ضربِ عضب کی بھرپور کامیابی میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس طرف انہوں نے ازخود بہت اچھا قدم اٹھایا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ وہ ۲۷ جون سے مسلسل چار ہفتے یومِ ضربِ عضب منائیں گے، شمالی وزیرستان کے متاثرین کے لیے خوراک اور دواؤں کے پچیس ہزار پیکٹ پہنچائیں گے اور پورے ملک میں یونین کونسل کی سطح پر متاثرین کی امداد کے لیے کیمپ لگائے جائیں گے۔ وہ اپنی تنظیم کے ذریعے لوگوں کو بڑے پیمانے پر موبلائز کر سکتے اور فوج کو بہت بڑی سپورٹ فراہم کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ وہ ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی سرانجام دے سکتے ہیں کہ طالبان کی طرف سے دین کی غلط اور گمراہ کن تعبیرات کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کی صحیح تصویر پیش کرنے کا مشن اپنے ذمے لے لیں اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس خلجان سے باہر نکالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں جو طالبان کے متعلق ذہنوں میں پھیلا رکھے ہیں۔ رمضان المبارک میں امن اور سلامتی پر مبنی اسلامی تعلیمات پر خطبات دیے جائیں اور کروڑوں کی تعداد میں پمفلٹ اور ویڈیو تقسیم کی جائیں۔ جناب طاہر القادری نظریاتی محاذ پر زبردست کام کرنے کی صلاحیت اور ساز و سامان رکھتے ہیں۔ ان تعمیری سرگرمیوں کا حصہ بن جانے کی صورت میں وہ غیر ضروری باتوں سے قدرتی طور پر اجتناب کریں گے اور انقلاب کی کال دینے میں عجلت سے کام نہیں لیں گے۔ انہوں نے واضح طور پر یہ عندیہ دے دیا ہے کہ وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے فوجی آپریشن میں کوئی خلل واقع ہونے کا امکان پایا جاتا ہو۔

اس حقیقت کے باوجود کہ بریلوی مسلک سے وابستہ تمام اکابر جناب طاہر القادری کو اپنا لیڈر تسلیم نہیں کرتے اور ان کے مد مقابل بڑی قد آور شخصیتیں اور جماعتیں موجود ہیں، تاہم آنکھیں نوجوان بالخصوص خواتین ان سے گہری ارادت رکھتی ہیں، اس لیے ان کے لیے اپنے آپ کو ایک مذہبی شخصیت کے طور پر آگے لانا ہی مناسب رہے گا۔ وزیراعظم بننے کی لامحدود خواہش نے ان کے امیج کو بہت متنازع بنا دیا ہے اور ان کے بعض نقاد ان پر خودنمائی کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ وہ اپنے چند ہزار یا چند لاکھ پیروکاروں کی مدد سے حکومت ہاتھ میں لے کر شفاف انتخابات کرانے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق حکومت قائم کرنے کا پروگرام دے چکے ہیں اور یہی کام طالبان بندوق کی طاقت سے کرنا چاہتے ہیں، تو پھر ان میں اور دہشت گردوں میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ ان کی اصل شناخت تو یہ ہے کہ وہ طالبان کی گمراہ کن دینی تعبیر کے سامنے ڈٹ گئے ہیں اور اس فتنے کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ اب اگر آپ بھی لانگ مارچ کے ذریعے اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں تو اس کے بطن سے ایک اور فتنہ جنم لے گا جو انارکی پر منتج ہو سکتا ہے۔ وہ جس انقلاب کی بات کر رہے ہیں، اس کے لیے کمزور طبقوں کے اندر سالہا سال کام کرنا، ان کے درمیان رہنا اور ان کے معیار کے مطابق زندگی گزارنا ایک بنیادی تقاضا ہے۔ علامہ طاہر القادری کا جو چہرہ انتخابات سے چھ ماہ پہلے اسلام آباد کے دھرنے اور حال ہی میں امارات ایئرلائن کے اندر نظر آیا، وہ انقلاب کی روح سے یکسر متصادم نظر آتا ہے۔ سخت سردی میں وہ خود آرام دہ کنٹینر میں بیٹھے رہے جبکہ ہزاروں بچے، عورتیں اور بوڑھے بری طرح ٹھٹھرتے

اور ان گنت مسائل کا سامنا کرتے رہے۔ اس طرح وہ امارات ائیر لائن میں بزنس کلاس میں سفر کر رہے تھے اور افرد محکوم طبقات کی تقدیر بدل دینے کا اظہار کر رہے تھے۔ بلاشبہ انہیں سانحہ ماڈل ٹاؤن سے بڑی تکالیف پہنچی ہے اور اسی لیے انہوں نے نواز شریف اور شہباز شریف کو ہٹلر اور مسولینی کے القاب عطا کیے ہیں' مگر ائیر پورٹ راولپنڈی کے اردگرد عوامی تحریک کے سرفروشوں نے جس طرح سو کے لگ بھگ پولیس کے جوانوں کو زخمی کیا اور ان کے بازو توڑ ڈالے' اس نے یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ طاہر القادری کی فورس کے اندر بھی تشدد کا رجحان پایا جاتا ہے اور عین ممکن ہے کہ سانحہ ماڈل ٹاؤن میں بھی اس نے اشتعال انگیز کردار ادا کیا ہو جس سے پھوٹنے والا خونیں حادثہ ہماری رسوائی کا باعث بنا ہے۔

......☆......

ڈاکٹر طاہر القادری کے حد سے بڑھتے ہوئے شوق سیاست اور نعرۂ انقلاب کے خلاف داخلی اور بیرونی سطح پر ایک ردعمل سامنے آرہا ہے۔ سنجیدہ سیاسی قیادتیں انہیں ایک بلبلہ سمجھتی ہیں' تاہم وہ عناصر ان کے کندھے پر سوار ہو جانا چاہتے ہیں جو حکومت کو غیر جمہوری طریقے سے ہٹا دینے کے آرزومند ہیں۔ ان میں قاف لیگ کے چند قائدین' اقتدار سے محروم چھوٹی چھوٹی جماعتیں اور حضرت عمران خان شامل ہیں۔ تحریک انصاف کے سربراہ اعلان تو یہ کرتے ہیں کہ وہ جمہوریت کو پٹڑی سے نہیں اترنے دیں گے' مگر عالم اضطراب میں کبھی پختونخوا کی اسمبلی توڑنے کی دھمکی دیتے ہیں اور کبھی انقلاب کی خاطر طاہر القادری کا ساتھ دینے کی بات کرتے ہیں۔ شاید ان من چلوں کا خیال یہ ہے کہ عوام جو مہنگائی' بیروزگاری اور لوڈشیڈنگ سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور ان پر عملاً انصاف کے دروازے بند ہیں' انہیں اشتعال دلا کر سڑکوں پر لایا اور عدالت کی مشینری کو مفلوج کیا جا سکتا ہے کیونکہ پولیس اور فوج میں عوام کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ قائد انقلاب کو معروف برطانوی اخبار ''ٹیلی گراف'' نے ''کنٹینر کلیرک'' (Cleric) لکھا ہے اور یہ تبصرہ کیا ہے کہ جہاز کی بزنس کلاس میں بیٹھ کر عوامی انقلاب کا اعلان کرنے والے شخص کے پاس کوئی پالیسی نہیں۔ اس کو صرف ٹیلی ویژن پر آنے کا شوق ہے۔ اخبار نے اپنے اسلام آباد کے نامہ نگار کی دی ہوئی رپورٹ میں کہا ہے کہ طاہر القادری نے اس سے قبل بھی اسلام آباد میں ایک بلٹ پروف کنٹینر میں بیٹھ کر انتخابی اصلاحات کے لیے دھرنا دیا تھا۔ چند وزرا ان سے آکر ملے تھے اور انہوں نے دھرنا ختم کر دیا تھا۔ اب وہ عوامی انقلاب کا نعرہ لگا کر کینیڈا سے پاکستان آئے اور ان کے طیارے کا رخ اسلام آباد سے لاہور کر دیا گیا۔ وہ امارات ائیر لائن کی بزنس کلاس سیٹ پر بیٹھ کر انقلاب لانچ کرنے کی کوشش کرتے رہے' مگر گورنر پنجاب کے آنے کے بعد طیارے سے اتر آئے۔ درحقیقت ان کے پاس کوئی پالیسی ہے ہی نہیں۔ اسی موضوع پر قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف سید خورشید شاہ نے کہا ہے کہ طاہر القادری ایک جذباتی آدمی ہیں' جذبات میں آ کر بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور انہیں سیاست کا کچھ پتہ نہیں۔ اس وقت جب دہشت گردی کے خلاف پاک فوج کا آپریشن جاری ہے' اس میں عوامی تحریک اور حکومت جو کچھ کر رہی ہے' اسے ہم دانش مندی نہیں کہہ سکتے۔ جمعیت علمائے پاکستان جس کا تعلق بریلوی مسلک سے ہے' اس کے مرکزی راہنما جناب اعجاز ہاشمی نے مشورہ دیا ہے کہ

جناب طاہرالقادری کو شور شرابہ کرنے کے بجائے سنجیدہ سیاست کرنی چاہیے۔ معروف قومی فنکار کہہ رہے ہیں کہ طاہرالقادری کو ہر چھ ماہ بعد انقلاب کا دورہ پڑتا ہے۔

سید خورشید شاہ کا یہ تجزیہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب ہماری فوج دہشت گردوں سے نبرد آزما ہے اور وطن کی سلامتی کے تحفظ پر اپنی جانیں قربان کر رہی ہے، عوامی تحریک اور حکومت جو کچھ کر رہی ہے، وہ دانش مندی پر مبنی ہرگز نہیں۔ جناب ڈاکٹر طاہرالقادری نے گورنر پنجاب کی یقین دہانیوں پر اعتماد کر کے ایک صلح کن راستہ اختیار کیا ہے، اس لیے ان کے جائز مطالبات قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح سانحہ ماڈل ٹاؤن کا حقیقت پسندانہ اور بے لاگ جائزہ لینے اور اس سے اٹھنے والے سوالات پر بڑی سنجیدگی سے غور و فکر ضروری ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قادری حضرت اقبال کے اس شعر کی زندہ تصویر ہیں:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

ان کی مضطرب روح کو قرار نہیں اور اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں کوئی بڑا مشن سونپ دیا جائے اور ان کی بے پناہ کشاکش کو وقتی طور پر ایک طرف رکھتے ہوئے ان کی صلاحیتیں قومی تعمیر کے لیے بروئے کار لائی جائیں۔ جناب وزیر اعلیٰ شہباز شریف نے طاہرالقادری صاحب کی چٹکی لیتے ہوئے یہ شعر پڑھا ہے:

کیا اٹھے تھے تن کے حریفانِ انقلاب
چمکی ذرا سی دھوپ تو کمروں میں آ گئے

ہمارے وزیر اطلاعات جناب پرویز رشید جن کی باتوں میں بڑی کاٹ ہوتی ہے، انہوں نے جناب قادری صاحب کو "مژدہ" سنایا ہے کہ وہ پاکستان اپنی خوشی سے آئے ہیں اور واپسی قانون کی مرضی سے ہوگی۔ جناب خواجہ سعد رفیق نے اپنے مخصوص لہجے میں سادہ سا پیغام دیا ہے کہ ہم قادری کا ووٹ سے انقلاب تو قبول کر سکتے ہیں اور چند ہزار کرداروں کا فیصلہ کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہمیں خوش گمانی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور حکومت کی تکرار کے باوجود کوئی ایسا راستہ نکل آئے گا جو سیاست کی آزمائشوں میں کمی کا باعث بن سکتا ہے۔

٭

سانحہ ماڈل ٹاؤن بظاہر ایک واقعہ ہے مگر اس سے جڑے اثر ہوئے ہیں اور ایک لرزہ خیز صورت حال سامنے آئی ہے۔ اب جوں جوں حالات کی تہیں کھلتی جا رہی ہیں، گورننس کا بریک ڈاؤن بدترین شکل میں ابھرتا جا رہا ہے۔ اب یوں لگتا ہے کہ آنکھ موند لیں جائیں حدود یہ سیاسی مفلسی، انتظامیہ کی شدید نااہلی اور بے مہار پولیس کی سنگ دلی کی نذر ہو گئی ہیں۔ سب سے تکلیف دہ انکشاف یہ ہے کہ شہریوں کی وحشیانہ ہلاکت کا سانحہ جناب وزیراعلیٰ کی اپنی بستی میں رونما ہوا اور انہیں اس کی خبر الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے سے ہوئی۔ اس قدر المناک حادثے کی ذمے داری لینے کے لیے کوئی سیاسی راہنما اور انتظامیہ اور پولیس کا اعلیٰ عہدیدار تیار نہیں گویا گورننس کا پورا نظام انتہائی مخدوش حالت میں ہے۔ جناب شہباز شریف کو سانحے کی خبر ملی تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ "میری چھ سال کی محنت اکارت چلی

گئی۔ بلاشبہ انہوں نے پنجاب کا اقتدار سنبھالنے کے بعد سیاسی انتقام کا سلسلہ یکسر ختم کر دیا تھا اور جب ڈاکٹر طاہر القادری دسمبر ۲۰۱۲ء میں لاہور آئے اور انہوں نے اسلام آباد تک عوامی مارچ کیا' تو ان کو پورا پروٹوکول دیا گیا تھا اور تسلی بخش حفاظتی انتظامات دیکھنے میں آئے' مگر ان واحد میں منہاج القرآن سیکرٹریٹ کے سامنے براہ راست گولیاں لگ جانے سے آٹھ شہریوں کا زندگی کھو بیٹھنا جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں' خادم پنجاب کی انتظامی اہلیت پر بہت بڑا سوال منڈلا رہا ہے اور ان کے امیج میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کر دیا ہے' وزیر قانون جناب رانا ثناء اللہ سے استعفیٰ لے لیا ہے اور اپنے پرنسپل سیکرٹری ڈاکٹر توقیر شاہ کو ذمے داریوں سے فارغ کر دیا ہے۔ سیاسی مبصرین اس اقدام کو اچھی حکمرانی کی طرف بہت بڑی پیش قدمی خیال کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں ایک بہت بڑا ''اور بال'' وفاق کی سطح پر بھی رونما ہونے والا ہے۔

اس ہولناک سانحے کی تحقیقات کے لیے جناب جسٹس باقر نجفی کی سربراہی میں جو عدالتی کمیشن قائم ہوا ہے' اس سے عوامی تحریک قانونی طور پر لاتعلق ہے' لہٰذا [illegible] رانا ثناء اللہ اور ڈاکٹر توقیر شاہ۔ اس روش سے معاملات میں الجھاؤ پیدا ہوگا اور مجرموں کو انصاف [illegible] سے میں لانا دشوار تر ہوتا جائے گا۔ جناب وزیراعظم کو آئی ایس آئی' ایم آئی اور آئی بی کی سطح پر جائنٹ [illegible] فوری طور پر قائم کر دینی چاہیے جو عوام کے ذہنوں میں اٹھنے والے درج ذیل سوالات کو اولین اہمیت دے:

۱۔ پولیس رات کے دو بجے بیریئر ختم کرنے کے لیے کس نے بھیجی تھی؟

۲۔ منہاج القرآن سیکرٹریٹ کے اردگرد بیریئر لگانے کی لاہور ہائی کورٹ نے جو اجازت دی تھی' اس پروانے کو دکھانے کے بعد بیریئر ختم کرنے کا کیا جواز [illegible] تھا؟

۳۔ پولیس کو نشانے کر فائر کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟

۴۔ وہ پستول کس کا تھا جس کی گولی ایک نوجوان کا جبڑا [illegible] نکل گئی تھی؟

۵۔ گلو بٹ کس کلچر کی پیداوار ہے اور کس کی اجازت سے گاڑیوں کے شیشے توڑ رہا تھا اور پولیس اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی؟

۶۔ بوڑھے لوگوں کی جس بے دردی سے دھنائی کی گئی' کیا پولیس کوڈ اس کی اجازت دیتا ہے؟

۷۔ وزیراعلیٰ نے پولیس کو ہٹانے کا جو حکم دیا تھا' اس کی تعمیل میں کون کون لوگ رکاوٹ بنے؟

۸۔ کیا منہ زور انتظامیہ اور پولیس انصاف کے تقاضے پورے ہونے دیں گے؟

......☆......

سانحہ ماڈل ٹاؤن کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ضرب عضب کی حمایت میں جو سیاسی اتفاق رائے پیدا ہوا تھا' اسے بہت دھچکا لگا اور وزیراعلیٰ پنجاب کے استعفے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔ یوں کہنے کو تو کوئی شخص بھی ناگزیر نہیں' مگر بعض حالات میں ایک فرد کے آگے پیچھے ہو جانے سے پورا نظام حکومت تلپٹ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جناب شہباز شریف کو آہنی اعصاب دیے ہیں اور ان کے جسم و جاں میں بجلیاں بھری ہیں۔ وہ چشم زدن میں بات کی تہ

تک پہنچ جاتے اور تیز رفتاری سے فیصلے کرتے ہیں۔ توانائی کے بحران پر قابو پانے میں ان کی شبانہ روز کوششوں کی
بیرونی دنیا میں بھی تعریف و توصیف ہو رہی ہے۔ تاہم ان کا اپنا ایک طرزِ حکمرانی ہے جس میں دو چار لوگ کلیدی
اہمیت اختیار کر چکے ہیں جن کا تعلق بیوروکریسی اور غیر سیاسی عناصر سے ہے۔ سیاسی مشاورت کے وہ بہت زیادہ
قائل نہیں۔ ارکانِ اسمبلی ان کے دیدار کو ترستے رہتے ہیں اور وزرائے کرام کو بھی اذنِ باریابی کم ہی ملتا ہے۔ انھیں
بڑے منصوبے وقت سے پہلے مکمل کرنے کا بڑا شوق ہے۔ بعض اوقات پورے سروے اور ڈیزائننگ کے تمام تقاضے
پورے کیے بغیر میگا پراجیکٹس شروع کر دیے جاتے ہیں جن کی لاگت بھی بڑھ جاتی ہے اور ان کے اندر بڑے بڑے
سقم بھی رہ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے صحیح بات کہنے کی کم ہی لوگ جرأت کرتے ہیں اور جو جرأت کر گزرتے [illegible]
ہے کہ وہ اپنے منصب پر نہیں رہتے۔ عام طور پر جونیئر افسروں کو سینئر افسروں پر ترجیح دی جاتی ہے اور بیشتر ایسے
کے عہدے پر انحصار کرنے کے ناتجربے کار افسر تعینات کر دیے جاتے ہیں جو بے چوں و چرا احکام بجا لاتے ہیں۔
عام شکایت ہے کہ پولیس بیوروکریسی کو آزادی سے کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور بعض اوقات انتہائی خوشامدی
افسروں کو نہایت نمایاں پوسٹنگ دی جاتی ہے جس کا نتیجہ بعض اوقات سانحہ ماڈل ٹاؤن کی صورت میں ظاہر ہوتا
ہے۔ سیاسی جماعت کے ذریعے عام شہریوں کی نبض پر ہاتھ رکھنے اور ان کی ٹھوس حمایت حاصل کرنے کا جو موقع ملتا
ہے، جناب شہباز شریف کے اسلوبِ حکومت میں اس کا امکان بڑی حد تک ناپید ہے۔

جناب وزیراعظم میں اگرچہ خوئے دلنوازی خاصی زیادہ ہے، مگر وہ بھی محدود مشاورت کے خول میں بند رہنے
لگے ہیں۔ ان کا ملنا جلنا صرف چند "احباب" تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ مسلم لیگ نون کی سیاست میں خاندان کا
بڑا عمل دخل ہے اور چند بیوروکریٹ پوری حکومت چلا رہے ہیں جن کا تعلق پنجاب سے ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ جناب
نواز شریف پاکستان کے بجائے پنجاب کے وزیراعظم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پرائم منسٹر آفس میں زیادہ
تر وہ لوگ بااختیار ہیں جو کبھی پنجاب حکومت میں سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ جمہوری نظام کی سب سے بڑی
خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ سیاسی تربیت اور امورِ مملکت میں شمولیت کے ذریعے متبادل قیادت کا اہتمام کرتی
ہے، مگر ہمارے ہاں کوئی متبادل حلقہ اثر دکھائی نہیں دیتا۔ پارلیمنٹ جو اقتدار کا سرچشمہ ہے، اسے یتیم خانے میں
تبدیل کر دیا گیا ہے۔ پالیسیاں سیاسی جماعت کی سطح پر ترتیب دینے کے بجائے کہیں اور وضع کی جاتی ہیں اور فیصلے
در پردہ کہیں اور ہوتے ہیں۔ اہلِ خبر بتا رہے ہیں کہ حکمرانوں کا ذہن زیادہ تر کاروباری انداز میں کام کر رہا ہے اور
بیرونی دوروں میں بھی انہی تقاضوں کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ ۱۷ جون کو آرمی چیف جنرل راحیل شریف کو سری لنکا کے
دورے پر جانا تھا، مگر حالات کی نزاکت کے پیش نظر انھوں نے یہ دورہ منسوخ کر دیا جبکہ وزیراعظم تاجکستان کے
دورے پر چلے گئے اور اسی روز سانحہ ماڈل ٹاؤن پوری دنیا میں نشر ہوا۔ پولیٹیکل اور میڈیا مینجمنٹ میں بڑے بڑے
سقم کے باعث پاکستان آزمائشوں میں جکڑا ہوا ہے اور ایک ہی سال کے اندر منتخب حکومت کے قدم ڈگمگانے لگے
ہیں اور آئینی مدت پوری کرنے کی بھیک مانگی جا رہی ہے۔

٭...٭...٭

کہا جا رہا ہے کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں، مگر سیاسی اور انتظامی سطح پر اس کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ بجٹ میں دفاعی اخراجات کی مد میں جو رقوم رکھی گئی ہیں، اُن سے قطعی طور پر یہ تاثر نہیں ملتا کہ ہم واقعی حالتِ جنگ میں ہیں اور ہماری قومی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ شمالی وزیرستان کے متاثرین کی دیکھ بھال اور بحالی کے لیے جو وسائل درکار ہیں، اُن کی طرف ہمارے منصوبہ سازوں کی توجہ بہت کم ہے۔ انسانی امور سے تعلق رکھنے والے اقوامِ متحدہ کے رابطہ دفتر کے مطابق خیبر پختونخوا اور فاٹا کو جنگ سے نمٹنے کے لیے ۲۹ ارب درکار ہیں جبکہ بے گھر ۵ لاکھ افراد کے لیے بجٹ سے ماورا پیکج صرف ۵۰ کروڑ ہے۔ حکمرانوں اور متعلقہ اداروں کی سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ انسدادِ دہشت گردی کی عدالتوں سے بریت کا تناسب ۷۵ فی صد تک جا پہنچا۔ ایک سروے کے مطابق رجسٹرڈ بے گھر افراد کی تعداد چار لاکھ پندرہ ہزار کے لگ بھگ ہے جس میں ۷۰ فی صد عورتیں اور بچے ہیں جن کی امداد، بحالی اور ٹرانسپورٹ کے تمام انتظامات خاکی وردی والے کر رہے ہیں اور سول ادارے کسی قدر بے تعلق نظر آتے ہیں۔ وزیرِ داخلہ جناب چودھری نثار علی خاں نے قومی سیکورٹی پالیسی قومی اسمبلی میں پیش کی تھی اور نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم اتھارٹی کے قیام کی منظوری حاصل کر لی تھی جس کے لیے ۳۲ ارب درکار تھے۔ نئے سال کے بجٹ میں اس کے لیے صرف ۹ کروڑ ۲۰ لاکھ مختص کیے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انٹیلی جنس شیئرنگ کا مربوط نظام اور دہشت گردی کا سائنٹیفک سدِباب ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور ہمارے دفتروں میں وقت اور وسائل کا ضیاع اُسی رفتاری سے جاری ہے۔ وزیروں اور مشیروں کے اللے تللے اپنی جگہ قائم ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ فقط فوج حالتِ جنگ میں ہے۔

اس ماحول میں عدالتِ عظمیٰ نے وفاقی حکومت کی یہ اپیل درخواست سماعت کے لیے منظور کر لی ہے کہ ریٹائرڈ جنرل پرویز مشرف ملک سے باہر نہیں جا سکتے۔ قرائن یہی کہتے ہیں کہ حکومت کی پٹیشن منظور کر لی جائے گی اور خصوصی عدالت میں سابق فوجی سربراہ پر آئین سے بغاوت کا مقدمہ چلے گا۔ ہماری ریاست کو اس کڑی آزمائش کا تقریباً ایک سال سے سامنا ہے۔ قانون کا تقاضا تو یہی ہے کہ مقدمہ چلایا جائے، مگر ہمیں اس وقت فوجی آپریشن کو اولین ترجیح دینا ہو گی کہ اس پر ہماری سلامتی اور بقا کا دارومدار ہے، اس لیے ایک حکمتِ عملی کے تحت مقدمے کو چند ماہ کے لیے مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس اقدام سے سول ملٹری تعلقات مزید ہموار ہوں گے اور فوج ایک بڑے خلجان سے وقتی طور پر محفوظ بھی ہو جائے گی۔ پچھلے دنوں کراچی کے کاروباری اور صنعتی قائدین وزیراعظم سے ملے اور انہیں بتایا کہ ہمارے پچیس سے زائد بڑے کاروباری لوگ قتل یا اغوا کیے جا چکے ہیں، اس لیے کراچی شہر فوج کے حوالے کر دیا جائے۔ اس اُبھرتی ہوئی خوفناک صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے شمالی وزیرستان میں جامع فوجی آپریشن کی پائیدار کامیابی ازبس ضروری ہے اور اس کے لیے پوری قوم کو حالت کی سنگینی کا گہرا احساس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک فعال کردار ادا کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ ہمارے اربابِ اختیار کو اپنا اسلوبِ حکمرانی یکسر بدلنا اور جمہوریت کی روح تک پہنچنا اور سیاسی جماعتوں کو مضبوط بنانا اور اپنی ٹیم کو تبدیل کرنا ہو گا۔ ریاست کو بچانے کی ذمے داری سب سے زیادہ اسی پر عائد ہوتی ہے۔

◆◆◆

دلوں میں زندہ رہنے والا مسیحا

انتہائی قابل، احساسِ فرض سے سرشار، حرص و ہوا سے پاک نوجوان ڈاکٹروں کے لیے ماڈل بے نفس معالج، ہم سے رخصت ہو گیا

الطاف حسن قریشی

ہم جس عہدِ پُرآشوب میں ڈرتے ڈرتے سانس لے رہے ہیں، اس میں ان عظیم شخصیتوں کا تذکرہ بہت ضروری ہے جنھوں نے اپنے کردار سے معاشرت میں درخشندہ روایات قائم کیں اور لوگوں کے دکھوں کا مداوا بنے۔ یکم جون ۲۰۱۳ء کی دوپہر ایک ایسے مسیحا اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے جن کی یادوں سے چراغِ مسیحائی کے مقدس پیشے کو تابدار کرتے رہیں گے کہ اس کے اندر بھی ہوسِ زر نے راستے بنا لیے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر افتخار احمد کا نام سب سے پہلے آغا شورش کاشمیری (مرحوم) کی تقریروں میں سنا تھا جب وہ ۵۲ روزہ بھوک ہڑتال کے بعد کراچی سے رہا ہو کر دسمبر ۱۹۶۸ء کے آخر میں لاہور آئے تھے۔ انھوں نے ۲۲/اپریل ۱۹۶۸ء کے ہفت روزہ چٹان میں ایک شذرہ "الصلوٰۃ" کے عنوان سے لکھا تھا۔ وہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیے گئے، چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ اور پریس ضبط کر لیا گیا۔ [illegible] خان جیل میں رکھے گئے اور بعد ازاں [illegible] جیل میں منتقل کر دیے گئے۔ حکومت کی پے در پے ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کے خلاف آغا صاحب نے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ جب ان کی حالت بگڑنے لگی، تو وہ سول اسپتال منتقل کر دیے گئے جو ڈاؤ میڈیکل کالج سے ملحق تھا۔ وہ جس وارڈ میں رکھے گئے، اس کے انچارج ڈاکٹر افتخار احمد تھے۔ آغا صاحب ذیابیطس کے مریض تھے اور کچھ نہ کھانے کے باعث ان پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "موت کی واپسی" میں بھوک ہڑتال کے دوران

گزرے ہوئے واقعات بیان کیے جن سے ڈاکٹر افتخار احمد کا عظیم کردار اُجاگر ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

"۲۳ دسمبر کو کراچی میں شام کے اخباروں نے پہلی شہ سرخی کے ساتھ یہ خبر چھاپ دی کہ شورش کی نبضیں ڈوب رہی ہیں۔ خبر اس خفیہ رپورٹ سے اڑائی گئی جو اس دن پروفیسر افتخار احمد نے حکومت کو ارسال کی اور ماتحت عملے نے اخباروں کو بتا دی۔ شام کے اخبارات میں یہ خبر چھپتے ہی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پروفیسر افتخار احمد نے اسی شب ایک اور رپورٹ لکھی کہ بچنے کی امیدیں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور اگلے ۲۴ گھنٹوں میں بھوک ہڑتال ختم نہ ہوئی، تو پھر بچنا محال ہو گا۔ گورنر موسیٰ خان [illegible] پہنچ گئے تھے، انھوں نے پروفیسر افتخار احمد کو بلایا۔ انھوں نے بتایا کہ حالت نہایت درجہ نازک ہو چکی ہے اور اب تو انھوں نے پانی پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔

"وہ میری نبض پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے تھے اور میرے لیے بولنا نہ بولنے کے برابر تھا۔ میں اس وقت جاں بلب اور لاش کی طرح پڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کراچی اور پروفیسر افتخار صاحب نے گورنر کو سارا ماجرا سنایا۔ گورنر نے پروفیسر سے کہا کہ آپ فوراً ان کے پاس چلے جائیں۔ میں صدر ایوب سے بات کر کے ابھی مطلع کرتا ہوں۔ پروفیسر صاحب ابھی اپنے آفس پہنچے ہی تھے، تو ان کے اسسٹنٹ نے کہا کہ گورنر صاحب نے بلایا ہے۔ وہ اُلٹے پاؤں گورنر ہاؤس گئے۔ گورنر نے کہا شورش سے کہہ دو کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دے۔ حکومت نے انھیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا ہے، اس کو بچاؤ۔ ساتھ ہی پرائیویٹ سیکرٹری کو آرڈر کیا کہ سہ پہر کی خبروں میں یہ خبر نشر کراؤ اور اس کے بچوں کو لاہور فون پر اطلاع کرو۔ پروفیسر افتخار دوڑتے دوڑتے میرے پاس آئے اور مبارک باد دیتے ہوئے خبر سنائی، لیکن میں نے ان سے رہائی کا پروانہ مانگا۔ کہنے لگے پروانہ ہوم سیکرٹری کے دستخطوں سے شام تک پہنچ جائے گا، لیکن میں حکومت سے اتنا بدظن تھا کہ پروفیسر افتخار جیسے انسان دوست اور خدا پرست سے بھی عذر کیا کہ پہلے پروانہ دکھائیں، پھر بھوک ہڑتال ختم کروں گا۔ وہ سہ بارہ گورنر کے پاس گئے اور چار دس منٹ میں پروانہ لے کر آ گئے۔ وہ تب سے میری نبض پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے اور انجکشن پر انجکشن دے رہے تھے۔ کوئی نو بجے شب میری حالت خطرے سے باہر ہوئی، میں موت کی سرحد سے لوٹ آیا تھا۔"

آغا شورش کاشمیری اپنی تقریروں اور نجی گفتگوؤں میں پروفیسر افتخار احمد کے بارے میں اکثر کہتے تھے کہ ان کی انسان دوستی اور بے پناہ کاوشوں کی بدولت ان کی موت سے واپسی ممکن ہوئی تھی، ورنہ ایوب خان اور ان کے مشیران انھیں ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ ان حیات افروز واقعات کے بعد عمر بھر اس نقاہت کے باوجود ان دونوں شخصیتوں کے مابین رفاقت کا ایک ایسا شفقت آمیز رشتہ قائم ہوا جو خونی رشتوں سے زیادہ مستحکم ثابت ہوا۔ پروفیسر صاحب ۱۹۶۷ء میں کراچی سے لاہور آ گئے تھے۔ روزانہ ملاقات کا [illegible] ان پر بات چیت کی ایسی رسم پڑی جو ضرب المثل بن گئی۔ پروفیسر افتخار نے ایوب خان کے دورِ آمریت میں ایک عظیم سیاسی لیڈر، بے بدل مقرر اور انشا پرداز کو انسانیت کی بنیاد پر حیاتِ نو بخش کر جو غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیا تھا، اس کی وجہ سے وہ تمام سیاسی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے اور جرأت اور انسانی خدمت کا استعارہ بن گئے تھے۔

ڈاکٹر افتخار ایک زمانے میں نشتر میڈیکل کالج ملتان میں تعینات تھے اور ایک اچھے معالج کی شہرت

رکھتے تھے۔ وہاں ان کی غلام مصطفیٰ کھر سے دوستی ہو گئی۔ یہ اکتوبر ۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے کہ کھر صاحب رات کے وقت ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے اور انھیں ایک مریض دیکھنے کے لیے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ بلا تامل تیار ہو گئے۔ مظفر گڑھ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو بیمار ہیں اور بات کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنے کے بعد انھیں تین روز تک تقریر کرنے سے منع کر دیا اور کچھ دوائیں تجویز کیں۔ بھٹو صاحب نے فیس کے دو سو روپے پیش کیے جبکہ ان دنوں ڈاکٹر کی فیس پچاس روپے ہوتی تھی۔ پروفیسر صاحب نے فیس لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب آپ وزیراعظم بن جائیں گے، تو میرے لیے حساب چکانا آسان ہو گا۔ اس ملاقات کے بعد اعتماد کا جو رشتہ قائم ہوا، وہ آخری وقت تک قائم رہا۔ ایک بار ذوالفقار علی بھٹو نے خوش ہو کر انھیں کئی مربعے الاٹ کرنے کی پیشکش کی جس پر پروفیسر افتخار نے سخت برہمی کا اظہار کیا، البتہ یہ کہا کہ میرے وارڈ میں مریضوں کے لیے تمام جدید طبی سہولتیں فراہم کر دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک مطمئن قلب عطا کیا تھا اور انھوں نے اپنا دامن دولت کی حرص و ہوا سے عمر بھر داغ دار نہیں ہونے دیا۔

میری ان سے پہلی ملاقات اپنے ایک نہایت عزیز دوست جاوید نواز کے ہمراہ ہوئی جو ان کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ پروفیسر صاحب ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور علمائے دین کے بڑے قدردان تھے۔ جناب حفیظ جالندھری، جناب حبیب جالب، جناب طفیل ہوشیارپوری، جناب مظفر شمسی، مولانا عبدالرحمٰن اشرفی اور جناب مجیب الرحمٰن شامی سے ان کے انتہائی دوستانہ روابط قائم تھے۔ میری درخواست پر وہ اردو ڈائجسٹ میں قارئین کی صحت کے بارے میں سوالات کے جوابات باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ مجھے انھیں ۱۹۷۶ء کے اوائل میں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیے گئے، ہم پر مہینوں غداری کا مقدمہ چلا، تو ٹربیونل نے انھیں دو سال قید بامشقت کی سزا سنا دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمد حنیف رامے، راجا منور اور نواب خاکوانی بھی ہمارے ساتھ جیل میں بند تھے۔ ایک روز مجھے سینے میں درد محسوس ہوا، تو یاد آیا کہ مجھے ۱۹۶۴ء میں انجائنا کی تکلیف ہوئی تھی۔ جیل کے ڈاکٹر نے میو اسپتال ریفر کر دیا۔ وہاں کے ایم ایس نے میرا کیس پروفیسر افتخار کو بھیج دیا۔ انھوں نے تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد مجھے اپنے وارڈ میں داخل کر لیا۔ پوری نگہداشت کے باوجود میرا بلڈ پریشر قابو میں نہیں آ رہا تھا اور دایاں پاؤں سوجتا جا رہا تھا۔ جیل کی ناقص غذا نے میری صحت پر منفی اثرات مرتب کیے تھے اور بوریوں کا بستر استعمال کرنے سے جلد
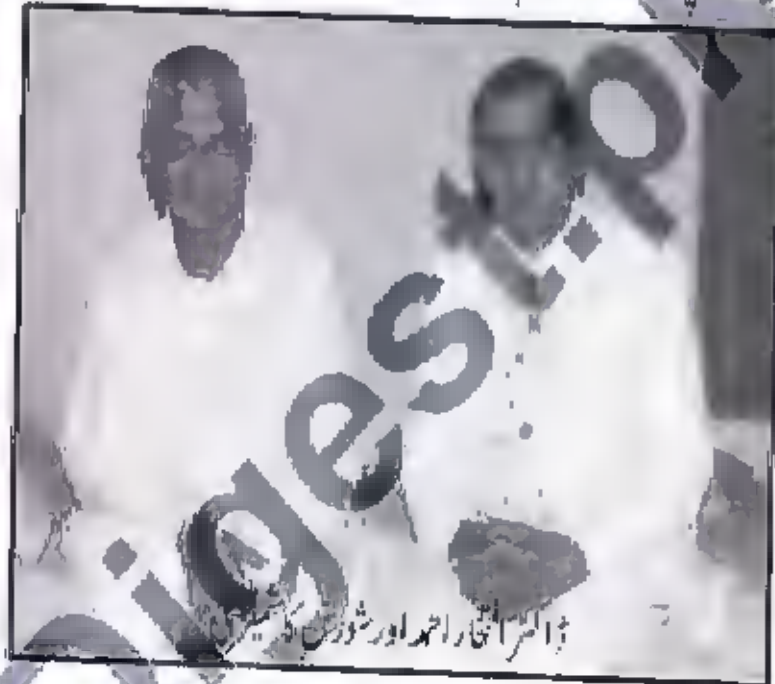
ڈاکٹر افتخار احمد اور شورش کاشمیری

کے امراض بھی پیدا ہو گئے تھے۔ چار ماہ کے دوران مجھے احساس ہوا کہ پروفیسر صاحب اپنے مریضوں کا بہت خیال رکھتے' ان کی صحت یابی کے لیے بڑی تگ و دو کرتے اور طلبہ کی تربیت پر غیر معمولی توجہ دیتے ہیں۔ ان کی اولین کوشش ہوتی کہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان میں تحقیق اور جستجو کا شوق پیدا کیا جائے۔ ان کا اپنے شاگردوں کے ساتھ رویہ ایک شفیق باپ کا سا ہوتا اور انھیں ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ گرتے ہوؤں کو تھامتے ہیں اور بڑی خاموشی سے حاجت مندوں کی دستگیری کرتے ہیں۔

وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث ۱۹۷۱ء میں پنجاب کے سیکرٹری ہیلتھ مقرر ہوئے' تو انھوں نے ڈاکٹروں کے کیڈر کو بحال کیا۔ انہی کے عہد میں ایسوسی ایٹ پروفیسرز کی اسامیاں پیدا ہوئیں اور سینئر ڈاکٹر آگے چل کر بائیس گریڈ پر فائز ہونے لگے جو ماضی میں صرف اٹھارہ گریڈ تک ہی جا سکتے تھے۔ ان کے زمانے میں علامہ اقبال میڈیکل کالج اور جناح اسپتال کی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور انھوں نے ینگ ڈاکٹرز کو ایک اچھا سکیل دلوایا اور ان کے عہد میں تعینات شدہ نوجوان ڈاکٹر آگے چل کر کالجوں کے پرنسپل بنے۔ ان کی عظمت یہ تھی کہ کبھی کسی پر احسان جتایا نہ صلے کی تمنا کی۔ وہ یہی کہتے تھے کہ اس نوجوان میں اپنی صلاحیت ہی بہت زیادہ تھی اور وہ اس منصب کا پوری طرح مستحق تھا۔ ان کا کلینک آج بھی ریواز گارڈن میں ہے جسے اب ان کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر آصف چلا رہے ہیں جبکہ بڑے بیٹے ڈاکٹر عارف گنگا رام اسپتال میں کام کرتے ہیں۔ ان کا اصول تھا کہ پرانے مریضوں سے صرف پچاس روپے فیس لیتے اور ان کی زیادہ سے زیادہ فیس فقط تین سو روپے تھی۔ غریبوں کا علاج مفت ہوتا تھا۔ ان کی رفیقۂ حیات زاہدہ بھی ڈاکٹر ہیں جو سلیقہ مندی اور معاملہ فہمی کی ایک خوبصورت مثال ہیں۔ ان کا تعلق ریاست جموں و کشمیر سے تھا اور ان کے والد وہاں ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھے جن کے شیخ عبداللہ سے اچھے روابط چلے آ رہے تھے اور جن کے ہاں جناب حفیظ جالندھری قیام کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے وہ جالندھر میں پروفیسر افتخار صاحب کے والد ڈاکٹر نیاز الدین احمد کے ہمسایہ تھے۔ انھوں نے کشمیر میں قیام کے دوران یہ رشتہ تجویز کیا جسے طرفین نے خوش دلی سے قبول کر لیا۔ پروفیسر صاحب کے ہزاروں شاگرد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی اعلیٰ روایات کو زندہ رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج اور علامہ اقبال میڈیکل کالج کے پرنسپل رہے اور اپنے شاگردوں میں دانش و تدبر پھونکتے رہتے اور بڑی شفقت سے بگڑے ہوئے طلبہ کی اصلاح فرماتے تھے۔ وہ ڈاکٹروں کے قبیلے کے بہت بڑے محسن اور اعلیٰ اقدار و روایات کے روشن مینار تھے۔

وہ ایک اتائی معالج ہونے کے علاوہ ایک بہت وضع دار' خوش طبع اور زندہ دل انسان بھی تھے اور اچھے لوگوں کی عزت افزائی ان کے مزاج کا ایک لازمی حصہ تھا۔ بلھے شاہ کی شاعری پر انھیں بہت عبور حاصل تھا۔ اپنی تقریروں میں ان کے اشعار کثرت سے پڑھتے اور انسان دوستی اور دلوں کی بستیاں آباد کرنے کا درس دیتے رہتے۔ ان کی شخصیت میں یہ عجب کمال دیکھا کہ ان پر جس قدر ذوالفقار علی بھٹو اعتماد کرتے تھے' اس سے کہیں زیادہ جنرل ضیاالحق

ان کے گرویدہ تھے جو ان کی ماں کے سگے بھائی تھے۔ اس تعلق کی بنیاد پر انھوں نے وفاقی حکومت سے علامہ اقبال میڈیکل کالج اور جناح اسپتال لاہور کی تعمیر کے لیے خطیر فنڈز حاصل کیے اور جنرل ضیا الحق سے ان کا افتتاح کروایا۔ وہ رشتوں کے آداب سے واقف تھے اور ان کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بلا کی ذہانت اور صلاحیتیں عطا کی تھیں جن کی بدولت وہ ترقی کی منزلیں وقت سے پہلے طے کرتے گئے۔

پروفیسر افتخار جس طرح صاحب اقتدار مریضوں کو دیکھنے ان کے گھروں میں چلے جاتے، اسی طرح اپنے دوستوں اور ان کے شناساؤں کے گھروں میں مریض دیکھنے بلاتامل چلے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کن آباد سے ملحق بستی اردو نگر میں حضرت مفتی محمد شفیع کے صاحبزادے اور ہمارے دوست جناب ذکی کیفی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ انھوں نے گراؤنڈ فلور کرائے پر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کو دے رکھا تھا جہاں شام کے وقت ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اہلِ علم کی مجلسیں جماتے تھے۔ جناب ذکی کیفی عالم دین ہونے کے علاوہ ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے اور ان کے ہاں ہر ماہ ایک شعری نشست ہوتی تھی۔ مولانا ظفر احمد انصاری جب بھی کراچی سے لاہور تشریف لاتے، تو انھی کے ہاں قیام فرماتے۔ ایک روز جناب مصطفیٰ صادق (مرحوم) کا فون آیا کہ ذکی صاحب کی طبیعت بڑی خراب ہے اور وہ اسپتال جانے کے لیے تیار نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پروفیسر افتخار احمد جو آپ کے دوست ہیں، وہ انھیں گھر پر دیکھنے آجائیں۔ میں نے کہا پروفیسر صاحب سے بات کرکے بتاتا ہوں۔ میں نے انھیں فون کیا تو حضرت مفتی محمد شفیع کا نام سن کر آنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ میں نے پوچھا آپ کو لینے آجاؤں؟ کہنے لگے مجھے پتا بتاؤ، میں خود ہی پہنچ جاتا ہوں۔ چنانچہ ہمارے پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی وہ تشریف لے آئے۔ جناب ذکی شدید تکلیف میں تھے اور پسینے چھوٹ رہے تھے، لیکن وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے یہی کہتے رہے کہ میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔ پروفیسر صاحب نے معائنہ کرنے کے بعد دوائیں تجویز کیں اور جاتے ہوئے کہا کہ میں رات کو دیکھنے پھر آؤں گا اور وہ آئے۔ میرے کان میں کہا کہ آخری وقت ہے، اب شاید اسپتال جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ذکی صاحب نے بڑی قوت ایمانی سے اپنی جان خالق حقیقی کے سپرد کر دی اور ان کے چہرے کے گرد نور کا ہالہ بن گیا تھا۔

پروفیسر افتخار بھی تین جون کی دوپہر آرام کے لیے لیٹے اور خراٹے بھرنے لگے۔ اسی حالت میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ شدید گرمی کے باعث انھیں رات کے نو بجے دفنا دیا گیا۔ مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ اسلام آباد سے لاہور آیا تو تعزیت کے لیے ان کی رہائش گاہ پر گیا جہاں کبھی مور اور بطخیں رقص کیا کرتی تھیں۔ پروفیسر صاحب کو پرندے رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے ان کے چاروں انداز بہت یاد آئے کہ میں چند ہی ماہ پہلے ان کی معیت میں یہاں آیا تھا اور ہم نے پروفیسر صاحب سے گھنٹوں باتیں کی تھیں۔ دل خوش کر دینے والی باتیں، دلوں میں زندہ رہنے والی باتیں۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر صاحب کے درجات بلند کرے اور ان کے وارثین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کا حوصلہ اور جذبہ عطا کرے۔ آمین، ثم آمین۔ کیا عجب آزاد مرد تھا!

◆◆◆

روزہ کس لیے؟

محمد یوسف اصلاحی

اپنی دانست میں راہِ مستقیم پر چلنے والے مسلمانوں سے ایک چبھتا ہوا سوال

رمضان کا مہینا اور دن کا وقت ہے۔ آپ روزے سے ہیں۔ ایک شخص آپ سے نہایت سنجیدگی سے کہتا ہے "کچھ ذرا یہ کھجور کھا کر دیکھیے، بڑی ہی میٹھی اور رسیلی ہے۔"
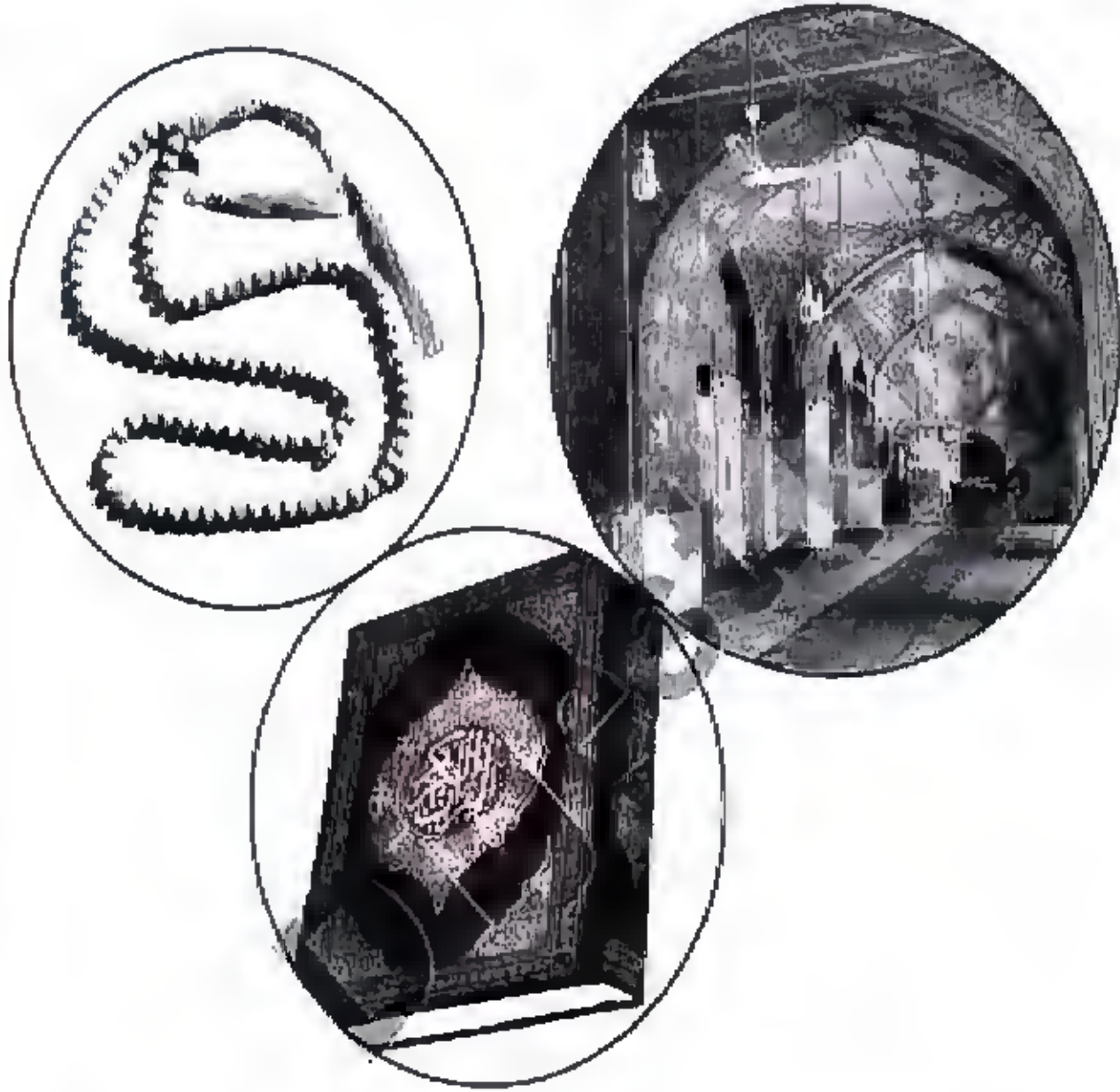
بتائیے آپ کیا سوچیں گے؟ یہی نہ کہ آپ اس کو دماغی مریض سمجھیں گے ورنہ ہوش و حواس میں کوئی شخص ایسی نازیبا بات کہنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے!! اگر آپ کو ذرا بھی محسوس ہو جائے کہ یہ شخص ہوش و حواس رکھتے ہوئے یہ حرکت کر رہا ہے تو سوچیے آپ کے غیظ و غضب کی کیا کیفیت ہوگی! بھلا روزے میں بھی کوئی شخص کچھ کھا سکتا ہے؟ ذرا سی غذا بھی حلق سے نیچے اتار لی تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

بے شک کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور مسلمان معاشرے میں ایسا ہو بھی نہیں سکتا کہ کوئی

شخص رمضان کے دنوں میں کسی کو کچھ کھانے کی دعوت دے۔ نہ کوئی شخص روزہ رکھ کر کچھ کھانے کی حماقت ہی کر سکتا ہے۔ کون مسلمان نہیں جانتا کہ کھانے پینے اور دوسری لذتوں سے باز رہنے کا نام ہی روزہ ہے۔ روزہ رکھنے کے بعد بھلا دن میں کچھ کھانے یا چکھنے کا کیا سوال!

مگر انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات آپ نہایت اطمینان سے مزے لے لے کر انسانی بوٹیاں چباتے ہیں اور آپ کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ آپ کا روزہ ٹوٹ رہا ہے۔ ایک کھجور کھانے کے لیے آپ تیار نہیں کہ آپ کا روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن انسان کا گوشت آپ مزے سے کھاتے اور سوچتے ہیں کہ یوں آپ کا سخت جان روزہ ذرا مجروح نہیں ہوتا!

رمضان کا مہینا اور دن کا وقت ہے۔ آپ روزہ رکھے ہیں۔ اپنے دوستوں کی ایک مجلس میں بیٹھے ہیں۔ مجلس میں ادھر ادھر کی گفتگو ہو رہی ہے اور پھر یکا یک یہ سب آدم خور بن جاتے ہیں۔ چٹخارے لے لے کر مردہ انسانوں کا گوشت کھانے لگتے ہیں۔ آپ بھی بے باکی سے دسترخوان پر ہاتھ مارنے اور انسانی لاش کو نوچنے لگتے ہیں... اور آپ کا ضمیر آپ کو ذرا بے چین نہیں کرتا کہ آپ روزے سے ہیں۔ انسان کا گوشت تو ویسے بھی حرام ہے مگر آپ روزے میں بھی مردار کھانے سے باز نہیں رہتے۔

آپ حیران ہو رہے ہیں کہ بھلا میں کب آدم خوروں کی مجلس میں گیا؟ کب میں نے کسی مردہ انسان کا گوشت کھایا؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!... جی ہاں صحیح کہہ رہا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ آدم خوروں کی مجلس میں موجود ہوتے ہیں۔ جب وہ انسانی گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں تو آپ کے منہ میں بھی پانی بھر آتا ہے۔ بے اختیار آپ بھی مردہ انسان کے گوشت پر منہ مارنے لگتے ہیں۔ آپ کو ذرا پریشانی نہیں ہوتی کہ ایک انتہائی گھناؤنا جرم کر رہے ہیں۔

وہ مجلسیں جن میں آپ شریک ہوتے ہیں، کیا وہاں دوسروں کے عیوب اور کمزوریوں پر گفتگو نہیں ہوتی؟ کیا وہاں دوسروں پر الزام نہیں تراشے جاتے؟ کیا وہاں دوسروں کے خلاف بدگمانیاں نہیں کی جاتیں اور بدگمانیاں نہیں پھیلائی جاتیں؟ کیا وہاں دوسروں کی غیبت نہیں کی جاتی...؟ آپ ان مجلسوں میں اطمینان سے دوسروں کی غیبت سنتے مزہ لیتے اور اکثر خود بھی شریک ہو جاتے ہیں۔

اللہ کی کتاب بتاتی ہے کہ غیبت کرنے والے آدم خور ہیں۔ غیبت کرنا دراصل مردہ انسان کا گوشت کھانا ہے!

اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمھارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا... دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ (12-10)

رمضان کا روزہ ایک اہم ترین عبادت ہے۔ اللہ نے اس کا عظیم صلہ اپنے ہاتھوں سے دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کا روزہ اللہ کی نظر میں بھی روزہ قرار پائے۔ روزے کی حفاظت سے آپ یکسر غافل نہیں ہیں۔ یہ حفاظت ہی تو ہے کہ آپ غذا کا ایک ذرہ منہ میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ یوں روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اس احساس و شعور کو ذرا اور بیدار کیجیے۔ کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مگر

غیبت سے روزہ مردار ہوتا اور ہرگز اس لائق نہیں رہتا کہ اللہ کے حضور قبول کیا جائے۔ اس کے ذریعے پرہیزگاری اور تقویٰ کا کوئی جوہر آپ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اللہ نے روزے کی یہی غرض بتائی ہے۔

علامہ ابن جوزی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بہت سے مسلمان روزے تو بہت پابندی سے رکھتے ہیں لیکن وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ جس چیز سے روزہ افطار کر رہے ہیں وہ حلال ہے یا حرام! وہ دن بھر غیبت سے پیٹ بھرتے، اجنبی چہروں سے آنکھیں سینکتے اور زبان پاک نہیں کرتے۔ فضول گفتگوؤں میں لگے رہتے ہیں اور شیطان انہیں اطمینان دلاتا رہتا ہے کہ آپ روزہ دار ہیں۔ یہ بھی شیطانی دھوکا ہے۔''

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ کے مبارک دور میں دو عورتوں نے روزہ رکھا۔ روزے میں ان دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ پیاس کی شدت سے ان کی جان لبوں پر آ گئی۔ دونوں نے نبی ﷺ سے روزہ کھولنے کی اجازت منگوائی۔ آپ ﷺ نے دونوں کے پاس ایک بڑا پیالہ بھیجا اور حکم دیا کہ دونوں اس میں قے کریں۔ دونوں عورتوں نے ہدایت کے مطابق اس پیالے میں قے کر دی۔ دونوں کی قے میں خون کے ٹکڑے نکلے۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔''

حضور ﷺ نے فرمایا ''ان دونوں عورتوں نے ان چیزوں سے تو روزہ رکھا جو اللہ نے حلال کی ہیں مگر ان چیزوں سے توڑا جو اللہ نے حرام کی ہیں۔ یعنی یہ

اسلامی دور کی پہلی مسجد

مدینہ منورہ سے کچھ دور قبا نامی ایک کنواں واقع تھا۔ اس کے نام پر وہاں بننے والی بستی بھی قبا کہلائی۔ یہ علاقہ قبیلہ عمرو بن عوف کے سردار کلثوم بن ہدم کا تھا۔ سن 13 نبوی سال تھا اور حضور ﷺ کی عمر مبارک 53 سال ہو چکی تھی۔ جب آپ حضرت ابوبکر صدیق کے ہمراہ 8 ربیع الاول بروز پیر بمطابق 23 ستمبر 622ء کو قبا میں رونق افروز ہوئے۔ اسی دن سے سن ہجری کی ابتدا ہوئی۔ آپ پہلے پہل ایک روایت کے مطابق خیمے میں ٹھہرے۔ لیکن حضرت کلثومؓ کے اصرار پر ان کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ گھر موجودہ مسجد قبا کی محراب والی جگہ واقع تھا۔ کچھ لوگوں نے جو ہجرت سے قبل قبا میں آباد ہو چکے تھے، نماز کی خاطر ایک چھوٹی سی جگہ گھیر رکھی تھی۔ آپ ﷺ نے دنیائے اسلام کی سب سے پہلی مسجد کی بنیاد اسی جگہ رکھی۔ کچی دیواروں کی مسجد تھی جس کی چھت پر کھجور کے پتے بچھائے گئے تھے۔ اس مسجد کی فضیلت کے کیا کہنے! سورۃ توبہ کی آیت 108 میں ارشاد ربانی ہے ''جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ ﷺ اس میں کھڑے ہوں۔'' اس سے پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقوں کی مسجد ضرار میں ہرگز نہ کھڑے ہوں۔ مسجد قبا اب ایک شاندار مسجد میں تبدیل ہو چکی۔ مسجد کے باہر دیوار پر ایک تختہ آویزاں ہے جس میں ارشاد نبوی ﷺ رقم ہے کہ جو کوئی اس مسجد میں پاک صاف داخل ہو کر دو رکعتیں نماز ادا کرے گا اسے ایک عمرہ کا ثواب ملے گا۔ حضرت کلثومؓ کا پورا گھر اب مسجد میں شامل ہے۔ یہ مسجد حرم شریف سے جانب جنوب تین ساڑھے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بعد میں نبی اکرم ﷺ ہفتے میں دو روز کبھی پیدل اور کبھی اونٹ پر ضرور جاتے۔ ہجرت کے چوتھے دن حضرت علیؓ بھی وہیں آپ سے آن ملے۔ آپ ﷺ نے گیارہ روز تک قبا میں قیام فرمایا اور بارہویں روز مدینہ کا رخ فرمایا۔ (مرسلہ: احمد رمضان۔ عارف والا)

دوسروں کی غیبت کرتی رہیں۔ یہ انسانوں کی بوٹیاں ہیں جو ان کی قے میں نکلی ہیں۔"

غیبت ہی کی طرح ان دوسری تمام برائیوں سے بھی روزہ برباد ہو جاتا ہے جن کو اللہ نے حرام کیا اور عام طور پر لوگ ان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: "جب تُو روزہ رکھے تو چاہیے کہ اپنے کانوں، اپنی آنکھوں، اپنی زبان، اپنے ہاتھوں اور اپنے جسم کے تمام اعضا کو اللہ کی ناپسندیدہ باتوں اور اس کے منع کردہ کاموں سے باز رکھے۔"

اس سے بڑی بدبختی اور بدانجامی کیا ہوگی کہ آدمی دن بھر بھوکا پیاسا اور لذتوں سے محروم بھی رہے پھر بھی اس سے کہا جائے کہ تیرے حصے میں بھوک اور پیاس کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔ اللہ کی پناہ اس سے عذاب کا روزہ صرف بھوک پیاس کی شدت بن کر رہ جائے اور اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہ ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

"بہت سے روزے دار ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے روزے سے بھوک اور پیاس سے مرنے کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔"

اللہ نے آپ کو روزے رکھنے کا شعور دیا ہے تو اس کی قدر کیجیے۔ آپ روزہ رکھتے ہیں تو روزے کو روزہ بنانے کی فکر بھی کیجیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مقبول روزے کے لیے دو باتوں کے اہتمام کی تاکید فرمائی ہے:

... ایمانی شعور

... احتساب

ایمانی شعور کے ساتھ روزہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن حقائق پر ایمان لایا ہے، وہ اس کے ذہن میں تازہ ہوں ... اللہ کی عظمت کا احساس، اس کے حضور جواب دہی کا تصور، اس کے وعدوں پر یقین، اس کے غضب سے بچنے کی فکر، اس کے عذاب کا خوف، رسول ﷺ سے قلبی تعلق، ان کی سنت پر چلنے کا عزم، یہ ساری باتیں آدمی کے ذہن میں تازہ رہنی چاہئیں۔ اس ایمانی شعور کے ساتھ جو روزہ رکھا جائے، وہی حقیقت میں روزہ ہوگا۔

احتساب سے مراد یہ ہے کہ آدمی خالص اجر آخرت کے لیے روزہ رکھے اور ہر وقت چوکنا رہے کہ کوئی اور محرک اس کے اخلاص کو گدلا نہ کر دے۔ اپنے روزے کو ان تمام برائیوں سے بچائے رکھے جو اسے مجروح یا بے اثر کرنے والی ہیں۔

اگر روزہ رکھ کر بھی آپ وہ سب کچھ کرتے رہے جس سے اللہ روکنا چاہتا ہے۔ انہی گناہوں میں سرگرم رہے جن سے باز رہنے کی قوت پیدا کرنے کے لیے اللہ نے آپ کو روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے تو پھر آپ ہی بتایئے کہ اللہ کو ایسے روزے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے روزے سے آپ ان بے پایاں اجر و اکرام اور عظیم صلے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں جن کا وعدہ اللہ نے آپ سے کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس شخص نے (روزہ رکھ کر) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس سے کیا مطلب کہ اس نے اپنا کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔"

آپ کو اللہ نے روزہ کی توفیق دی ہے اور پابندی سے روزہ رکھتے ہیں... تو یہ ضرور سوچیے کہ آپ کس لیے روزہ رکھتے ہیں!

◆◆◆

روزے کی طبی برکات

تیس دن بھوکا پیاسا رہنا اہم جسمانی اعضا کو آرام و تقویت پہنچاتا ہے.....

ایک معلومات افزا تحقیق

ڈاکٹر ہلوک نور باقی (ترکی)
مترجم: سید محمد فیروز شاہ گیلانی

چند سال قبل تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ روزے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ نظام ہضم کو کچھ آرام مل جائے۔ مگر اب طبی سائنس کی جدید تحقیق آشکارا کر چکی کہ روزہ تو ایک طبی معجزہ ہے..... ایسی سچائی جو چودہ سو برس قبل قرآن پاک میں افشا کر دی گئی تھی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

ترجمہ: اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیروکاروں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ جو لوگ روزے رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزے رکھو۔ (البقرہ آیت نمبر 183-184)

سورۃ البقرہ کی ان آیات میں دین کے ایک اہم رکن روزہ سے متعلق حکم دیا گیا۔ ان آیات کا آخری حصہ قابلِ غور ہے۔ اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ روزہ بے حد مبارک شے ہے جس سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس امر کا بھی اعلان کیا گیا کہ ہم اس سے حاصل کردہ رحمتیں پا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم سچ کو پہچان

سکیں۔ آئیے سائنسی تناظر میں دیکھتے ہیں کہ کس طرح روزہ ہمیں صحت مند رہنے میں مدد دیتا ہے۔

نظام انہضام پہ اثر

انسان کا نظام انہضام ایک دوسرے سے ملے کئی اعضا پر مشتمل ہے۔ اہم جسمانی اعضا جیسے منہ اور جبڑے میں لعابی غدود، زبان، گلا، مقوی نالی (Alimentary Canal) یعنی گلے سے معدے تک خوراک لے جانے والی نالی) معدہ، بارہ انگشت آنت، جگر اور لبلبہ اور آنتوں کے مختلف حصے وغیرہ تمام اس نظام کا حصہ ہیں۔ یہ سب پیچیدہ اعضا خودبخود ایک کمپیوٹری نظام کے تحت عمل کرتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کھانا شروع کریں یا کھانے کا ارادہ ہی کریں یہ پورا نظام حرکت میں آ جاتا ہے۔ تب ہر عضو اپنا مخصوص کام کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سارا نظام چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہنے کے علاوہ اعصابی دباؤ اور غلط قسم کی خوراک کھانے کے باعث رفتہ رفتہ کمزور ہو جاتا ہے۔

روزے ایک طرح اس سارے نظام کو ایک ماہ کا آرام دیتے ہیں۔ یہ آرام ملنے کا حیران کن اثر بطور خاص جگر پر ہوتا ہے۔ کیونکہ جگر کھانا ہضم کرنے کے علاوہ پندرہ مزید افعال بھی انجام دیتا ہے۔ وہ مسلسل کام کرنے کی وجہ سے اسی طرح تھکان کا شکار ہو جاتا ہے جیسے ایک چوکیدار ساری عمر کے لیے پہرے پر کھڑا ہو۔ جگر خراب ہو جائے تو وہ صفرا (Bile) کی رطوبت جس کا اخراج ہاضمے کے لیے ہوتا ہے، زیادہ پیدا کرتا ہے۔ یہ امر مختلف قسم کے مسائل پیدا کرتا اور دوسرے جسمانی افعال پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

لیکن روزوں کے ذریعے جگر کو چار سے چھے گھنٹوں تک آرام مل جاتا ہے۔ روزے کے بغیر یہ وقفہ ملنا قطعی ناممکن ہے کیونکہ بے حد معمولی خوراک یہاں تک کہ ایک گرام کے دسویں حصے کے برابر بھی اگر معدے میں داخل ہو جائے تو پورے نظام ہضم کا کمپیوٹر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ جگر بھی فوراً مصروف عمل ہوتا ہے۔ گویا سائنسی نقطہ نظر سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس آرام کا وقفہ سال میں ایک ماہ لازمی آنا چاہیے۔

جدید دور کا انسان متعدد طبی معائنوں (ٹیسٹوں) کے ذریعے اپنے آپ کو محفوظ بنانے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن اگر جگر کے خلیے کو قوت گویائی حاصل ہوتی تو وہ ایسے انسان سے کہتا "تم مجھ پر ایک عظیم احسان صرف روزے کے ذریعے ہی کر سکتے ہو۔"

جگر پر روزوں کی برکات میں سے ایک خون کے کیمیائی عمل پر اس کی اثر اندازی بھی ہے۔ جگر کے انتہائی مشکل کاموں میں ایک کام اس توازن کو برقرار رکھنا بھی ہے جو غیر ہضم شدہ اور تحلیل شدہ خوراک کے درمیان ہوتا ہے۔ اسے یا تو ہر لقمے کی غذائیت کو ذخیرہ کرنا پڑتا ہے یا پھر وہ خون کے ذریعے ہضم ہونے کے عمل کی نگرانی کرتا ہے۔ روزے کے ذریعے جگر توانائی بخش کھانے کو ذخیرہ کرنے سے بڑی حد تک آزاد ہو جاتا ہے۔ اس طرح جگر اپنی توانائی خون میں گلوبلن (Globulin) کی پیداوار پر صرف کرتا ہے۔ جو جسم کو محفوظ رکھنے والے مدافعتی (Immune) نظام کو تقویت دیتا ہے۔ روزے کے ذریعے گلے اور خوراک کی نالی کے بے حد حساس اعضا کو جو آرام نصیب ہوتا ہے اس تحفے کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی۔

انسانی معدہ روزوں کے جو بھی اثرات قبول کرے وہ بے حد مفید ہیں۔ ان کے باعث معدے سے نکلنے والی رطوبتیں بھی بہتر طور پر متوازن ہو جاتی ہیں۔ روزہ کے دوران تیزابیت (Acid) کم جنم لیتی ہے اگرچہ عام

قسم کی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ روزے کی نیت اور مقصد کے تحت ہی تیزابیت کی پیداوار رکتی ہے۔ یوں معدے کے پٹھے اور معدے میں رطوبت پیدا کرنے والے خلیے دورانِ ماہِ رمضان آرام کی حالت میں چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ روزہ نہیں رکھتے، ان کے دعوؤں کے برخلاف یہ ثابت ہو چکا کہ ایک صحت مند معدہ شام کو روزہ کھولنے کے بعد زیادہ کامیابی سے ہضم کا کام انجام دیتا ہے۔

روزہ آنتوں کو بھی آرام اور توانائی فراہم کرتا ہے۔ یہ فائدہ صحت مند رطوبت کے بننے اور معدے کے پٹھوں کی حرکت سے ملتا ہے۔ چوبیس گھنٹے جب آنتوں میں کھانا داخل نہ ہو تو انھیں تھوڑا سکون مل جاتا ہے۔ یوں روزے کے دوران انھیں نئی توانائی اور تازگی ملتی ہے۔ اس طرح ہم ان تمام بیماریوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں جو ہضم کرنے والی نالیوں پر ہوتی ہیں۔

خون پر فائدہ مند اثرات

دن میں روزہ رکھنے کے دوران خون کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ یہ اثر دل کو انتہائی مفید آرام مہیا کرتا ہے۔ زیادہ اہم یہ کہ خلیوں کے درمیان مائع کی مقدار میں کمی کی وجہ سے ٹیشو یعنی پٹھوں پر بھی دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ پٹھوں پر دباؤ یا عام فہم الفاظ میں ڈائسٹالک دباؤ (Diasthic) کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ روزے کے دوران ڈائسٹالک دباؤ ہمیشہ کم سطح پر ہوتا یعنی اس وقت دل آرام کی حالت میں رہتا ہے۔

مزید برآں آج کا انسان جدید زندگی کے مخصوص حالات کی بدولت شدید اعصابی تناؤ یا ہائپر ٹینشن (Hypertension) کا شکار ہے۔ رمضان کے ایک ماہی روزے بطورِ خاص ڈائسٹالک دباؤ کم کر کے انسان کو بے پناہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

روزے کا سب سے اہم اثر دورانِ خون کی شریانوں پر پڑتا ہے۔ خون کی شریانیں خصوصاً بے خوری کے باعث اکثر کمزور پڑ جاتی ہیں۔ یہ عارضہ جنم لینے کی ایک اہم وجہ خون میں غذائی مادوں کا پوری طرح تحلیل نہ ہونا ہے۔ دوسری طرف روزے میں بطورِ خاص افطار کے وقت خون میں موجود غذائیت کے تمام ذرے تحلیل ہو چکے ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی باقی نہیں بچتا۔ یوں خون کی شریانوں کی دیواروں پر چربی یا دیگر اجزا جم نہیں پاتے اور وہ تنگ ہونے سے محفوظ رہتی ہیں۔ چناں چہ دل کی انتہائی خطرناک بیماریوں سے بچنے کی بہترین تدبیر روزہ ہی ہے۔ جس میں شریانوں کی دیواروں کی سختی (Arterioseclerosis) نمایاں ترین بھی جاتی ہے۔

روزے کے دوران گردے بھی جنھیں نظامِ دورانِ خون ہی کا ایک حصہ سمجھا جا سکتا ہے، آرام کی حالت میں رہتے ہیں۔ اس لیے جسم کے ان اہم اعضا کی توانائی روزے کی برکت سے بحال ہو جاتی ہے۔

خلیوں پر روزے کا اثر

روزے کا ایک اہم اثر خلیوں اور ان کے اندرونی سیال مادوں کے درمیان توازن قائم رکھنے سے ہے۔ چونکہ روزے کے دوران مختلف سیال مادے کم ہو جاتے ہیں اس لیے خلیوں کے عمل میں بڑی حد تک سکون پیدا ہوتا ہے۔ خاص طور پر لعاب دار جھلی کی بالائی سطح سے متعلق خلیے جنھیں اپی تھیلیل (Epithelial) سیل کہتے ہیں اور جو جسم کی رطوبت کے متواتر اخراج کے ذمہ دار ہوتے ہیں، انھیں صرف روزے کے ذریعے ہی آرام اور سکون ملتا ہے۔ یوں ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ خلویات کے نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ لعاب بنانے والے (Pituitary) غدود، گردن

کے تھوڑے غدود (Thyroid) اور لبلبے (Pancreas) کے غدود شدید بے چینی سے ماہ رمضان کا انتظار کرتے ہیں تاکہ روزے کی برکت سے کچھ سستانے کا موقع حاصل کر سکیں اور مزید کام کرنے کے لیے اپنی توانائیوں کو بحال کریں۔

اعصابی نظام پر اثر (Nervous System)

یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ دوران روزہ چند لوگوں میں پیدا ہونے والے چڑچڑے پن اور بے دلی کا اعصابی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس قسم کی صورت حال ان انسانوں میں ہو جاتی ہے جن میں انانیت (Egotism) یا طبیعت کی سختی کے باعث جنم لیتی ہے۔ اس کے برخلاف روزے کے دوران اعصابی نظام مکمل سکون اور آرام کی حالت میں رہتا ہے۔ عبادات کی بجا آوری سے حاصل شدہ تسکین ہماری تمام کدورتوں اور غصہ دور کر دیتی ہے۔ زیادہ خشوع و خضوع اور اللہ کی مرضی کے سامنے سرنگوں ہونے سے ہماری پریشانیاں بھی تحلیل ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ دورِ جدید میں اعصابی دباؤ کی وجہ سے جو شدید مسائل جنم لیں وہ تقریباً ختم ہو جاتے ہیں۔

روزے اور وضو کے مشترکہ اثر سے جو مضبوط ہم آہنگی جنم لے اس سے دماغ میں دوران خون کا بے مثال توازن قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی صحت مند اعصابی نظام کی نشاندہی کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ اندرونی غدودوں کو جو آرام اور سکون ملے، وہ پوری طرح سے اعصابی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ روزے کا انسانی جسمانی نظام پر ایک اور احسان ہے۔

انسانی تحت الشعور جو رمضان کے دوران عبادت کی مہربانیوں کے باعث صاف شفاف اور تسکین بخش ہو جاتا ہے، اعصابی نظام سے ہر قسم کا تناؤ اور الجھن دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔

خون کی تشکیل اور روزے کی لطافتیں

خون ہڈیوں کے گودے میں بنتا ہے۔ جب کبھی جسم کو خون کی ضرورت پڑتی ہے تو ایک خودکار نظام ہڈی کے گودے کو حرکت پذیر (Stimulate) کرتا ہے۔ کمزور اور لاغر لوگوں میں یہ گودا بطور خاص سست حالت میں ہوتا ہے۔ یہ کیفیت شہروں میں رہنے والوں میں بھی ملتی ہے۔ اسی باعث پژمردہ اور پیلے چہروں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

روزے کے دوران جب خون میں غذائی مادے کم ترین سطح پر ہوں تو ہڈیوں کا گودا حرکت پذیر ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً لاغر لوگ روزہ رکھ کر آسانی سے زیادہ خون پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن جو شخص خون کی کسی شدید بیماری میں مبتلا ہو وہ طبی معائنے اور ڈاکٹر کی تجویز کو ملحوظ خاطر رکھے۔ چونکہ روزے کے دوران جگر کو ضروری آرام مل جاتا ہے، وہ ہڈی کے گودے کے لیے ضرورت کے مطابق کافی مادہ مہیا کر دیتا ہے جس سے بآسانی اور زیادہ مقدار میں خون پیدا ہو سکے۔

یوں روزے کی بہت سی حیاتیاتی برکات کے ذریعے ایک دبلا پتلا شخص اپنا وزن بڑھا سکتا ہے۔ اسی طرح موٹے اور فربہ لوگ بھی صحت پر روزے کی عمومی برکات کے ذریعے اپنا وزن کم کر سکتے ہیں۔

مہربان قارئین! آئیے دوبارہ آیت نمبر 184 کے آخری حصے کو یاد کریں اور قرآن پاک کے معجزے کی مسرت سے لطف اندوز ہوں:

"اگر تم سمجھو (یعنی اگر تم جسم کے حیاتیاتی علم کو سمجھو) تو تمہارے حق میں یہی اچھا ہے کہ تم روزہ رکھو۔" (چاہے اس میں تمہیں مشکلات بھی نظر آئیں۔)

◆◆◆

عیدین پر ہم وطنوں کی حواس باختگیوں کے چٹ پٹے نمونے

احمد ندیم تابش

ہم نے پوچھا ”کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟“

بولے ”دفتر کے نجیب گیا تھا۔ میرا مطلب ہے نجیب کے دفتر گیا تھا۔“

”وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“

”قرضے سے کچھ نجیب لینے گیا تھا۔ یعنی کہ نجیب سے کچھ قرضہ لینے گیا تھا۔“

”ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”ضوری فرورت تھی، میرا مطلب ہے فوری ضرورت تھی۔“

”آپ تو بالکل حواس باختہ ہو رہے ہیں۔“

”دراصل کئی دنوں سے میرے چکر کو سر آ رہے ہیں۔“

”یعنی سر کو چکر آ رہے ہیں؟“ ہم نے کہا۔

”جی ہاں اور چکر اس لیے آ رہے ہیں کہ مجھے ایک دم بہت سے روپے کی ضروری فرورت پڑ گئی ہے۔“

”مگر ایسی فوری ضرورت بھی کیا؟“

”عید کی بیگم شاپنگ کے لیے؟“

”یعنی بیگم کی عید شاپنگ کے لیے!“

”اوہ... ہاں وہی تو!“ انہوں نے بیگم شاپنگ بک دیا۔

لیکن [illegible] میرے تو ہاتھ مروڑ کر میرے

کانوں کو تھما دیتیں۔"

"یعنی تمھارے کان مروڑ کر تمھارے ہاتھوں

یہ ایک دم تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کیا ہو گیا ہے؟"

"تم تو ایک دم گنجے ہو گئے ہو۔"

"میں بھی سوچ رہا تھا کہ میرا سر ہلکا پھلکا اور خالی خالی سا کیوں لگتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے بال جھڑ گئے ہیں۔"

"یعنی تمھارے بال جھڑ گئے اور تمھیں خبر بھی نہیں ہوئی؟"

"کیوں نہیں ہوئی۔ بازار [illegible] جب میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو بہت سے بال میرے ہاتھ میں آ گئے۔ مگر میں سمجھا کہ صبح بیگم کی [illegible] اپنے سر میں پھیر لی تھی۔ یہ [illegible] کنگھی میں پھنسے ہوئے انھی کے بال ہوں گے جو میرے سر پر منتقل ہو کر اب جھڑ رہے ہیں۔ مگر اب میں نے سر پر دوبارہ ہاتھ پھیرا تو واقعی صفائی ہو چکی۔"

"مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ کوئی واہیات قسم کی کریم تو نہیں لگا لی؟ کسی بے ہودہ قسم کے تیل سے تو سر نہیں چپڑ لیا؟"

"نہیں بھئی تم جانتے ہو کہ میں کریموں اور تیلوں کا قائل نہیں۔"

"صبح کو تم نے آئینہ دیکھا تھا؟"

"یقیناً دیکھا تھا، سر پر گھنگھریالے بالوں کا ڈھیر تھا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں، بس بیگم کو عید شاپنگ کے لیے لے گیا۔"

"مگر شاپنگ کا بالوں کی جڑوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کتنے کی خریداری کی؟"

"پروگرام پانچ ہزار روپے کی خریداری کا تھا مگر بیگم نے ایک لاکھ خرچ کروا ڈالے۔ کہنے لگیں، عید روز روز تھوڑی آتی ہے۔"

"اور تم نے یہ رقم ادا کر دی؟"

"دکاندار جاننے والے تھے، شام تک کے لیے ادھار دے گئے۔ اب خریداری کا سامان اور بیگم کو گھر پہنچا کر دوست احباب سے قرض لینے نکلا ہوں۔ ادائی تم کر دو۔"

"دو تو میں کچھ نہ کچھ نذر کیے دیتا ہوں مگر تمھارے ایک دم گنجے ہو جانے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔"

***

"عجیب خبر ہے۔ اتنی مدت سے اخبار پڑھ رہا ہوں مگر ابھی تک اس قسم کی خبر کبھی نظر سے نہیں گزری [illegible]"

[illegible]

"یہ دیکھو لکھا ہے، [illegible] ایک صاحب کی لاش کو بیگم کی عید شاپنگ کے سامان کے انبار تلے سے نکالا جا رہا ہے۔ بے چارے یہ سارا سامان حمال کی طرح اٹھائے جا رہے تھے کہ لڑکھڑائے۔ شاپنگ کے سامان کا یہ پہاڑ ان پر آ گرا۔ اس کے نیچے دب کر ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔"

رمضان شریف کے احترام میں

رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا۔ رویت ہلال رمضان پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اس طرح کا

جھگڑا رویت ہلال عید پر ہوتا ہے۔ بہرحال چاند نکلنے کی تاریخ کے جھگڑے میں پاکستان کا ایک طبقہ تو بالکل نہیں پڑتا۔ یہ ملک کے ان تاجروں کا طبقہ ہے، جو چلی میں زلزلے کی خبر پڑھ کر ٹینڈے مہنگے کر دیتے ہیں۔

تاجروں کے اس طبقے نے اشیائے ضرورت ابھی سے مہنگی کر دی ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ پہلا روزہ بدھ کو ہوگا یا جمعرات کو، انھوں نے کئی بدھ اور کئی جمعراتیں پہلے ہی روزوں کے استقبال کا اہتمام کر لیا ہے۔ دوسری چیزوں کو تو چھوڑیے، کھجوروں تک کا یہ عالم ہے کہ بظاہر ریڑھی پر پڑی ہوتی ہیں۔ مگر نرخ پوچھیے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کو لنگوٹ باندھ کر کھجور کے درخت پر چڑھنا، چوٹی پر سے کھجوریں توڑنا اور پھر درخت سے نیچے اترنا ہوگا۔ تب جا کر آپ کھجور کا ایک دانہ چکھ سکیں گے۔

ایک اندازے کے مطابق تاجروں کا یہ طبقہ رمضان المبارک کے احترام میں ایک مہینے کے اندر اتنا کچھ کما لیتا ہے کہ یہ منافع سارا سال ان کی کفالت کرتا ہے۔ بعض تاجر تو صرف سحری اور افطاری میں استعمال ہونے والی اشیا کی گرانی سے اتنی رقم جمع کر لیتے ہیں کہ حج کا فریضہ ادا کرنے میں انھیں بہت آسانی رہتی ہے۔ وہ اس گرانی کے اسباب کو چھپا کر بھی نہیں رکھتے۔ پوچھیے کہ اس چیز کی قیمت یکایک بڑھ کیوں گئی تو صاف صاف کہیں گے...... اور ذرا طنزاً مسکرا کر کہیں گے "کیا آپ کو معلوم نہیں؟ رمضان شریف شروع ہونے میں بس چند روز باقی ہیں۔ اس صورت میں چیزیں مہنگی نہیں ہوں گی تو کیا سستی ہوں گی!"

مرزا غالب روزے سے نہیں تھے۔ ایک دوست ان سے ملنے آیا تو دیکھا مرزا بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ براہ راست اعتراض کرنے میں ادب مانع تھا۔ سو بالواسطہ انداز میں پوچھا "حضرت میں نے سنا تھا کہ رمضان شریف میں شیطان ایک کوٹھڑی میں بند ہو جاتا ہے۔"

مرزا بولے "آپ نے ٹھیک سنا تھا مگر وہ جس کوٹھڑی میں بند ہوتا ہے وہ یہی تو ہے!" ہمارے خیال میں تاجروں کے متذکرہ طبقے کے پاس مرزا غالب کی سی شگفتگی بھی نہیں کہ وہ رمضان شریف میں عامۃ المسلمین کی لوٹ مار کا کوئی ایسا جواز پیش کر سکیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ رمضان المبارک عام مسلمانوں کی نیکیاں اور ہمارا بینک بیلنس بڑھاتا ہے۔

ہمارے ایک دوست کی الفاظ سے کھیلنا عادت ہے۔ کہہ رہے تھے کہ رمضان شریف کی خوشی میں گنڈیری اتنی مہنگی کر دی گئی کہ میں اسے گنڈیری کی بجائے "ڈنگیری" کہتا ہوں اور یہ ڈنگیری ڈانگ سے نکلی ہے۔ سموسہ اتنا مہنگا ہے کہ میں اسے سموسہ کی بجائے "سوسہ" کہتا ہوں اور یہ سوسہ دل مسوس کر رہ جانے سے نکلا ہے۔ وہ کھجور کو جھکور کہتے ہیں، جو جوکھم سے نکلا ہے۔ پکوڑے کو کپوڑا کہتے ہیں جو کپوڑا کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ وہ انڈے کو ڈنڈا، ڈبل روٹی کو رل روٹی اور ناشپاتی کو ناش پتی کہتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ رمضان شریف کی آمد آمد نے تو آپ کی ڈکشن ہی بدل ڈالی۔ بولے "بازار میں جا کر ذرا انگور کا بھاؤ تو پوچھو، سنو گے تو لنگور نظر آنے لگو گے!"

◆◆●

احادیث میں آیا ہے کہ جب تک صحت، تندرستی اور فرصت کے اوقات حاصل ہیں، آدمی انھیں غنیمت سمجھے

ان کی قدر کرے اور اس دھوکے میں نہ رہے کہ یہ دولت گراں بہا ہمیشہ حاصل رہے گی۔ وہ نہیں جانتا کہ کب صحت جواب دے جائے اور کب لمحات فرصت چھن جائیں۔ تب وہ بہت سے نیک کام نہیں کر پائے گا اور حسرت اور افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ صحیح سند سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کی۔ فرمایا:

"پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں (کی آمد) سے پہلے غنیمت سمجھو۔ اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو مرض سے پہلے، دولت اور تونگری کو فقر و احتیاج سے پہلے، فرصت کو مشغولیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے۔"

حدیث میں "غنیمت" کا لفظ اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ نعمتیں انسان کو کسی جدوجہد کے بغیر مفت میں مل گئی ہیں، اسی لیے وہ ان کی قدر و قیمت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن جب یہ [illegible]

دینِ اسلام کے آدابِ طعام

آیاتِ قرآنی اور احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں کھانے پینے کے اصول و قوانین پر بصیرت افروز شہ پارہ

سید جلال الدین عمری

دیکھے چھنتی چلی جائیں تو پتا چلے گا کہ ان میں سے ایک ایک چیز کتنی گراں مایہ تھی اور کس بے خبری اور غفلت میں ضائع ہوتی چلی گئی۔

شکم پُری ناپسندیدہ ہے

کھانے کے سلسلے میں رسول ﷺ کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی پیٹ زیادہ نہ بھرے، اس لیے کہ شکم پُری کے جہاں کئی نفسیاتی اور اخلاقی نقصانات ہیں، وہیں انسان کی صحت بھی اس سے خراب ہوجاتی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''آدمی نے پیٹ (کے برتن) سے برا کوئی برتن نہیں بھرا۔ ابن آدم کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھ سکیں۔ اگر بہت ضرورت ہو تو ایک تہائی اس کے کھانے، ایک تہائی پینے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے ہونا چاہیے۔'' (ترمذی)

معدے کا فساد بہت سی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ اس حدیث پر عمل ہو تو معدہ ٹھیک رہ سکتا ہے۔ یوں آدمی معدے کی خرابی سے جنم لینے والے امراض سے محفوظ رہتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے مومن کی یہ صفت بتائی: اس کی خوراک کم ہوتی ہے۔ پیٹ بھر لینا ان لوگوں کا شیوہ ہے جو دنیا کے بھوکے ہوتے ہیں اور جنھیں خدا اور آخرت پر یقین نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''مومن کا کھانا ایک آنت میں ہوتا ہے اور کافر سات آنتوں میں بھرتا ہے۔'' (صحیح بخاری)

یہ نتیجہ ہے مومن اور کافر کے مابین ذہنوں کے فرق کا! اسی وجہ سے دونوں کے انداز زیست میں زبردست تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس کا مظاہرہ زندگی کے دیگر معاملات کی طرح کھانے پینے میں بھی ہوتا ہے۔ ایک مومن سوچتا ہے: خوردن برائے زیستن۔ بلکہ زیستن کو خدا کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگانے کا جذبہ اس کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔ کافر ''زیستن برائے خوردن'' پر عمل کرتا ہے۔ وہ دنیا کی نعمتوں کو جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ سمیٹنا چاہتا ہے۔ اپنا پیٹ بھی اس طرح بھرتا چلا جاتا ہے کہ اسے نتائج تک کی فکر نہیں ہوتی۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں:

''مجھے نہیں معلوم کہ نبی ﷺ نے کبھی چھوٹے پیالے میں کھانا کھایا ہو۔ آپ ﷺ کے لیے کبھی پتلی اور نرم و ملائم روٹی تیار کی گئی ہو (اور آپ ﷺ نے کھائی ہو) اور آپ ﷺ نے کبھی (خوان) استعمال کیا۔ حدیث کے راوی حضرت قتادہؓ سے سوال کیا گیا کہ پھر کس چیز میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کھانا کھایا کرتے تھے؟ فرمایا: دسترخوان پر۔'' (صحیح بخاری)

اس حدیث میں ''سکرجہ'' کا لفظ آیا ہے، جو چھوٹے پیالے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے عدم استعمال کی متعدد وجوہ بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ کے دور میں اس کا رواج نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اہل عرب اجتماعی طور پر اور مل جل کر ایک برتن میں کھانا کھانے کے عادی تھے۔ الگ الگ پیالوں میں کھانے کا رواج نہ تھا۔ ایک بات یہ بھی کہی گئی کہ چھوٹے پیالے یا پیالیاں کھانے نہیں بلکہ ایسی ادویہ یا جوارشات کے لیے استعمال کی

جاتی تھیں جو ہاضم ہوں۔ عرب اس قدر پیٹ بھر کے کھانے کے عادی ہی نہ تھے کہ انھیں دوا کی ضرورت پیش آتی۔

حدیث میں کہا گیا ہے کہ آپ نے کبھی 'خوان' استعمال نہیں فرمایا۔ 'خوان' اب ہر طرح کا دسترخوان کہلاتا ہے لیکن یہاں ایک خاص قسم کے 'خوان' کا ذکر ہے۔ اس کی شکل یہ تھی کہ تانبے کے بڑے طشت یا سینی کو تانبے ہی کی چوکی پر جڑ دیا جاتا۔ اس پر پیالے بنے ہوتے تاکہ انواع و اقسام کے کھانے نکالے جا سکیں۔ یہ کافی بھاری ہوتا تھا۔ اسے ایک سے دو آدمی اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے۔

اس طرح کے خوان دنیادار اور عیش پرست اصحاب ثروت استعمال کرتے۔ آپ ﷺ اور صحابہؓ جس طرح کی زندگی گزار رہے تھے، اس میں ان کی گنجائش نہ تھی۔ راوی حدیث، قتادہؓ کہتے ہیں کہ وہ کھانے کے لیے 'سفرہ' استعمال کرتے۔ 'سفرہ' عام دسترخوان کو کہا جاتا ہے۔ یہ بالعموم چمڑے کا بنا ہوتا۔ اسے فرش پر بچھا کر کھانا کھایا جاتا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کھانے کے لیے تپائی یا چوکی وغیرہ استعمال کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب امام غزالی نے یہ دیا ہے کہ کھانا زمین پر رکھ کر یا زمین پر دسترخوان بچھا کر کھانا سنت سے قریب ہے۔ اس میں تواضع اور خاکساری بھی ہے۔ لیکن ''مائدہ'' (تپائی یا اس جیسی اونچی چیز) پر کھانا ممنوع یا مکروہ نہیں کہ اس کی ممانعت ثابت نہیں۔ یہ بدعت بھی نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ کے بعد شروع ہوئی، اسے بدعت نہیں کہا جاتا۔ بلکہ بدعت وہ ہے جو سنت ثابتہ کے خلاف ہو اور جو کسی امر شرعی کو ختم کر دے، جب کہ اس کی علت موجود ہو۔ بعض اوقات تو اسباب کے بدلنے پر نئی چیزیں ایجاد کرنا پڑتی ہیں۔ مائدہ صرف اس لیے ہے کہ کھانے کو ذرا اونچا رکھا جائے تاکہ کھانے میں آسانی ہو۔ اس طرح کی چیزوں میں کوئی کراہت نہیں۔ اس سے میز کرسی پر بھی کھانا کھانے کا جواز نکلتا ہے۔

حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک میں بکری کا شانہ تھا۔ آپ ﷺ اسے چھری سے کاٹ کر تناول فرما رہے تھے کہ اتنے میں اذان ہو گئی۔ آپ ﷺ نے چھری رکھ دی اور نماز کے لیے تیار ہو گئے۔ (صحیح بخاری)

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں "اس میں گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھانے کا جواز ہے۔ گوشت سخت ہو یا اس کا ٹکڑا بڑا ہو تو اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن علما نے کہا کہ بلا وجہ چھری کا استعمال ناپسندیدہ ہے۔"

امام طبری فرماتے ہیں "اہل علم نے اس بات کو پسندیدہ قرار دیا ہے کہ گوشت نوچ کر کھایا جائے۔ اس میں تواضع اور کبر سے اجتناب اور دوری ہے۔ چھری سے کاٹ کر کھانا مباح ہے۔"

علامہ ابن حزم کی رائے اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چھری سے کاٹ کر گوشت کھانا پسندیدہ ہے۔ اسی طرح چھری سے کاٹ کر روٹی کھانا بھی ناپسندیدہ نہیں۔ کیونکہ اس سلسلے میں کوئی صریح ممانعت نہیں آئی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ تبوک میں رسول اللہﷺ کی خدمت میں پنیر پیش کیا گیا۔ آپﷺ نے چھری طلب فرمائی اور اللہ کا نام لے کر اسے کاٹا۔ (ابوداؤد)

گوشت کو دانتوں سے نوچ کر کھائیے

کھانا ہاتھ سے کھانا اور یوں کہ زیادہ سے زیادہ لعاب دہن اس کے ساتھ پیٹ میں پہنچے، ہضم میں معاون بنتا ہے۔ احادیث میں اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ حضرت صفوان بن امیہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

"گوشت کو دانتوں سے نوچ کر کھاؤ اس لیے کہ یہ زیادہ لذیذ اور ہضم میں معاون ہوتا ہے۔" (ترمذی)

ایک دوسری روایت کے الفاظ میں: "میں رسول اللہﷺ کے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ اپنے ہاتھ سے گوشت کو ہڈی سے الگ کر کے کھا رہا تھا۔ آپﷺ نے فرمایا "ہڈی کو اپنے منہ سے قریب کرو اور دانتوں سے گوشت نوچ کر کھاؤ۔" (ابوداؤد)

اس امر کی حکمت واضح ہے۔ گوشت کو ہڈی سے دانتوں کے ذریعے آسانی سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ گوشت نوچ کر کھانے سے دانتوں کا عمل بڑھتا اور لعاب دہن زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ نوک زبان بھی لذت محسوس کرنے لگتی ہے۔

کھانا ضائع نہ کیجیے

کئی لوگوں کے دستر خوان پر کھانا بہت ضائع ہوتا ہے۔ اسے شاید بڑائی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ کھانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اسے کسی قیمت ضائع نہ کیجیے۔ اس دنیا میں جہاں بے شمار انسان دانے دانے کے محتاج ہیں اور بھوکوں مر رہے ہیں، وہاں یہ کتنی بڑی نادانی اور ناسپاسی ہو گی کہ جن لوگوں کو اللہ نے آسودگی عطا کی ہے، وہ اسے ضائع کر دیں۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کھانے کی قدر کیجیے، کھاتے وقت روٹی کا ایک ٹکڑا اور گوشت کی کوئی بوٹی دستر خوان سے گر جائے تو اسے بھی نہ پھینکیے بلکہ صاف کر کے استعمال کر لیں۔ برتن میں کھانا ادھر ادھر نہ چھوڑیے بلکہ اسے چاروں طرف سے صاف کر لیا جائے۔ یہاں تک کہا گیا کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھونے سے پہلے انگلیوں میں شوربا، چاول یا اسی نوع کی اور کوئی چیز لگی ہو تو انھیں خوب چوس اور چاٹ لیں۔ اس سلسلے میں بعض روایات پیش کی گئی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ نبیﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص کھائے تو اپنا ہاتھ چاٹ لے یا کسی کو چٹا دے (تاکہ وہ صاف ہو جائے)۔" (صحیح بخاری)

انگلیوں کو چاٹنے کا مطلب یہ نہیں کہ جو بھی آدمی قریب ہو، اسے اپنی جھوٹی انگلی چٹوانے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ دوسرے کو اپنی جھوٹی انگلی اس وقت چٹانیے جب اس سے قلبی تعلق ہو۔ جیسے اپنی اولاد یا بیوی یا کوئی ایسا فرد جو عقیدت اور محبت رکھتا ہو یا جس سے غیر معمولی بے تکلفی ہو اور جو اسے ناپسند نہ کرے۔

حضرت انسؓ اس معاملے میں رسولﷺ کے مبارک عمل اور آپﷺ کی ہدایت کا اس طرح ذکر

کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کھانا تناول فرماتے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چوس کر صاف کر لیتے۔ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو وہ اس کی گندگی صاف کرے اور اسے کھا لے۔ شیطان کے لیے اسے نہ چھوڑے۔ آپ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ کھانے کے برتن کو اچھی طرح صاف کریں تاکہ اس میں کوئی چیز نہ لگی رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم نہیں جانتے کہ تمھارے کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔'' (مسلم)

لیکن امام نووی فرماتے ہیں کہ جو لقمہ گر جائے، اسے صاف کر کے استعمال کر لیا جائے۔ لیکن اس پر عمل اسی وقت ہوگا جب جگہ پاک ہو۔ اگر جگہ ناپاک یا نجس ہے تو لقمہ بھی ناپاک ہو جائے گا۔ اگر اسے دھویا جا سکتا ہو تو ضرور دھو لیا جائے۔ اگر ممکن نہ ہو تو کسی حیوان کو کھلا دیجیے۔ شیطان کی غذا نہ بننے دیں۔

جو لقمہ ہاتھ سے گر جائے اسے اٹھا کر کھانا آج کی تہذیب میں سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرنا نہیں جانتے وہ پہلے بھی اسے معیوب ہی سمجھتے تھے۔ لیکن رسول ﷺ نے صحابہ کرامؓ میں سادگی، خدا ترسی اور اس کی نعمتوں کی قدر شناسی کا جو پاکیزہ جذبہ پیدا کیا، اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہو سکتا ہے۔

حضرت معقل بن یسار کھانا کھا رہے تھے۔ ہاتھ سے ایک لقمہ گر پڑا۔ انھوں نے اسے اٹھایا، صاف کیا اور کھا لیا۔ کچھ دہقان وہاں موجود تھے۔ وہ ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کرنے لگے۔ حضرت معقل بن یسارؓ سے بعض لوگوں نے کہا ''اللہ امیر (غالباً وہ اس وقت بصرہ کے امیر تھے) کا بھلا کرے، یہ دہقان اس بات پر مسکرا رہے ہیں کہ کھانا آپ کے سامنے موجود ہے، کوئی کمی نہیں پھر بھی آپ نے ہاتھ سے جو لقمہ گرا اسے اٹھا کر کھا لیا۔''

انھوں نے جواب دیا کہ ان عجمیوں کی وجہ سے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں چھوڑ سکتا۔ ہم میں سے کسی کا لقمہ گر جاتا تو آپ ﷺ حکم دیتے کہ اسے اٹھائے اور صاف کر کے کھا لے۔ شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔ (ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں بڑی معنویت ہے کہ شیطان کے لیے کھانا نہ چھوڑا جائے۔ برتن میں یا دسترخوان پر اس طرح کھانا چھوڑ دینا کہ وہ کسی کے کام نہ آ سکے یا صاف ستھرے دسترخوان پر بھی کوئی لقمہ گر جائے تو اسے ہاتھ نہ لگانا، کبر و غرور کی علامت ہے۔ اس ناپاک جذبے سے انسان شیطان کو اپنے عمل میں شریک کر لیتا ہے۔ اللہ کے بندے خاکسار اور متواضع ہوتے ہیں، وہ متکبروں کے طور طریقے نہیں اختیار کرتے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ ہمیں نہیں معلوم، ہماری غذا کے کس حصے میں خیر و برکت ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ غذا کا کتنا اور کون سا حصہ جزو بدن بنے گا، کون سا حصہ ہماری دنیا اور آخرت کے لیے مفید ثابت ہوگا؟ یہ سب باتیں اللہ کے علم میں ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ جو غذا اللہ نے ہمیں عطا کی ہے، اس کی قدر کریں۔ اس کے کسی حصے کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اس کے ایک ایک جزو سے برکت کی توقع رکھیں۔

◆◆◆

نیویارک میں سماجی انقلاب لانے والی

ٹوٹی کھڑکی تھیوری

چھوٹے موٹے جرائم پہ قابو پا لینے سے جب قانون نافذ کرنے والوں نے ایک انتشار زدہ شہر کو امن و محبت کا گہوارہ بنا دیا

طیب اعجاز قریشی

آج کے پُر رونق اور روشنیوں کے شہر نیویارک کے حالات 1980ء کی دہائی سے بالکل مختلف ہیں۔ ان دنوں یہ مشہور امریکا کا اہم ترین شہر جرائم کا گڑھ بن چکا تھا۔ سرِشام نیویارک کی سڑکیں سنسان ہو جاتیں۔ لوگ سب وے میں سفر کرنے سے خوف کھاتے۔ کئی علاقے "نوگو ایریاز" بن چکے تھے۔ ایک سال میں چھ لاکھ سنگین جرائم اور دو ہزار سے زائد قتل کی وارداتیں ریکارڈ کی گئیں۔

عام حالات میں چالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلنے والی ٹرین پندرہ میل فی گھنٹا بھی نہ چل پاتی کیونکہ تقریباً پانچ سو سے زائد مقامات پر پٹڑی کو نقصان پہنچایا گیا تھا۔ ٹرین پر مفت سفر کرنا عام بات تھی جس کی وجہ سے ہر سال ادارے کو ایک سو پچاس ملین ڈالر کا نقصان ہوتا۔ گن پوائنٹ پر دکانیں، گیس اسٹیشن اور لوگوں کو لوٹا جاتا اور مزاحمت کرنے والے کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

یہ 22 دسمبر 1984ء کا ذکر ہے۔ کرسمس سے چند روز قبل جینز اور جیکٹ میں ملبوس 37 سالہ برن ہارڈ مین ہٹن کی 14 ویں اسٹریٹ کے 7 ایونیو کے سب وے سے ایکسپریس ٹرین کے ایک ڈبے میں سوار ہوا اور ایک کونے میں چار سیاہ فام نوجوانوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈبے میں تقریباً بیس مسافر تھے مگر ایک کونے میں بیٹھے تھے کیونکہ وہ ان چار سیاہ فاموں کی حرکتوں سے خوف زدہ تھے۔

"کیسے ہو؟" ان چاروں میں سے ایک نے جس کا نام ٹونی تھا، برن ہارڈ سے پوچھا۔ ایک اور کالے نے آگے بڑھ کر برن ہارڈ سے پانچ ڈالر طلب کیے۔ تیسرے نوجوان ٹیرر نے برن ہارڈ کی توجہ اپنی جیب میں موجود پستول کی طرف دلائی۔

صورت حال پریشان کن تھی مگر برن ہارڈ نے قدرے تحمل اور دلیری سے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"

"پانچ ڈالر دے دو۔" ٹونی نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

برن ہارڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ٹونی کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ صورت حال سے لطف اٹھا رہا تھا جبکہ چہرے پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور مکروہ مسکراہٹ نے برن ہارڈ کو بھڑکا

دیا۔ پلک جھپکتے ہی اس نے جیب سے کروم پلیٹڈ پستول نکالا اور اعشاریہ 38 کی گولیاں ان چاروں کے جسموں میں اتار دیں۔ وہ تینوں وہیں پر چاروں ڈھیر ہو گئے مگر ان میں سے ایک ڈیل نامی سیاہ فام چیخ پکار کر رہا تھا۔
برن اس کی طرف متوجہ ہوا "تم تو ابھی تک زندہ ہو۔ یہ لو ایک اور۔" اور پانچویں گولی ڈیل کی ریڑھ کی ہڈی میں اتار دی جس کے باعث وہ عمر بھر چلنے پھرنے کے قابل نہ رہا۔

اسی دوران کسی نے ایمرجنسی زنجیر کھینچ دی۔ تمام مسافر ڈبے سے نکل بھاگے سوائے دو عورتوں کے جو اس سانحے سے بوکھلاہٹ کا شکار تھیں۔ "کیا آپ ٹھیک ہیں؟" برن ہارڈ نے ایک خاتون سے نرمی سے پوچھا۔ اس نے ہاں میں جواب دیا۔ دوسری عورت فرش پر دم سادھے لیٹی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ مر چکی ہے۔ برن ہارڈ کے دوبارہ پوچھنے پر وہ منمنائی ہاں میں ٹھیک ہوں۔
اسی دوران ٹرین کا کنڈکٹر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے برن ہارڈ سے پوچھا کہ کیا تم پولیس افسر ہو؟ اس نے جواب دیا "نہیں۔۔۔ مجھے نہیں پتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ یہ مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔" کنڈکٹر نے اس کا پستول مانگا لیکن برن ہارڈ نے انکار کر دیا اور ٹرین سے کود کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

ایک سفید فام کے ہاتھوں سب وے میں سیاہ فام غنڈوں کا قتل ناقابل یقین واقعہ تھا۔ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ برن ہارڈ کا والد اصولوں کا پابند اور غصیلی طبیعت کا مالک تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے برن ہارڈ کو اکثر اپنے والد کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس وجہ سے وہ بزدل بچہ بن گیا۔ ہم جماعت اس پر پھبتیاں کستے اور اسکول میں کھیلوں میں بھی اسے کم ہی منتخب کیا جاتا۔ وہ اکثر اسکول سے روتے ہوئے گھر آتا۔ ملازمت کے دوران بھی دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ برن کے تعلقات کشیدہ رہے۔ وہ کمپنی کے خلاف کسی بھی کارروائی یا مہم کا حصہ بنتا۔ یوں یونین بھی اس سے ناخوش رہتی۔ ایک بار نیویارک ڈاؤن ٹاؤن میں اس کے اپارٹمنٹ کے چوکیدار کو جو اس کا دوست تھا سیاہ فام غنڈوں نے اسے بری طرح مارا پیٹا۔ گھر کے آس پاس منشیات فروش اور آوارہ سیاہ فاموں کا ڈیرا تھا۔ وہ اکثر شکایت کرتا کہ نیوز اسٹینڈ کو ان سیاہ فاموں نے کوڑا دان اور پیشاب کرنے کی جگہ بنا رکھا ہے اور وہاں سے سخت بدبو آتی ہے۔
پھر ایک رات پراسرار طور پر نیوز اسٹینڈ کے کھوکھے کو آگ لگ گئی۔ محلے کی کمیونٹی میٹنگ کے دوران اس نے سب کو ششدر کر دیا "اگر آپ سڑکیں اور علاقہ صاف رکھنا چاہتے ہیں تو یہاں سے سیاہ فاموں کو نکالنا ہوگا۔"
1981 میں تین سیاہ فام نوجوانوں نے اسے لوٹ لیا۔ وہ اسے ایک سب وے میں گھڑی، ٹیپ ریکارڈر اور نقدی وغیرہ سے محروم کرنے کے بعد دھکا دے کر فرار ہو گئے۔ مگر اس نے ان کا تعاقب کیا اور ان تینوں کو پکڑ کر تھانے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن پولیس نے برائے نام پوچھ گچھ کے بعد انہیں چھوڑ دیا اور برن ہارڈ سے خوامخواہ تین گھنٹے تک تفتیش کرتے رہے۔
اب اس نے اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ لائسنس

کی درخواست دی جو مسترد کر دی گئی۔ ستمبر 1981ء کو اس کا والد حرکت قلب بند ہونے سے چل بسا اور اس کے تین ماہ بعد وہ ٹرین میں چار سیاہ فاموں کے ساتھ بیٹھا ان پر گولیاں برسا رہا تھا۔

نقطہ تبدیلی

عام تاثر یہ ہے کہ نیویارک کے دگرگوں حالات بدلنے میں وہاں کے میئر ریڈالف جیولانی اور معاشی بہتری نے کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ بات کسی حد تک تو درست ہے۔ لیکن مشہور مصنف میلکم گلیڈ ویل نے اپنی تازہ بیسٹ سیلر کتاب "دی ٹپنگ پوائنٹ" (THE TIPPING POINT) میں لکھا ہے کہ ریڈالف کے میئر بننے سے پہلے ہی حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔

حالات اس وقت خراب ہونا شروع ہوئے جب نیویارک کے شہری اور پولیس اہلکار معمولی مجرموں کا مقابلہ کرنے سے بھی کترانے لگے۔ لوگوں نے مزاحمت ترک کر دی تھی جس کے باعث کم عمر اناڑی لاابالی اور کھلنڈرے نوجوان بھی خطرناک غنڈوں کی شکل اختیار کر گئے۔ وہ ہر جگہ دندناتے پھرتے اور جب اور جہاں چاہتے واردات کرتے۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ اسٹیشن پر کوئی بھی مسافروں سے ٹکٹ طلب کرنے کی جرات نہ کرتا۔ جب شریف لوگ دیکھتے کہ کوئی ٹکٹ نہیں لے رہا تو وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگے۔

سڑکوں پر شراب کی خالی بوتلوں اور کوڑے کے ڈھیر نظر آتے۔ اخبار فروشوں کے کھوکھے بیت الخلا بن چکے تھے۔ پبلک مقامات پر پیشاب کرنا عام سی بات تھی جس سے فضا بدبودار ہو گئی۔ کوکین اور ہیروئن کی خرید و فروخت اور نشہ معمول بن چکا تھا۔ یوں جرائم وبا کی طرح پھیلتے گئے اور پولیس اور سیکیورٹی کا نظام مفلوج ہو کر رہ گیا۔

یہ تھی وہ تباہ کن صورت حال جب برن بارڈ کے ہاتھوں سیاہ فام غنڈے مارے گئے۔ ایک عام شہری کی جرات نے نیویارک کے مجرموں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ قدرے محتاط ہو کر وارداتیں کرنے لگے۔ ملیکم گلیڈ ول کے بقول یہ نتیجہ تھا "ٹوٹی کھڑکی کی تھیوری" (Broken Window Theory) کا۔ یہ تھیوری مشہور ماہر جرمیات جیمز ولسن اور جارج کیلنگ نے پیش کی تھی۔ اس نظریے کے مطابق معاشرے میں انتشار اور بدنظمی کے باعث جرم جنم لیتا اور پھر پھیلتا چلا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک عمارت کی کھڑکی ٹوٹی ہو اور اس کی مرمت نہ کی جائے تو آس پاس کے لوگ اسے خالی اور ویران سمجھتے ہیں جس کا کوئی رکھوالا نہیں ہوتا۔ پھر جلد ہی مزید کھڑکیاں ٹوٹنی شروع ہو جاتی ہیں اور لاقانونیت کا احساس اس عمارت سے پورے محلے تک پھیل جاتا ہے۔ تب کوئی بھی کسی بھی وقت اس عمارت میں داخل ہوتا اور اسے اپنے مذموم مقاصد کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ شہر میں موجود چھوٹے چھوٹے جرائم بھی ٹوٹی کھڑکیوں کے مانند ہیں۔ اس تھیوری کے مطابق جرائم بھی چھوت کی طرح ایک انسان سے دوسرے تک پھیلتے ہیں... جس طرح اچانک کوئی فیشن شہروں میں عام ہو جاتا ہے۔

اس تھیوری کے خالق کیلنگ کو 1985ء میں نیویارک کی ٹرانزٹ اتھارٹی کا مشیر مقرر کیا گیا تو

انھوں نے "ٹوٹی کھڑکی تھیوری" کو قابل عمل بنانے پر زور دیا۔ تب اتھارٹی نے سب وے سسٹم کی دوبارہ تعمیر کے لیے کئی ارب ڈالر والے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ڈیوڈ گن کو بطور ڈائریکٹر مقرر کیا۔

لوگوں اور میڈیا نے اس پر زور دیا کہ معمولی مسائل پر توجہ دینے کے بجائے سسٹم پر توجہ دیں جو بالکل تباہ ہونے کے قریب ہے۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ چھوٹے موٹے جرم ہی سسٹم کی تباہی کا باعث ہیں۔ اگر ہمیں ادارے کا سسٹم دوبارہ تعمیر کرنا ہے تو پہلے یہ جرم روکنے ہوں گے۔ دس ملین ڈالر مالیت کی ایک نئی ٹرین کی طرح کئی ٹرینیں سسٹم میں آتی ہیں تو پہلے انھیں محفوظ رکھنے کا بندوبست ہونا چاہیے۔

تب یہ رواج تھا کہ نئی ریل گاڑی پہلے ہی دن اس پر بیہودہ نقش و نگار بن چکے ہوتے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ نئے نظام کے تحت جب تک ٹرین صاف نہ ہو جائے، دوبارہ ٹریک پر نہیں جائے گی۔ چنانچہ اب مجرموں اور قانون نافذ کرنے والوں کے مابین ٹھن گئی۔ اس عمل میں چھے سال لگ گئے۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب ٹرینیں صاف رہنے لگیں۔ ہفتوں گزر جاتے اور ان پر نقش و نگار نظر نہ آتے۔

آخر قانون کی بالادستی جرائم پیشہ افراد کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ حکومت کی ایک چھوٹی سی فتح تھی جو قطرہ قطرہ دریا کی صورت اختیار کر گئی اور جرائم پیشہ افراد کو منہ کی کھانی پڑی۔

1990ء میں ولیم بریٹن کو ٹرانزٹ اتھارٹی کا پولیس چیف لگایا گیا تو اس نے بھی ڈیوڈ گن کی طرح "ٹوٹی کھڑکی تھیوری" پر عمل جاری رکھا اور بغیر ٹکٹ مسافروں پر کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ ایسے اسٹیشنوں پر جہاں چوری چکاری کی وارداتیں سب سے زیادہ تھیں اس نے سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکار تعینات کر دیے۔ موبائل تھانوں کے ذریعے موقع ہی پر غنڈوں کو پکڑ کر ان کے فنگر پرنٹس لیے جاتے تو فوراً ماضی کا ریکارڈ سامنے آ جاتا۔ انھیں فوری ہتھکڑیاں لگا سارا دن اسٹیشن پر نمایاں جگہ کھڑا رکھا جاتا تاکہ باقی مجرم ان سے عبرت حاصل کریں۔

تلاشی کے دوران بہت سے مجرموں سے اسلحہ اور منشیات بھی برآمد ہوتی۔ سوا ڈالر کے ٹکٹ کی چوری چھوٹا سا جرم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے جرم کی روک تھام سے پولیس کی کارکردگی کو چار چاند لگ گئے اور بڑے بڑے مجرم، قاتل اور مفرور ہاتھ آنے لگے۔

بگاڑ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی وارداتوں کو اہمیت نہ دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر شروع ہی میں ان کا قلع قمع کر دیا جائے تو نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی۔

☆☆☆

انڈر گراؤنڈ سب وے جرائم پیشہ افراد کے گڑھ تھے۔ شراب پینا، تمام بغیر اسلحہ اور ٹکٹ خرید کر سفر کرنے [illegible] ہیں۔ مجرم بریٹن شرابیوں اور غل غپاڑہ کرنے والوں کو سب وے سے نکال باہر کیا۔ اس نے چھوٹے چھوٹے جرائم کا نوٹس لینا بھی شروع کر دیا۔ اس طرح سب وے کی زندگی معمول پر آ گئی۔

1994ء میں میئر بننے کے بعد روڈلف جیولانی نے بریٹن کو نیویارک سٹی پولیس کا سربراہ بنا دیا۔ اس ادارے میں بھی بریٹن نے "ٹوٹی کھڑکی تھیوری" پر عمل کیا۔ پبلک مقامات پر شراب نوشی یا پیشاب کرنے کے قانون پر سختی سے عمل درآمد کرایا اور نعرہ دیا "اگر آپ سڑک پر پیشاب کریں گے تو آپ کو جیل جانا ہو گا۔" یوں بظاہر غیر اہم جرائم اور چھوٹی چھوٹی جزئیات پر توجہ دینے سے قانون نافذ کرنے والوں نے نیویارک کو امن سلامتی اور روشنی کا شہر بنا دیا۔ یہ قانون کی حکمرانی کی جانب پہلا قدم تھا۔

◆◆◆

انٹرویو

میں ٹاٹ اسکول سے پڑھا ہوا "سیلف ٹاٹ" مصوّر ہوں

بے جان کینوس پہ رنگ و خط سے اسلام، پاکستان اور اقبالؒ کا روحانی ورثہ زندہ کر دینے والے ممتاز مصوّرانہ خطاط اسلم کمال سے دلچسپ و منفرد انٹرویو

تحریر و ملاقات: سید عاصم محمود
شریکِ گفتگو: طیب اعجاز قریشی
پروفیسر محمد فاروق قریشی

یہ مارچ 1969ء کی بات ہے۔ صدر ایوب خان عنانِ اقتدار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر کے گھر روانہ ہوئے۔ نئے پاکستانی حکمران نے آتے ہی عوام پر مارشل لا مسلط کیا اور قوم سے خطاب فرمایا جو سرکاری بزرجمہروں کی "ذہانت" کا نمونہ تھا۔ جنرل یحییٰ خان نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"پاکستان میں مارشل لا لگ چکا... مگر آئین بحال ہے... اور سیاسی سرگرمیوں کی بھی اجازت ہے۔"

یہ تینوں باتیں متضاد اور ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اردو ڈائجسٹ کے مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی یہ واہیات تقریر سن کر بے چین ہو گئے [illegible] کہ حکمرانوں کی سوچ کا تضاد کیونکر اجاگر کیا جائے۔

الطاف صاحب نے یہ نکتہ آشکار مصور جناب اسلم کمال سے بیان کیا اور کہا کہ اس کی بنیاد پر اردو ڈائجسٹ کے شمارہ نئی کا ایسا سرورق بنایئے جو حکمران طبقے کی منافقت کا پردہ چاک کر ڈالے۔ جب یہ تجویز ایک منفرد تخلیق کار کے ہاتھ لگی تو وہ بھی غور و فکر کرنے لگے۔ آخر سوچ بچار ہی سے اردو ڈائجسٹ کا ایسا سرورق تخلیق ہوا جو آج بھی احتجاجی خیالی جذبات کا استعارہ اور آمروں کے منہ پر طمانچہ سمجھا جاتا ہے۔

اسلم کمال نے سرورق پر ایک ٹریفک سگنل دکھایا... ایسا سگنل جس کی تینوں سرخ، پیلی اور سبز بتیاں روشن تھیں۔ یوں عیاں کیا گیا کہ پاکستان کی نئی فوجی حکومت تضادات کا شکار اور بیک وقت ایک سے زیادہ کشتیوں کی مسافر ہے۔ اس علامتی سرورق نے یحییٰ خان حکومت کو بہت مضطرب کر ڈالا۔ اگر مشرقی پاکستان میں ہنگامے شروع نہ ہوتے، تو شاید وہ اردو ڈائجسٹ پر پابندی لگا دیتی۔

مگر یہ تو محض علامتی سرورق ایک اور اہم جہت رکھتا ہے... اس میں مستقبل کی پیش گوئی بھی پوشیدہ تھی۔ ظاہر ہے جب ٹریفک سگنل کی تینوں بتیاں جل رہی ہوں تو کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ خدشہ کچھ ہی عرصے بعد سانحہ مشرقی پاکستان کی صورت رونما ہو گیا۔

اسلم کمال جذبۂ حب الوطنی سے مالامال ہیں۔ وہ پاکستان ٹوٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان کی روحانی بصیرت نے جان لیا کہ یحییٰ خان حکومت یونہی ملک و قوم سے کھلواڑ کرتی رہی تو خدانخواستہ یہ حادثہ جنم لے سکتا ہے۔ صد افسوس کہ یہ کابوس حقیقت میں بدل گیا۔ مگر اسی تجربے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصور بھی اس روحانی واردات سے گزرتے ہیں جو بطور انبیائے کرام کی میراث تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔

[illegible] سرورق، اسلم کمال تو ویسے بھی پاکستان میں "مصورانہ خطاطی" کے حوالے سے مشہور ہیں۔ یہ اسلامی خطاطی کی وہ قسم ہے جو قلم و دوات سے کاغذ کے بجائے رنگ اور برش سے کینوس پر کی جاتی ہے۔ مصورانہ خطاطی کے فن پارے رنگوں کی دلکشی و دلربائی سے انسان کے فطری ذوقِ جمال کو تسکین دیتے اور اسے روحانی بالیدگی عطا کرتے ہیں۔

اسلم صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ خود پروردہ مصور و خطاط ہیں۔ آپ نے بنیادی طور پر مشاہدے کی صلاحیت سے غیر معمولی طور پر استفادہ کرتے ہوئے مصوری و خطاطی کے اسرار و رموز جانے۔ فطرت کی آغوش میں تربیت پانے ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے فن پاروں سے فطری خوبصورتی جھلکتی

ہزاروں سال قبل ایک یونانی دانا انتراطا نے کہا تھا: "تصویر خاموش شاعری ہے۔ اور شاعری ایسی تصویر جو بول پڑے۔" اسی منفرد فن سے وابستہ وطن عزیز کے ممتاز خطاط و مصور اسلم کمال ادیب، شاعر اور نقاد بھی ہیں۔ حنیف رامے کے ساتھ مصورانہ خطاطی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے "خط کمال" ایجاد کیا جسے خالد جاوید یوسفی سمیت بیشتر خطاط باقاعدہ خط تسلیم کر چکے۔

اسلم صاحب خود پروردہ فنکار ہیں۔ ابتدا خاصے کشٹ اٹھائے۔ مگر آج اپنے فن کی بدولت آسودہ حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کتب و رسائل کے سرورق بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے مطابق آپ اب تک بائیس ہزار سرورق تخلیق کر چکے جو ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ اسی باعث وزارت ثقافت نے آپ کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں شامل کرنے کی سفارش کی ہے۔ یہ امر پاکستان کے لیے ایک اعزاز ہے۔

اسلم کمال پاکستان میں رجحان ساز تخلیق کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مصورانہ خطاطی کے نمونے ہوں، تصاویر، خاکے، کیریکیچر یا سرورق... ان کی تخلیقات ہر عمر کے مرد و زن میں مقبول ہیں اور انھیں بالیدہ کرنے کا ذریعہ بھی! مشہور ادیب اور وکیل اعجاز حسین بٹالوی کا کہنا تھا: "میں روزانہ صبح اٹھ کر اسلم کمال کی خطاطی کا نمونہ دیکھتا ہوں۔"

آپ تین سفرنامے اور مصورانہ خطاطی پر کتب تحریر کر چکے۔ سفرناموں میں آشنا دوار سے چین تک اور "اسلم کمال اوسلو میں" شامل ہیں۔ اہم کتب یہ ہیں: اسلامی خطاطی: ایک تعارف، قلم موقلم، کسب کمال (کلام اقبال پر مبنی تصاویر) اور گرد پوش۔ شاعر مشرق کے فرزند جسٹس (ر) جاوید اقبال کا یہ تبصرہ اسلم کمال کی شخصیت و فن کو بخوبی اجاگر کرتا ہے: "آپ کی بیشتر تخلیقات اب بلاشبہ نوادرات کا درجہ پا چکیں۔ اسلم کمال آج بذات خود ایک مکتب فکر اور معیار فن بن چکے۔"

بچپن اور لڑکپن کی سہانی یادیں تازہ کرتے ہوئے

اور ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے۔

پچھلے دنوں سادگی و محبت سے متصف نرم و میٹھے لہجے اور کھلی رنگت کے مالک اسلم کمال سے طویل نشست رہی۔ یادوں کے اس دلچسپ سفر میں طبیب اعجاز قریشی اور پروفیسر فاروق قریشی بھی ہمراہ تھے۔ دوران گفتگو کبھی خوشگوار لمحات ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتے تو کبھی پریشان کن یادیں افسردگی طاری کر دیتیں۔ اسلم کمال صاحب کے تجربات زندگی اور سفر زیست کا حال نذر قارئین ہے۔

☆☆

اسلم کمال کہنے لگے۔ انھوں نے خواب ناک لہجے میں بتایا: "میں 1939ء میں سیالکوٹ کے مضافاتی گاؤں گوہد پور میں پیدا ہوا۔ میرے والد محمد شفیع مقامی انشورنس کمپنی میں اکاؤنٹنٹ (منشی) تھے۔ ہمارا گھرانا متمول نہیں تھا مگر اپنے علم و فضل کے باعث علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ ان پڑھ گاؤں والے والد سے خطوط پڑھواتے اور لکھواتے۔ والدہ بچے بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ ہم پانچ بھائی تھے اور ایک ہماری بہن ہے۔"

اب گفتگو کا رخ تعلیم کی سمت مڑ گیا جو انسان کو

مصورانہ خطاطی نے کیسے جنم لیا؟

دورانِ گفتگو اسلم صاحب نے تفصیل سے بتایا کہ وطنِ عزیز میں مصورانہ خطاطی نے کیونکر جنم لیا۔ لیجیے آپ بھی پڑھیے:

قیامِ پاکستان کے بعد نیا معاشرہ تخلیق پایا تو ایک نئی قوم کے تصور نے بھی جنم لیا۔ اس قوم کو نئے اور انفرادی ذوقِ جمال کی ضرورت تھی جو ہماری مذہبی روایات پہ استوار ہو۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 1950ء کی دہائی میں لاہور کے بعض مصوروں نے کچھ تجربے کیے۔

ان دنوں یورپ میں تجریدی مصوری کا شہرہ تھا۔ یہ طرزِ مصوری پاکستان بھی پہنچا اور کچھ فن کاروں کو متاثر کیا جن میں انور جلال شمزا شامل تھے۔ شمزا پہلے پاکستانی مصور ہیں جنھوں نے اسلامی خطاطی کے بصری حلیے کو تجریدی مصوری میں پینٹ کیا۔

شمزا کچھ عرصے بعد برطانیہ چلے گئے۔ ان کے بعد محمد حنیف رامے نے روایتی خطاطی میں رنگ اور جدید خط شامل کر کے مصورانہ خطاطی کا آغاز کیا۔ انھوں نے روشن رنگوں، برش اور پینٹنگ نائف کے ذریعے کینوس پر اللہ تعالیٰ کے پاک نام تحریر کیے۔ حنیف رامے ہی پاکستان میں مصورانہ خطاطی کے باقاعدہ بانی ہیں۔

مصورانہ خطاطی کو مقبول بنانے کے لیے حنیف رامے نے قابلِ قدر کاوش کی۔ تاہم 1962ء میں وہ اس نومولود فن کو بے آسرا چھوڑ کر کوچۂ سیاست میں جا نکلے۔ یوں اس ابھرتے فن کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

اسی دوران ستمبر 1965ء میں پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔ 6 ستمبر کو صدر ایوب خان نے ولولہ انگیز تقریر کی۔ اس

شعور عطا کرتی اور اسے دنیا میں آنے کا مقصد سمجھاتی ہے۔

تعلیمی سفر کی بابت اسلم صاحب نے بتایا ”گاؤں کے نزدیک ہی ڈسٹرکٹ بورڈ پرائمری اسکول تھا۔ وہیں پرائمری تعلیم پائی۔ پھر مزید تعلیم کی خاطر ”اقبال میموریل ہائی اسکول کوہدیور، مراد پور“ میں داخلہ لیا۔ یہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی یاد میں قائم ہونے والا دنیا کا پہلا اسکول تھا جو اب کالج کی صورت اختیار کر چکا۔“

اقبال میموریل ہائی اسکول کے ہر کمرا جماعت میں آمنے سامنے کی دیواروں پر آیاتِ قرآنی و احادیثِ نبویؐ اور اشعارِ اقبال خوبصورت خطاطی میں کپڑے کے بینروں پر آویزاں تھے۔ اس ماحول میں تعلیم پاتے بچے بچپن ہی سے اپنی عظیم اسلامی و قومی تہذیب و تمدن سے آگاہ ہو جاتے۔ اسلم صاحب کی ذہنی نشوونما میں بھی آیات، احادیث اور اشعارِ اقبال نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ بتاتے ہیں:

”مجھے شعر اور مصوری سے روزِ اول لگاؤ تھا۔ ایسا ماحول ملا جہاں قرآن پاک پڑھایا جاتا، احادیث نبویؐ کے ذریعے بچوں کی اخلاقی تعلیم دی جاتی اور اقبال کے اشعار ایمانی و ملی جذبات ابھارنے میں کام آتے۔“ افسوس کہ مسلم معاشرے کی بہترین مذہبی و اخلاقی تعلیم و تربیت کرنے والا یہ ماحول شہروں سے ختم ہو چکا اور اکا دکا دیہات ہی میں نظر آتا ہے۔

پلتے بڑھتے اسلم کمال کمسن ہی تھے کہ انھیں ایک صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہونا پڑا۔ 1944ء میں ان کے

تقریر میں انھوں نے جوش و خروش سے کلمہ طیبہ بھی پڑھا۔

صدر ایوب کی تقریر نے اسلم کمال میں بھی جوش و جذبہ بھر دیا۔ انھوں نے پھر اپنے انداز میں دشمن کے خلاف یوں جنگ لڑی کہ سترہ دنوں میں سترہ تصاویر بنائیں۔ اور پہلی تصویر کلمہ طیبہ کی مصورانہ خطاطی تھی۔

یوں حنیف رامے نے مصورانہ خطاطی کو جس جگہ بے سہارا چھوڑا تھا، وہاں سے اسلم صاحب نے اس کی انگلی تھام لی۔ انھوں نے جو فن پارے تخلیق کیے ان کی نمائش لاہور آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی جسے غیر ملکی صحافیوں نے بھی دیکھا۔

بعد ازاں اسلم صاحب کی تخلیقات دیکھ کر صادقین بھی مصورانہ خطاطی کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے نام اس نئے فن میں تخلیق کیے۔ 1973ء میں لاہور عجائب گھر میں صادقین کے انھی فن پاروں کی نمائش منعقد ہوئی۔ یہ مصورانہ خطاطی کے نمونوں کی پہلی نمائش تھی۔ دوسری نمائش اسلم صاحب کے فن پاروں کی تھی جو لاہور ہی میں اگلے سال الحمرا میں منعقد ہوئی۔

اس طرح پاکستان میں مصورانہ خطاطی کا نوخیز فن جڑ پکڑنے لگا۔ اس کے فروغ میں صادقین اور اسلم کمال نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان دونوں فنکاروں کی مصورانہ خطاطی نے ملک میں ایسا ماحول بنا دیا کہ 1980ء میں وزارت ثقافت کے تحت اسلام آباد میں یک روزہ سیمینار میں خطاطی اور مصورانہ خطاطی کو پاکستان کے بصری فنون لطیفہ میں باقاعدہ شامل کر لیا گیا۔ اور اگلے سال 1981ء میں فنون لطیفہ کے کل پاکستان مقابلوں میں مصورانہ خطاطی کا پہلا انعام اسلم کمال کو دیا گیا۔ اور اب تک یہ اول انعام کسی اور مصور خطاط کو نہیں ملا۔ آپ کو 1993ء میں حکومت نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔

میں طاعون کی بیماری پھیلی۔ اس کی لپیٹ میں آ کر ان کے والد صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یوں وہ محض پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ تاہم آپ کے بڑے بھائی پروفیسر عبدالعزیز کمال مرحوم بہت فرض شناس، ہمدرد اور اہل خانہ سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ انھوں نے اس نازک موقع پر گھر کو سنبھالا، والدہ اور بہن بھائیوں کو دلاسا دیا اور یوں زندگی اپنی ڈگر پر دوبارہ رواں دواں ہو گئی۔ پروفیسر عبدالعزیز کو اس گاؤں میں بی اے کرنے والے دوسرے اور پی ایچ ڈی کرنے والے پہلے نوجوان بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اسلم کمال نچلی جماعتوں ہی میں تھے کہ نہ صرف اقبال کی شاعری پڑھنے لگے بلکہ اس کے معنی بھی سمجھ جاتے۔ کہتے ہیں: "ہمارے گھر میں شاعرِ مشرق کا کلام موجود تھا۔ چناں چہ میں روزانہ اسے پڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ مجھے زبانی یاد ہو گیا۔ میں گھر کی منڈیر پر بیٹھتا اور اونچی آواز سے کلامِ اقبال پڑھتا۔ ایک دن ہمارے ہیڈ ماسٹر کو پتا چل گیا کہ میں کلامِ اقبال کا حافظ ہوں۔ سو وہ مجھے بیت بازی کے مقابلوں میں شریک کرنے لگے۔ گھر میں کوئی مہمان آتا تو مجھے کھڑا کر دیا جاتا۔ میں پھر کلامِ اقبال سنا کر انھیں محظوظ کرتا۔ غرض شاعرِ مشرق کی شاعری لڑکپن ہی میں میرے شعور کا حصہ بن گئی۔"

پروفیسر عبدالعزیز کمال اکثر اشعارِ اقبال باآوازِ بلند ذوق و شوق سے پڑھتے۔ انھیں سن سن کر اسلم صاحب کو اقبال کی کئی غزلیں و نظمیں یاد ہو گئیں۔ حالانکہ تب انھیں پڑھنا نہیں آتا تھا۔ چناں چہ اسکول اور گھر میں اساتذہ اور مہمان ننھے اسلم سے اشعارِ اقبال سننے لگے

جو بڑی دلچسپی سے کلامِ شاعرِ مشرق سنا کر سننے والوں کو محظوظ کرتے۔

شاعرِ مشرق کی شاعری امید، حیاتی، حُب نئے خوابوں سے آشنا کراتی اور انسان کو امنگوں سے بھر دیتی ہے۔ اسی لیے جب اسلم کمال کی شخصیت و کردار میں بچپن ہی سے کلامِ اقبال رچ بس گیا تو دوسرے بچوں کی نسبت ان کی تخلیقی صلاحیتیں بہت پہلے بیدار ہو گئیں۔ چونکہ وہ گاؤں کے باسی تھے جہاں پاک و صاف ہوا، لہلہاتے کھیت اور قدرتی حسن کے باعث فطرت جوبن پر ہوتی ہے، سو وہ قدرتی رنگوں کے اظہار یعنی مصوری کی سمت راغب ہو گئے۔

اسلم صاحب نے پرانی یادوں سے خاکہ دماغی خلیوں میں زندگی دوڑاتے ہوئے بتایا: ’’اسکول میں محمد اسحاق قریشی ہمارے ڈرائنگ ماسٹر تھے۔ ان سے میں نے ڈرائنگ سیکھی۔ وہ مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ ان کی نظرِ کرم کا فیض ہے کہ میں ایک مصور اور خطاط بن گیا۔ مگر مجھے تصاویر بنانے کا شوق بچپن سے تھا۔ ٹاٹ پر بیٹھتا تو انگلیوں سے مٹی میں کسی پھول، چڑیا یا جانور کی تصویریں بناتا رہتا۔ میں ہمیشہ فخر سے کہتا ہوں کہ میں ٹاٹ اسکول سے پڑھا ہوا سیلف ٹاٹ (Self taught) مصور ہوں۔‘‘ یہ بات اسلم کمال کی عظمت اجاگر کرتی ہے ورنہ بہت سے لوگ اپنے غریبانہ ماضی کا ذکر کرتے جھجکتے اور اسے پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مصوری سے رغبت رکھنے کے باعث ایک طرف تصاویر بنانے کا سلسلہ جاری رہا تو دوسری سمت اسلم صاحب روایتی تعلیم بھی پاتے رہے۔ اسی دوران پروفیسر عبدالعزیز پاک فضائیہ کے شعبۂ تعلیم میں افسر بن کر کوہاٹ چلے گئے۔ اسلم صاحب بھی اکثر کوہاٹ جاتے اور بھائی کے پاس طویل عرصہ گزارتے۔ وہاں انھوں نے جنگی جہازوں کو اڑتے اور کرتب دکھاتے دیکھا تو ان میں ہواباز بننے کی تمنا نے جنم لیا۔

اسلم صاحب نے پھر پائلٹ بننے کے لیے امتحان دیا مگر ناکام رہے۔ بہرحال انھوں نے روایتی تعلیم جاری رکھی اور 1960ء تک بی اے کر لیا۔ اس زمانے میں گریجوایٹ بننا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر وہ کراچی پہنچے اور ’’آرٹ ٹیکنیک اینڈ ڈرائنگ‘‘ سے آرٹ کا اسکالرشپ حاصل کر کے آٹھ دس ماہ کی مدت میں مکمل کمرشل آرٹسٹ بن گئے۔ گویا کراچی شہر نے انھیں ایک باقاعدہ آرٹسٹ تسلیم کر لیا۔ وہ پھر اپنا مصورانہ اقتدار اور اعزاز آزمانے لاہور چلے آئے۔ یہ 1961ء کی بات ہے۔

لاہور میں ایک سخت زندگی سیالکوٹی نوجوان کی منتظر تھی۔ ایک رشتے دار کے ہاں 25 روپے ماہوار پر وہ ’’پے انگ گیسٹ‘‘ ٹھہرے۔ سر چھپانے کو ٹھکانا ملا تو انھوں نے مصوری کی اپنی خداداد صلاحیت کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں رسالوں کے سرورق بنانے کی ٹھانی۔ ان میں بچپن سے قلم سے محبت کی بنا پر ہو گئی۔ چناں چہ انھوں نے پہلا سرورق رسالہ نقوش کا بنایا جو بہت پسند کیا گیا۔ اردو بازار کے ایک ناشر نے ان سے ’’سلطان محمد فاتح‘‘ کتاب کا سرورق بنانے کو کہا۔ اس کٹھن دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اسلم صاحب نے بتایا:

’’سرورق بنایا تو وہ انھیں پسند آیا۔ تب معلوم ہوا کہ یہ کتاب مکتبہ فرینکلن شائع کر رہا ہے۔ یہ اشاعتی ادارہ امریکی ناشرین کی امداد سے قائم ہوا تھا۔ سو میں مکتبہ فرینکلن کے ناظم مولانا حامد علی خان سے جا کر ملا

تاکہ سرورق کی منظوری لے سکوں۔

"مولانا حامد علی صاحب ممتاز دانش ور تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی تھے اور ادبی رسالے مخزن، ہمایوں اور الحمرا کے مدیر رہے۔ انھیں میرا بنایا سرورق پسند آیا۔ لیکن ناشر بعدازاں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر مجھے حامد صاحب کے پاس بھجواتے رہے۔ میں خاصا عاجز ہوا۔

"آخر مولانا حامد علی خان نے اس گتھی کا راز کھولا اور بتایا کہ چونکہ یہ کتاب ہم چھپوا رہے ہیں، سو ناشر چاہتے ہیں کہ سرورق کی قیمت بھی ہم ہی ادا کریں۔ مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ تاہم ہمیں آپ کا کام پسند آیا ہے۔ لہٰذا آپ کوئی دوسرا کام کر دیجیے۔ انھوں نے پھر ایک انگریزی کتاب دکھائی جس میں تصاویر بنی ہوئی تھیں اور پوچھا کہ آپ ان سے ملتی جلتی تصویریں بنا لیں گے؟ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مولانا بولے کتنا معاوضہ لیں گے؟ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ تصویر بنانے کا معاوضہ کتنا ہوتا ہے۔ بہرحال میرے منہ سے نکل گیا: دس روپے! وہ مسکرا کر گویا ہوئے: ہم تمھیں روپے دیتے ہیں۔ بہرحال آپ تصاویر بنائیے۔ جب میں نے انھیں تصاویر بنا کر دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ انھیں فی تصویر دس روپے ہی معاوضہ دیا جائے۔ کتاب کے اندر سولہ تصاویر تھیں۔ یوں مجھے ایک ساتھ ڈیڑھ سو روپے سے زائد رقم مل گئی۔"

اس طرح بچپن کا سیکھا ہنر ثابت قدمی اور محنت اسلم صاحب کے کام آئی اور ان کی راہِ زندگی متعین ہو گئی۔ وہ انسان یقیناً خوش قسمت ہے جو اپنی پسند کا مشغلہ ہی بطور پیشہ اپنا لے۔ اسلم صاحب پھر کتب و رسائل کے سرورق بنانے لگے۔ انھوں نے یہ کام اتنی خوبی، تندہی اور جذبے سے کیا کہ سرورق بنانے کو ایک آرٹ یا فن کا درجہ دے ڈالا۔

پینتالیس سال قبل لاہور ادبی رسائل کا مرکز تھا۔ تاہم ان میں نقوش اور سویرا ہی ہر بار نیا سرورق شائع کرتے تھے۔ لیکن اردو ڈائجسٹ نکلا تو اس نے انقلاب برپا کر دیا۔ اسلم کمال اس دور انقلابات کے امین ہیں۔ انھوں نے ہم انجانوں کو بتایا "اردو ڈائجسٹ ہی ہر ماہ نیا سرورق لانے کا رجحان سامنے لایا۔ کبھی کوئی پھول نظروں کو بھاتا تو کبھی پہاڑوں یا برف باری کا منظر نظر آتا۔ غرض اردو ڈائجسٹ نے سرورق کے شعبے میں جدت و ندرت پیدا کر ڈالی۔"

اسلم کمال اردو ڈائجسٹ کے نت نئے سرورق دیکھ کر سراہتے لیکن اس رسالے سے ان کا تعلق بعد میں ہوا اور تب وہ مصورانہ خطاطی کی اچھوتی و جادوئی دنیا میں داخل ہو چکے تھے۔

جیسا کہ بتایا، اسلم صاحب نے مشاہدے کی قوت سے اپنی مصورانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ انھوں نے پینٹروں اور مصوروں کی تخلیقات دیکھ دیکھ کر اپنا ہنر سنوارا اور اس کی خامیاں درست کیں۔ وہ گھنٹوں مصوروں کا کام دیکھتے اور ان کی فنی صلاحیتیں پرکھتے۔ یوں ان میں ایسے خود پروردہ مصور نے جنم لیا جو انگلیوں کی بنت کاری سے سحر انگیز تصاویر تخلیق کر سکتے۔

اس زمانے میں اسلم صاحب رسالوں اور کتب کے دیدہ زیب سرورق بنا رہے تھے۔ ہر سرورق کی بنیادی ضرورت یہ تھی کہ خطاط تصویر کی ہیئت ترکیبی مدنظر رکھ کر سرخی خوبصورت انداز میں لکھے۔ تاکہ مصوری و خطاطی کے امتزاج سے منفرد و عمدہ آرٹ سامنے آجائے۔

بڈھے بلوچ کی وصیت

چند سال کی بات ہے، میں ایوان اقبال سے منسلک تھا۔ ایک دن کوئٹہ بلوچستان سے چند طلبہ و طالبات مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کی تخلیقات کے مداح ہیں اور شاید یہی کشش ہمیں آپ تک کھینچ لائی ہے۔
میں نے انھیں بتایا کہ یہ عبارت علامہ اقبالؒ سے منسوب ہے۔ مرحوم کی ایک کتاب "ارمغان حجاز" میں نظم ملتی ہے:
بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" یہ ہے وہ قدر مشترک جو آپ جیسے صاحبانِ علم کو مجھ تک کھینچ لائی۔ یہ بڈھے بلوچ دراصل علامہ اقبال خود ہیں۔ اس نظم کے پہلے شعر میں وہ اپنے بلوچ بچوں کو بتاتے ہیں:

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا

اب یہ دیکھیے کہ بلوچستان جنگ و جدل کے شعلوں میں گھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دشمن وہاں نفرت کا الاؤ بھڑکا رہے ہیں لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ بلوچستان میں کلام اقبال کیوں مشتہر نہیں کیا جاتا؟ شاعر مشرق نے برسوں قبل اس نفرت کا یہ توڑ بتا دیا تھا کہ دلی یا کوئی اور ملک صحرائے بلوچستان سے قطعاً بہتر نہیں۔ اسی طرح اگلے اشعار ہیں:

جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

غرض اس نظم کی روشنی میں ہمیں اپنے بلوچ بھائیوں کو باور کرانا چاہیے کہ آپ اس ملک کا حصہ ہیں اور اس کی روح میں شامل۔ لہٰذا آپ ہمیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ جو آپ کو علیحدہ ہونے پر اکساتا ہے، وہ دوست نہیں دشمن ہے۔

مگر اس زمانے کے معروف خطاط اور کاتب نوجوان اسلم کمال کو غیر تجربے کار اور نوآموز سمجھتے تھے۔ اس لیے جب اسلم صاحب بتاتے کہ سرخی اس انداز میں لکھیں تو خطاط انھیں کہتے: "تمھیں اس فن کی کیا خبر، یہ ہمارا کام ہے، ہمیں ہی کرنے دو۔"

رسالہ نقوش کے خطاط محمد حسین شاہ اپنے فن میں طاق تھے۔ وہ اسلم صاحب کی بنائی تصویر کی فنی طلب کے مطابق لفظ نقوش لکھتے اور سرورق کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتے۔ مگر دیگر خطاط ایسا کمال فن نہ دکھا پاتے۔ یہی مسئلہ مدنظر رکھ کر انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ وہ خود خطاطی سیکھ لیں؟ یوں اس طرح یہ انمول فن بھی مشاہدے کی خداداد صلاحیت سے اسلم کمال کی انگلیوں پر رواں دواں ہوا۔

اس موقع پر ان سے سوال ہوا کہ آپ سرورق کو

بہت اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن نیشنل کالج آف آرٹس اور کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن جامعہ پنجاب کے اساتذہ سرورق کو یہ درجہ نہیں دیتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

اسلم صاحب کہنے لگے ”اساتذہ کی بات اپنی جگہ مگر فنکار جب استاد ہو جائے تو وہ اساتذہ جیسی ہی باتیں کرتا ہے۔ غور فرمائیے کہ آج پاکستان کی ہر یونیورسٹی میں شعبہ فنون لطیفہ قائم ہو چکا ہے لیکن یونیورسٹیوں کے زیرِ اہتمام کالجوں میں ابھی یہ شعبہ قائم نہیں ہوا اور جن میں قائم ہے وہاں پر بھی اختیاری ہے۔ چناں چہ مصوری کا تصور، اس کا شعور نہ یونیورسٹی، نہ کالج اور نہ کوئی آرٹ گیلری دیتی ہے۔ لیکن کتاب یا قاعدہ پہلی جماعت کا ہو یا ایم اے کی کتاب کا، اس پر سرورق ضروری ہے اور یہی سرورق دراصل آرٹ کا پہلا تصور اور شعور عطا کرتا ہے۔

سفرِ زندگی کے ایک اور سنگ میل کی یاد بیان کرتے ہوئے ان کا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ جیسے اپنے ماضی میں ڈوب کر بولنے لگے: ”خاندانی تربیت کے باعث اسلامی کلچر میرے خمیر میں رچا بسا تھا۔ سو خطاطی کے اسرار و رموز سمجھنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میں عظیم خطاطوں کے کام کی نقل کرتا اور لکیروں سے زاویے اور دائرے بناتا۔

”جب میرا ہاتھ کچھ رواں ہو گیا تو میں محمد حسین شاہ سے ملا۔ تب وہ میری تصویر کی فنی ضرورت کے مطابق نقوش کی سرخی لکھ رہے تھے۔ میں نے کہا شاہ صاحب! حرف ھ کے اوپر نیچے دو دائروں کی جگہ اوپر نیچے دو نکونیں بنا دیں جائیں تو کوئی حرج ہے؟

”وہ کہنے لگے کوئی حرج نہیں۔ انھوں نے پھر میری تجویز کے مطابق سرخی لکھی اور وہ پہلے سے زیادہ جاذب نظر ہو گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر محمد حسین شاہ میری تجویز ٹھکرا دیتے تو شاید میں کبھی خطاط نہ بن پاتا۔“

یوں ایک تجربے کار و مستند خطاط نے نوآموز مصور کی ہمت بڑھا کر اسے جوش و ولولے سے بھر دیا۔ عظیم لوگوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل سے دوسروں کو مہمیز دیتے اور ان میں پوشیدہ صلاحیتیں اُبھارتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محمد حسین شاہ ہی مصورانہ خطاطی کے بانیوں میں شامل ایک اور پاکستانی مصور خطاط محمد حنیف رامے کے باقاعدہ استاد ہیں۔ جبکہ اسلم کمال بھی خطاطی میں انھیں اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔

اس طرح اسلم کمال مصورانہ خطاطی کی وسیع و عریض دنیا میں آ نکلے اور نت نئے تجربوں سے اپنا نوآموختہ ہنر نکھارنے لگے۔ انھوں نے نقوش، نیرنگ خیال اور دیگر ادبی رسائل کے معرکتہ آلارا سرورق بنائے۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے اردو ڈائجسٹ اسلم صاحب کی زندگی میں داخل ہوا۔

یہ 1968ء کی بات ہے، ادارہ اردو ڈائجسٹ نے سالنامے کا سرورق بنوانے کے لیے اسلم صاحب سے رابطہ کیا۔ ہمارے مدیران اس رسالے کے سرورقوں کی پوری تاریخ سے آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی دیکھتے کہ رسالہ معیاری کاغذ پر عمدہ انداز میں طبع ہوتا ہے۔ سو انھوں نے سوچا کہ سالنامے کا سرورق بھی یکتا و بے مثال ہونا چاہیے۔ اسی نکتے پر وہ غور و فکر کرنے لگے۔

اسلم صاحب پر پھر جو خیالات القا ہوئے وہ انھی کی زبانی سنیے: ”میں سوچ بچار میں محو تھا کہ مجھے خیال آیا ”ہمیں حکم الٰہی ہے جو کام کرو تو پہلے اسی کا نام لو۔“ چناں چہ میں نے مصورانہ خطاطی میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا اور اس کلمہ پاک کو سرورق بنا دیا۔ اردو

ڈائجسٹ کا یہ سرورق بہت مقبول ہوا اور قارئین نے اسے بہت سراہا۔"

اس سرورق سے ایک دلچسپ واقعہ بھی وابستہ ہے۔ انہی دنوں پنجاب پبلک لائبریری میں پاکستانی مصوری کے دو "جن"، شاکر علی اور صادقین دیواری مصوری اور خطاطی (میورل) تخلیق کر رہے تھے۔ شاکر علی تب نیو اسکول آف آرٹ کے پرنسپل تھے۔ یہ دلچسپ واقعہ اسلم صاحب نے مسکراتے ہوئے ہمیں کچھ یوں سنایا:

"شاکر علی مغربی آرٹ کی تعلیم پانے والے پہلے پاکستانی مصور تھے۔ وہ ان کا خاص میدان تھا۔ مگر وہ فن خطاطی کے متعلق زیادہ نہیں جانتے تھے۔ بہرحال کمشنر لاہور مختار مسعود نے شاکر علی کو لائبریری میں بیت القرآن کی ایک دیوار پر قرآنی آیات مصور کرنے کا کام سونپا۔ انھیں کچھ سونا بھی دیا گیا تاکہ وہ اسے اپنی مصوری میں استعمال کر سکیں۔ جبکہ لائبریری کی مطالعہ گاہ میں صادقین کتب بینی کے موضوع پر ایک دیواری تصویر بنا رہے تھے۔

"میں صادقین کا قدردان تھا۔ 1960ء میں ان سے مل چکا تھا۔ سوچا کہ پھر ملا جائے تاکہ ان کے خیالات عالیہ سے استفادہ کر سکوں۔ میں ملاقات کی غرض سے جاتے ہوئے اردو ڈائجسٹ کا سالنامہ ساتھ لے گیا تاکہ وہ میرے کام سے واقف ہو سکیں۔ گویا اسم اللہ کا سرورق ایک بڑے فنکار سے ملنے کا ذریعہ بن گیا۔

"ان دنوں صادقین اور شاکر علی کے مابین چشمک چل رہی تھی۔ صادقین اپنے معاصر کو اپنے پائے کا خطاط نہیں سمجھتے تھے۔ اوپر سے مختار مسعود نے شاکر صاحب کو سونا دے ڈالا تاکہ وہ دیواری خطاطی میں

اقرا باسم ربک الذی خلق

جس طرح شاعر اور ادیب واردات قلبی سے گزر کر کندن بنتے اور اعلیٰ ادبی شاہکار تخلیق کرتے ہیں اسی طرح مصور بھی روحانی تجربے سے گزرتا اور اچھوتے خیالات کو رنگوں کی قوس قزح میں پیش کرتا ہے۔ اسلم کمال صاحب نے بتایا کہ جب وہ قرآن پاک کی سب سے پہلی آیت کی خطاطی کر رہے تھے تو انھوں نے اس منظر کا تصور کیا جب جبلِ نور پر جبرائیل علیہ السلام نے محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی وحی پہنچائی۔ تب وحی کے پہلے الفاظ "اقرا" کے زبان سے ادا ہوتے ہی زمین و آسمان تھرتھرا اٹھے ہوں گے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس پہلے لفظ کی گونج شاید کائنات میں اب تک سنائی دے رہی ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے اس کی معنوی اہمیت پر غور کیا تو دل و دماغ کے دریچے وا ہو گئے اور اندر سے یہ صدا سنائی دی:

وحی
اللہ سے
قرآن سے
رسول ﷺ سے
انسان تک

گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کو پڑھانے کے واسطے اپنے پیارے رسولؐ پر قرآن پاک نازل فرمایا۔

مطالعہ گاہ اسے استعمال کر سکیں۔ اس بات نے صادقین کو مزید آگ بگولا کر دیا۔ وہ موروثی خطاط تھے اور خود کو کم اہمیت ملنے پر چراغ پا!

"سو ایسی صورت حال میں صادقین سے ملاقات ہوئی۔ انھیں سرورق دکھایا۔ ہاتھ میں لیا، دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بولے: واہ واہ واہ، سبحان اللہ۔ اتنے

رنگ خوبصورت رنگ۔ ارے بھئی یہ ناگل شاکر علی کو بھی دکھاؤ جو مسلمانوں کے فن خطاطی پر سونے کا پانی پھیر رہے ہیں۔ یہ جملہ انھوں نے تین چار بار دہرایا اور میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔"

ایک ملک کی مٹی ہوا اور ماحول سے جڑا فنکار فطرتاً جذبہ حب الوطنی سے بھی مالامال ہوتا ہے۔ اسلم صاحب میں یہ جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس کا مظہر جنگ 1965ء میں دیکھنے کو ملا۔ وہ لمحات یاد کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ وہ رسان انداز میں بتاتے ہیں:

"جب جنگ 1965ء چھڑی تو اس میں ان ہوابازوں نے بھی حصہ لیا اور دشمن کے ہوائی اڈوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جن کے ساتھ پائلٹ بننے کا امتحان میں نے دیا تھا مگر فیل ہو گیا۔ تب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کاش میں امتحان میں ناکام نہ ہوتا، ورنہ اب میں بھی دفاع وطن میں سرگرمی سے حصہ لیتا۔ چنانچہ میں اداس ہو گیا۔

"انھی دنوں کی بات ہے، میں سوچوں میں گم لاہور کی ایمپرس روڈ پر پیدل چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے خیال آیا ضروری تو نہیں کہ جہاز میں بیٹھ کر دشمن سے جنگ کی جائے۔ لڑائی تو الفاظ، خیال اور تصویر کی مدد سے بھی لڑی جا سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں جوش و جذبے سے اتنا بے تاب ہوا کہ یقین جانیے گھر پہنچنے تک زندگی کی پہلی نظم کہہ ڈالی۔ میرا کرائے کا گھر تھا۔ میں نے وہاں اپنے کمرے کو بلیک آؤٹ کیا اور تصاویر بنانے لگا۔ جنگ 17 دن جاری رہی تھی، میں نے بھی سترہ ہی تصویریں بنائیں۔ الحمرا آرٹس کونسل میں ان تصاویر کی بیرونی دنیا سے آنے ہوئے جنگی رپورٹروں کے لیے خصوصی طور پر نمائش کی گئی۔ یوں میں بھی اپنے انداز میں محاذ جنگ پر لڑا۔"

برصغیر پاک و ہند کے عظیم مصوروں میں عبدالرحمن چغتائی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ اسلم صاحب منفرد انداز میں ان سے بھی داد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ہوا یہ کہ نیشنل بک کونسل کے زیر اہتمام ایک رسالہ "کتاب" شائع ہوتا ہے۔ تب سید قاسم محمود مرحوم اس کے مدیر تھے۔ اب آگے کا دلچسپ واقعہ اسلم صاحب کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"یہ 1963ء کا واقعہ ہے، میں سید قاسم محمود کے ساتھ عبدالرحمن چغتائی کا انٹرویو کرنے گیا۔ انھوں نے خاصی باتیں کیں پھر میری طرف اشارہ کر کے بولے باقی ان سے پوچھیے گا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی کہ ایک بہت بڑے مصور نے مجھ کو وقار بخشا اور اپنا نائب بنا دیا۔

"بعد ازاں طے ہوا کہ انٹرویو کی مناسبت سے "کتاب" کا سرورق بنایا جائے۔ وہ میں نے چغتائی صاحب کے طرز مصوری پر بنایا۔ رسالہ شائع ہو کر چغتائی صاحب سمیت تمام ادبا و علما کے پاس چلا گیا۔ چند روز بعد قاسم صاحب کو عبدالرحمن چغتائی کا خط موصول ہوا۔ انھوں نے بڑی حیرت سے دریافت کیا تھا.... میں نے رسالہ "کتاب" کا سرورق بنا کر آپ کو کب دیا تھا؟ تب قاسم صاحب نے انھیں بتایا کہ آپ کو مصورانہ خراج عقیدت پیش کرنے کی خاطر اسلم کمال نے یہ سرورق بنایا ہے۔ اس آگاہی کے بعد ہی چغتائی صاحب نے کہا: اسلم کمال رنگ اور خط کا مبلغ ہے۔ اتنے بڑے مصور کی زبان سے اپنے لیے تعریفی اس جملے نے مجھے مبہوت و دنگ کر کے رکھ دیا۔"

اب اسلم صاحب کا زیادہ تر وقت مصورانہ خطاطی میں انوکھے تجربے کرتے گزرنے لگا۔ یوں خطاطی کے ایک نئے خط نے جنم لیا جو اب انہی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ "خطِ کمال" اسلامی خطاطی کے دو بنیادی خطوں خطِ کوفی اور خطِ نستعلیق کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ڈیزائن کی بنیاد پر اس خطِ کمال کی دلکشی اور افادیت سے مرعوب ہو کر ان پیج سافٹ ویئر میں اسے خط "سنجی بلیک" کا نام دیا گیا۔ جو ایک طرف اسلم کمال کے فن کا اعتراف بھی ہے اور ساتھ ہی اسلم کمال کے لئے ایک نیم قانونی واردات بھی ہے۔ یہ دراصل خطِ کمال ہی سے اخذ کردہ ہے۔

ایک زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فائن آرٹس کی سربراہ روسی نژاد مصورہ اینا مولکا احمد تھیں۔ وہ انارکلی مارکیٹ سے ہر ماہ رسالے یا کتاب خرید لاتیں جس کا سرورق اسلم کمال نے بنایا ہوتا۔ وہ پھر اپنے طلبہ و طالبات کو ان کی تخلیق دکھا کر کہتیں "میں آج تک اس مصور سے نہیں ملی۔ اس نے نیشنل کالج آف آرٹس اور نہ کالج آف آرٹ و ڈیزائن پنجاب یونیورسٹی سے تعلیم پائی ہے مگر یہ وہی کر کے دکھا رہا ہے جو ہم پڑھاتے ہیں۔"

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہی ہے کہ تعلیمی اداروں میں ایک خود پروردہ فنکار کی تخلیقات بطور مثال پیش ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ 1975ء سے اسلم صاحب نے اپنی تخلیق پر نام لکھنا چھوڑ دیا کیونکہ ان کی تصویر صاف پہچانی جاتی ہے۔ اسلم صاحب کا کہنا ہے:

"ہمیشہ میری سعی رہی ہے کہ کام ایسا کیا جائے جو تعریف کا مستحق ٹھہرے۔ ستائش ہی مجھے توانائی دیتی اور مزید کام پر اکساتی ہے۔ میرے نزدیک کامیاب آرٹسٹ وہ ہے جو اپنی پہچان خود کروائے۔ جو آنکھوں کو بھلا لگے اور با معنی بھی ہو۔"

ایک بار بون جرمنی میں اسلم صاحب کے مصورانہ خطاطی کے فن پاروں کی نمائش تھی۔ مشہور ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر شمل نے اس موقع پر کہا کہ اسلم کمال کی تخلیق ایک لاکھ تصویروں میں بھی گم نہیں ہوتی۔ جب برطانیہ میں نمائش ہوئی تو برٹش میوزیم میں اسلامی ورثے کے سابق نگران ممتاز نومسلم دانشور مارٹن لنگز (ابوبکر سراج الدین) نے برطانیہ کی برمنگھم یونیورسٹی میں اقبال اور فنونِ لطیفہ پر سیمینار میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا "پاکستانی مصور اسلم کمال اپنی طرز کا حیران کن مصور ہے۔"

اسلم صاحب نے مزید بتایا "میری کئی تصاویر میں عورتوں کے ہونٹ غائب ہیں۔ حقوقِ نسواں کی ایک تنظیم ہے اس کی خواتین رہنماؤں نے یہ تصویریں دیکھیں۔ تب مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ وہ اس بے ہونٹ عورت کو اپنی تنظیم کا نشان (لوگو) بنانا چاہتی ہیں۔" (بقیہ صفحہ 225)

لوڈشیڈنگ کے فائدے

سکے کا دوسرا رخ

ذرا چلبلے اور شرارتی انداز میں

افتخار حسین

بجلی اور انسان کا چولی دامن جیسا ساتھ ہے۔ بجلی کے فوائد سے آج بچہ بچہ واقف ہے۔ مثلاً یہ مشینیں چلاتی، گھر روشن کرتی، ٹیوب ویل چلاتی اور عوام سے آنکھ مچولی بھی کھیلتی ہے۔ یوں عوام کی تفریح کا بھی خیال رکھتی ہے۔

لیکن آج ہم آپ کو بجلی کی لوڈشیڈنگ کے کچھ فوائد سے بھی آگاہ کریں گے۔ سب سے پہلا فائدہ ان بے روزگار نوجوانوں کو ہوتا ہے جو ہاتھ میں ڈگریاں لیے نوکری ڈھونڈنے مارے مارے پھرتے ہیں اور جب ملازمت نہ ملے تو چور اُچکے یا ڈاکو بن جاتے ہیں۔ وہ شدت سے لوڈشیڈنگ کا انتظار کرتے ہیں۔ جیسے ہی بجلی جائے، وہ اپنے "ٹارگٹ" پر پہنچتے اور مطلوبہ مال حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یوں وہ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ کارِ خیر لوڈشیڈنگ کے باعث ہی ممکن ہو سکا۔

دوسرا فائدہ سرکاری ملازمین کو ہوتا ہے، جن کا اپنی کرسی پہ دل ہی نہیں لگتا اور وہ اپنے دفتر سے باہر رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ نے انھیں خوبخود سہولت مہیا کر دی۔ جتنی دیر بجلی نہیں ہوتی، وہ افسر کی ڈانٹ کے خوف کے بغیر دفتر سے باہر یا کینٹین میں گپیں ہانکنے اور ملکی سیاست کی مٹی پلید کرتے ہیں۔ چونکہ دفتر کے آٹھ گھنٹوں میں چھے گھنٹے بجلی نہیں ہوتی، لہٰذا یوں سرکاری ملازم تھکا ہارا ہونے کے بجائے شام کو تروتازہ ڈیوٹی سے واپس آتا ہے۔ بعض ملازمین تو یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں "ڈیوٹی کا مزہ تو اب آ رہا ہے۔"

لوڈشیڈنگ کا تیسرا فائدہ ملکی معیشت کو پہنچا ہے۔ کون کہتا ہے کہ لوڈشیڈنگ سے ملکی معیشت تباہ ہو رہی ہے! ملک میں سرمایہ کاری نہیں ہو رہی، تو کیا ہوا؟ ہم دوسرے ملکوں میں تو کر سکتے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق پچھلے برس چین سے 50 ہزار جنریٹر درآمد کیے گئے۔ اس کا ٹھیکہ ہمارے غریب ملک کی اسمبلی کے ایک غریب رکن نے حاصل کیا تھا۔ آج وہ غریب کروڑوں روپے میں کھیل رہا ہے تو کس کی وجہ سے؟ ظاہر ہے لوڈشیڈنگ کے باعث ہی وہ فرش سے عرش تک پہنچا۔

اس عظیم نعمت کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ اب خواتین گھر کے کام کاج میں پہلے کی نسبت زیادہ دلچسپی لینے لگی ہیں۔ پہلے وہ ہر وقت کیبل پر کھانے بنانے کی ترکیبیں دیکھتی اور سنتی رہتی تھیں۔ اب نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری! بجلی نہ ہو تو بیچاری کیا کریں؟ ظاہر ہے، گھریلو کام کاج ہی سے واسطہ پڑے گا۔

لوڈشیڈنگ کا پانچواں فائدہ یہ ہے کہ یہ انسانوں کی جانیں بچانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کیسے؟ وہ ایسا کہ آئے دن آپ اخبار میں پڑھتے ہیں کہ بجلی نہ ہونے سے روزانہ کئی آپریشن نہیں ہو سکے۔ اس طرح کئی لوگ ڈاکٹر کے ہاتھوں مرنے سے بچ جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے، لوڈشیڈنگ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے انسانیت پر۔ اب کم از کم لوگ طبعی موت تو مریں گے۔

طالب علموں کے لیے بھی لوڈشیڈنگ کسی نعمت سے کم نہیں۔ گھر والے ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ پڑھو پڑھو پڑھو! بجلی نہ ہو تو وہ کیسے کہیں گے! ظاہر ہے، بچے گرمیوں میں دن اور سردیوں میں رات کو بجلی کے بغیر کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ پھر ہر کام کا وقت مقرر ہونا چاہیے۔ ابھی اسکول سے پڑھ کر آ رہے ہیں، تو گھر میں بھی پڑھو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی! دوستوں سے گپ شپ لگانے، کرکٹ کھیلنے کے لیے بھی تو وقت ہونا چاہیے۔ لوڈشیڈنگ کا چھٹا فائدہ ہے جس سے طالب علم مستفید ہو رہے ہیں۔

ساتواں فائدہ کاروباری حضرات کو ملتا ہے، خاص طور پر انھیں جو موم بتیاں بناتے اور بیچتے ہیں۔ آج کل تو اخبار میں اشتہار آنے لگا ہے کہ موم بتیاں بنانے والا کارخانہ صرف 5 ہزار روپے میں برائے فروخت ہے۔ یہ سب لوڈشیڈنگ کا کمال ہے کہ حقیر سی رقم میں آدمی کارخانے کا مالک بن جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود ہی مالک اور مزدور بن کر لاکھوں نہ سہی ہزاروں روپے تو کما سکتا ہے۔

آٹھویں فائدے کا حق دار واپڈا کے سوا بھلا اور

کون ہو سکتا ہے؟ آئے دن لوگ سڑکوں پر نکلتے اور واپڈا کے دفاتر میں توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ بعدازاں واپڈا حکام ہزاروں کا نقصان لاکھوں روپے میں دکھا کر اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ اگرچہ یہ سعادت صرف واپڈا کے افسروں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ لائن مین وغیرہ تو چھوٹی موٹی ہیرا پھیری کر کے ہی اپنا نام شہیدوں میں لکھوا دیتے ہیں۔

لوڈشیڈنگ کا آخری بیسواں فائدہ کلو پہلوان کو پہنچتا ہے۔ یہ وہی کلو پہلوان ہے جو میونسپلی اسکول کے باہر برف کے گولے بنا بنا کر بیچتا ہے۔ اسکول کے ساتھ ہی کون آئس کریم کی دکان بھی ہے۔ آدھی چھٹی کے وقت بچے کھانے کو کون آئس کریم جاتے ہیں مگر بجلی نہ ہونے کے کارن کلو پہلوان کی دکانداری چمکنے لگتی ہیں۔ وہ یوں کہ بجلی نہ ہو گی تو کون آئس کریم کیسے بنے گی؟ بن بھی گئی تو مشین میں سے نکلے گی کیسے؟ کون آئس کریم والا کلو کو دیکھ دیکھ کر دانت پیستا اور کلو پہلوان معصوم بچوں کے گلے خراب کرنے میں مصروف رہتا ہے۔

پچھلے دنوں ہماری کلو سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے پوچھا ''میاں کیا کما لیتے ہو؟''

وہ خوشی سے بولا کہ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے پانچ سات سو روپے بن جاتے ہیں۔''

آپ نے لوڈشیڈنگ کے فائدے ملاحظہ فرمائے! عوام خواہ مخواہ حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں کہ لوڈشیڈنگ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے تو حکومت لوڈشیڈنگ ہمارے فائدے کے لیے ہی تو کرتی ہے۔

◆◆◆

بیوہ کی زمین

ایک دفعہ ہسپانیہ کے نامور حکمران خلیفہ الحکم بن خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے اپنے لیے نیا محل بنوانے کا حکم دیا۔

اتفاق سے محل کے لیے جو زمین پسند کی گئی اس میں ایک غریب بیوہ کا جھونپڑا آتا تھا۔ بیوہ سے کہا گیا کہ وہ یہ زمین بھاری قیمت لے کر فروخت کر دے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ مگر خلیفہ کے درباریوں نے زبردستی زمین پر قبضہ کرنے کے بعد محل بنا دیا۔ بیوہ قاضی کے پاس چلی گئی اور خلیفہ کی شکایت کی۔ قاضی نے اُسے تسلی دی اور کہا ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔

خلیفہ پہلی بار محل دیکھنے آیا تو قاضی بھی ایک گدھا اور خالی بوری لیے وہاں پہنچ گیا۔ خلیفہ نے قاضی سے گدھا اور بوری لانے کی وجہ پوچھی تو اس نے عرض کیا ''عالی جاہ! میں آپ کے محل سے کچھ مٹی لینا چاہتا ہوں۔'' خلیفہ نے مٹی لینے کی اجازت دے دی۔

قاضی نے جلدی سے بوری میں مٹی بھر کر خلیفہ سے کہا۔ ''مہربانی فرما کر اسے اٹھوانے میں میری مدد فرمائیے۔ چناں چہ جب خلیفہ نے بوری اٹھانے کی کوشش کی تو کامیاب نہ ہو سکا۔

قاضی نے آگے بڑھ کر کہا ''اے خلیفہ آج آپ مٹی سے بھری بوری نہیں اٹھا سکے۔ قیامت کے دن اس بیوہ کی زمین کا بوجھ کس طرح اٹھا پائیں گے؟''

خلیفہ قاضی کی بات سن کر بہت متاثر ہوا اور اپنا شاندار محل مع سامان بیوہ کو دے دیا۔

(عامر شہزاد، شاہ جیونہ)

ہر دن...... نیا دن

چادر سے باہر پاؤں پھیلانے ایک متوسط گھرانے کی کتھا،
حق و انصاف پر مبنی سوچ نے انہیں سیدھی راہ دکھا دی

ام ایمان

یہ دنیا عجائبات سے بھری پڑی ہے۔ بلکہ ہر دن نئے اور عجیب طریقے سے طلوع ہوتا ہے... اس دن کتنے عجائبات نے ظہور پذیر ہونے ہیں، انسان کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہر صبح نئے انداز سے سانس لیتی اور ہر دن نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

میں جس گھر میں رہتی ہوں، اس کا حال بھی ہوتا ماضی سے مختلف رہتا ہے۔ شاکلہ کی بات تھی کہ میں اس گھر میں بہو بن کر آئی۔ بہو بھی اکلوتی اور لاڈلی! دو نندیں شادی شدہ تھیں۔ ایک بوڑھی ساس جن کی سانسیں اپنے پوتے پوتی کے لیے اٹکی ہوئی تھیں۔ ادھر میرا بیٹا پیدا ہوا، ادھر ان کی بیماری اس قدر بڑھی کہ جان لے کر ہی گئی۔

گھر میں سناٹا سا چھا گیا۔ دل اداس رہتا۔ امی جان سے گھر میں کس قدر رونق تھی، ان کے بعد اس بات کا احساس ہوا۔ سلمان بھی ماں کی جدائی سے انتہائی افسردہ ہوئے۔ امی جان کا انتقال ہوا تو غفران

تھے مہینے کا تھا۔ اس کا نام بھی انھوں نے ہی رکھا تھا۔ غفران نانی تھا جس کی وجہ سے سلمان جلد سنبھل گئے۔ وہ ڈیڑھ سال کا ہوا تو طوبیٰ آ گئی۔ پھر سارہ اور نعمان..... بچوں کی آمد سے زندگی انہی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ میرے لیے یہ چلن نیا تو نہیں تھا۔

صبح ہوتی اور شام ہو جاتی۔ ہفتے گزرے اور مہینے برسوں میں بدل گئے۔ بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کا وقت آ گیا۔ سلمان کا شروع سے ارادہ تھا کہ بچوں کو اچھے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرایا جائے جہاں میٹرک نہیں اولیول میں وہ تعلیم پائیں۔ کہتے "شانی اچھے سے ارمان ہے کہ میرے بچے اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کریں۔ تمھیں تو پتا ہے نا کہ آج کل نوکری کی بنیاد یہی ہے۔ ورنہ لڑکے میری طرح قابل ہوتے ہوئے بھی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔"

نام تو میرا شاہانہ تھا لیکن سلمان جب شانی کہتے تو ان کا کہنا بہت اچھا لگتا۔ سلمان کے کہنے سے بچے بھی شانی کہنے لگے۔ بڑی مشکل سے انھیں آمادہ کیا کہ "امی" کہو۔ مجھے "ممی" کہلانا بالکل پسند نہیں تھا۔ "امی" میں جو چاہت پوشیدہ ہے وہ ممی میں کہاں؟

سلمان کی آرزو اور ارمان کے مطابق ہم نے بچوں کو باری باری انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرا دیا۔ ہر چیز میں کنجوسی کر کے ہم نے بچوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سلمان کی دونوں بہنیں باہر تھیں۔ فون پر بات چیت ہوتی رہتی۔ وہ تین چار برس بعد ایک دفعہ چکر لگا لیتی تھیں۔ بڑی والی صبیحہ باجی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ چھوٹی صباحت کی تین بیٹیاں ..... جب بھی آتیں کراچی میں امن و امان کی ناگفتہ بہ حالت کے باعث گھبرائی گھبرائی رہتیں۔ ہفتے بعد ذرا دل ٹھہرتا ..... اور پھر بازار کے چکر لگتے لگتے..... ربڑ کی چپل سے لے کر چادریں لینے تک گھر کی پوری خریداری کی جاتی۔ ظاہر ہے باہر تو ہر چیز مہنگی ہے۔

"یہ تو لیہ دیکھو وہاں اس قیمت میں ایک ملتا ہے اور یہاں چار آ گئے۔"

باجی صبیحہ کو سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ سارے کام خود کرنے پڑتے۔ وہاں ماسی رکھنا آسان نہیں۔ کہتی تھیں "شاہانہ تم تو واقعی شاہانہ انداز میں بس حکم چلاتی رہتی ہو..... ماسی برتن دھولو..... ماسی غسل خانے صاف کر لو..... ہمیں دیکھو ہر کام خود کرنا پڑتا ہے۔"

میں ان کی بات پہ مسکرا کر رہ جاتی۔ اگر انھیں یہ زندگی شاہانہ لگتی ہے تو واپس کیوں نہیں آ جاتیں؟ ظاہر ہے وہاں کی آسائشات تو یہاں میسر نہیں ..... اور نہ پھر وہ اس طرح سوٹ کیس بھر بھر کے خریداری کر سکتی تھیں۔ خیر! وہ میرے میاں کی بہنیں تھیں۔ مجھے ان کی آمد اور بار بار آنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں حتی الامکان کوشش کرتی کہ ان کی مہمان داری میں کوئی کسر نہ رہے۔ لیکن ظاہر ہے ان کے اثرات ہمارے بجٹ پر پڑتے تھے۔ میں بعد میں دل ہی دل میں شکر کرتی کہ وہ لوگ ہر سال نہیں آتے۔

جاتے ہوئے دونوں بہنیں آبدیدہ ہوتیں اور سلمان سے کہتیں کہ وہ بھی باہر آ جائے۔ کئی دفعہ اس معاملے میں ہماری طویل گفتگو ہوئی تھی۔ لیکن آخر میں ہم دونوں میاں بیوی اس بات پر اتفاق کرتے کہ بچوں کو تربیت دینا بڑا کٹھن کام ہے۔ باہر کا ماحول جس قدر کھلا ہے صبیحہ باجی اور صباحت کے بچوں کو دیکھ کر اچھی طرح اندازہ ہوتا۔ لہٰذا ہم دونوں کی رائے اس بات

میں ایک حد کے باہر نہیں جاتا۔

البتہ تعلیمی اخراجات اب بہت بڑھ گئے تھے۔ اولیول کی فیس۔ پھر جب فائنل امتحان ہوں گے تو ہر بچے کی علیحدہ فیس دینا ہوگی۔ کل ملا کر اس بار ہمیں فیسوں کی مد میں ایک لاکھ روپے تک ادا کرنے تھے۔ میں بہت فکرمند تھی کہ اتنی بھاری رقم کی ادائی کیسے اور کیوں کر ہوگی؟ ابھی ایک مہینا باقی تھا۔ شاید سلمان کے ذہن میں کوئی حل ہو... لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ ان کے چہرے سے بھی فکرمندی جھلک رہی تھی۔

ہماری اس سلسلے میں باقاعدہ سوچ بچار اور مشورے کی نشست ہوئی تھی۔ اپنی اپنی جگہ ہم دونوں اس مسئلے کے باعث پریشان تھے۔ سوچوں میں گم تھا کہ شاید اس دفعہ فیس کے لیے مجھے اپنے کچھ زیور بیچنا ہی پڑے۔ اف! کتنی مشکل سے اب تک اس کی نوبت نہ آنے دی تھی... لیکن اب شاید یہی کرنا پڑے۔ ظاہر ہے ایک لاکھ روپے کی رقم معمولی تو نہیں... لیکن دوسری طرف بچوں کے مستقبل کا سوال تھا جسے روشن بنانے کا خواب سبھی والدین دیکھتے ہیں۔ آخر ہم نے خواب دیکھا اور اس کی تعبیر بھی چاہی تو کون سا انوکھا کام کیا؟

میں گویا اپنے آپ کو ہی سمجھاتی رہتی۔ آپ کو تو پتا ہے عورت کے لیے زیورات کتنی اہمیت رکھتے ہیں... لیکن بچے اور ان کا مستقبل تو ان سے بڑھ کر ہے۔ میں ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگی کہ زیور بیچنے کا وقت آ پہنچا۔ آج سلمان دفتر سے آٹھ بجے آ گئے تھے۔ ورنہ انھیں آتے آتے دس تو لازمی بج جاتے۔ میں نے سوچا کہ رات کھانے کے بعد ان سے اس مسئلے پر بات کی جائے۔

''نجیبہ باجی اور صباحت باجی آ رہی ہیں اگلے ہفتے...'' کھانے کے درمیان سلمان نے خبر سنائی۔

''اچھا... دونوں ساتھ آ رہی ہیں؟''

''ہاں ...دونوں ساتھ ہی آ رہی ہیں... ایک خاص مسئلے پر انھیں بات کرنی ہے۔''

''کون سا خاص مسئلہ؟'' میں نے سلمان کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا ''فون پر بھی بات ہو سکتی تھی... رقم خرچ کر کے آنا ضروری ہے؟''

''ان دونوں کا کہنا ہے کہ انھیں رقم کی ضرورت ہے... کاروبار میں نقصان ہو گیا ہے... اور ملازمت بھی چھوٹ گئی۔ دراصل انھیں اس گھر میں اپنا حصہ چاہیے۔''

''گھر میں حصہ؟''

''ہاں یہ گھر ہمارا تو نہیں نا! امی جان کی وراثت ہے۔ اب تک تو وہ لوگ باہر تھے لہٰذا اس مسئلے کو اٹھایا ہی نہیں۔'' سلمان نے آہستہ آہستہ بات واضح کی۔

میرا بڑھتا ہوا ہاتھ میز پر رک گیا۔ ہاتھ میں پکڑی روٹی پلیٹ میں [illegible] ہمارے حیرانی کے منہ کا نوالہ چبانا بھی [illegible] سا گیا۔

''یا اللہ اب کیا ہوگا؟ پہلے ہی آپ سے بچوں کی فیس کے معاملے پر بات کرنے کا سوچ رہی تھی، یہ ایک نیا ہی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔''

''اچھا اب زیادہ پریشان نہ ہو۔ اللہ بے اسباب کا اسباب ہے، وہ کوئی راستہ نکالے گا۔''

انھوں نے میرا فق ہوتا چہرہ دیکھ کر تسلی دی۔ ویسے وہ خود بھی بے حد پریشان لگ رہے تھے۔ اس رات نہ انھیں ٹھیک سے نیند آئی نہ مجھے۔ ہم دونوں ہی اس مسئلے پر فکرمند تھے۔

ایک دفعہ میری آنکھ لگی تو خواب میں بھی پریشان تھی

دکھائی دی۔ سلمان نماز فجر کے لیے اٹھے اور بچوں کو اٹھا کر بستر پر لیٹے تو پھر سو گئے۔ میں نے بھی انھیں نہیں اٹھایا۔ اگلے دن ہفتہ تھا۔ بچوں کی تو چھٹی تھی۔ آج انھیں بھی دفتر نہیں جانا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ناشتے کی تیاری کر کے بچوں کو ناشتا کرایا اور شور نہ کرنے کی ہدایت کی۔ گیارہ بجے سلمان اٹھ گئے۔ خوب تازہ دم تھے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا... پریشانیوں کا حل نکالنے والا تو اللہ ہی ہے۔ پھر بلاوجہ پریشان ہو کر کیوں چھٹی خراب کی جائے؟ سلمان کا یہی فلسفہ تھا جسے میں نے بھی دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

''ثنائی! میں نے سوچ لیا ہے مسئلے کا حل...'' سلمان ناشتے کے درمیان بولے۔

''اچھا! کیا سوچا ہے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ہم دونوں بہنوں کو گھر فروخت کر کے ان کا حق دیں گے پھر اپنے پیسوں سے کوئی چھوٹا گھر یا فلیٹ لیں گے۔ باقی رہا فیسوں کا مسئلہ تو اس کا بھی بہت آسان حل ہے۔ اب تک بچوں کی فیسیں ہم نے تنگی ترشی سہہ کر ادا کی ہیں۔ یہی سوچ کر کہ اچھی تعلیم اچھے مستقبل کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اچھا مستقبل کیا ہوتا ہے؟ اس بارے میں کبھی سوچا ہے؟''

''اچھا مستقبل اچھی تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔ اپنی روایات، اخلاق اور تہذیبی قدروں سے... نصاب اگر غیروں کا ہو تو روایات، رسوم اور تہذیب بھی انہی کی رچتی بستی ہے۔ ہم اپنے بچوں کو اپنی چادر کے اندر رہ کر بھی اچھی تعلیم دلا سکتے ہیں۔ البتہ ایک کام اہم ہے... ہم دونوں کو ان کی تعلیم اور تربیت کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی اور محنت کرنا ہوگی... بھرپور توجہ کے ساتھ۔''

سلمان کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ حوصلہ دے رہی تھی کہ مسائل کے حل پر انھیں پکا یقین ہے۔

اگلے مہینے صبیحہ باجی اور صباحت آ گئیں۔ چونکہ اسکول تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا لہٰذا فیسوں کی مد میں خاصی رقم بچ گئی۔ یوں مہمان داری اچھے انداز میں ہوئی۔ سلمان نے ایک دن دونوں بہنوں کو بٹھا کر وراثت کا مسئلہ حل کرنے کا طریقہ سمجھا دیا۔

لیکن دونوں مسئلے کے اس حل سے مطمئن نہیں تھیں، وہ خاموش اور اداس نظر آئیں۔ بہرحال انھوں نے سلمان کی بات غور سے سنی اور اگلے دو تین دن میں سوچ کر جواب دینے کا کہا۔

''بھلا اور کیا حل نکل سکتا ہے؟'' ''وہ سوچ کر کیا جواب دیں گی؟'' میں نے بعد میں سلمان سے حیران ہو کر پوچھا۔ سلمان نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

بہنوں نے کہا تو دو تین دن تھا لیکن اگلے دن ہی صبیحہ باجی نے گھر بیچنے کا خیال مسترد کر دیا۔ کہنے لگیں: ''بھائی! ہمارا مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل ہو ہی جائے گا۔ لیکن یہ گھر اور اس سے جڑی امی جان اور ابا جان کی خوشبو اور یادیں ہم کسی طرح دوبارہ حاصل نہیں کر سکتے... آپ اور ثنائی ہمارے لیے ہمارا میکہ ہیں اور یہ گھر ہماری یادوں کا امین...''

صبیحہ باجی اور صباحت ایک ماہ رہ کر امریکا چلی گئیں... وہ اس بات پر خوش تھیں کہ سلمان ان کا حق اتنی آسانی سے دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔

سلمان کا کہنا ہے ''حق تو دینا ہے۔'' لہٰذا اب اسکولوں کی بھاری فیسیں دینے کے بجائے سلمان چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کے لیے رقم جمع کر رہے ہیں۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حق داروں کو ادائی کے لیے جمع کرنا مقصود ہے۔ سچ ہے، کائنات کا ہر دن پچھلے روز سے مختلف ہوتا ہے۔

◆◆◆

دنیا میں سونا کتنا ہے؟

کروڑوں مرد و زن کو اپنا دیوانہ بنا دینے والے قیمتی معدن کے دلچسپ راز

شمس الدین

آپ ذرا خود کو ایسا زبردست ولن تصور کیجیے جو دنیا میں موجود تمام سونے پر قابض ہو جاتا ہے۔ پھر آپ طے کرتے ہیں کہ اس سونے کو مکعب (Cube) کی شکل دی جائے۔ کیا کئی سو کلومیٹر موٹی اور لمبی؟ جی نہیں! آپ نے غلط اندازہ لگایا۔ ماہرین کا کہنا ہے دنیا بھر کے سونے کو مکعب کی شکل دی جائے تو وہ باآسانی ایک گھر میں سما جائے گا۔

درج ذیل حقائق دلچسپ انکشاف کرتے ہیں۔

دنیا میں ہر سال تقریباً ایک کروڑ ٹرائے اونس سونا کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ (ایک ٹرائے اونس برابر 31.103 گرام یا 172.4881 ...) سونے کی کثافت اضافی (Specific gravity) 19.3 ہے۔ یعنی وہ پانی سے 19.3 گنا زیادہ وزن رکھتا ہے۔ گویا ایک لیٹر سونا 19.3 کلو وزنی ہوتا ہے۔

ایک لیٹر مکعب (Cube) چاروں طرف سے 10 سینٹی میٹر (چار انچ) سائز رکھتا ہے۔ اور ایک کلو سونا 32.15 ٹرائے اونس پر مشتمل ہوتا ہے۔ گویا دنیا میں ہر سال اتنا سونا نکلتا ہے جس کا مکعب چودہ فٹ لمبا چوڑا ہو گا۔ گویا کانوں سے نکلنے والا سالانہ سونا ایک عام کمرے میں باآسانی سما سکتا ہے۔

درج بالا مکعب کا وزن 1,555,210 کلو ہو گا۔ یہ سطریں قلم بند ہوتے وقت عالمی مارکیٹ میں سونے کی فی کلو قیمت 41,531 ڈالر تھی۔ گویا ہر سال کانوں سے تقریباً 69 ارب 255 کروڑ ڈالر کا سونا نکالا جاتا ہے۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم (61) کھرب 22.5 ارب روپے بنتی ہے۔ یہ رقم زیادہ ہے مگر اسے غیر معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً امریکا میں اس سال تعلیم کا بجٹ

17 کھرب روپے ہے جبکہ امریکی افواج کو 672 کھرب روپے دیے گئے۔ اسی طرح بھارت کا جنگی بجٹ 39 کھرب روپے جبکہ پاکستان کا ساڑھے چھے کھرب روپے رہا۔

کتنا سونا نکل چکا؟

تاہم یہ اندازہ لگانا کٹھن مرحلہ ہے کہ معلوم انسانی تاریخ میں کانوں سے کتنا سونا نکالا جا چکا۔ اس ضمن میں ماہرین مختلف اندازے لگاتے ہیں۔ مثلاً ایک ماہر نے یہ تخمینہ لگایا کہ پچھلے دو سو برس سے پانچ کروڑ اونس سالانہ سونا نکل رہا ہے۔

بظاہر یہ مقدار زیادہ لگتی ہے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ قدیم مصریوں اور جنوبی امریکا کے باشندوں نے بڑی مقدار میں کانوں سے سونا نکالا تھا۔ مثلاً صرف توتخ آمن کے مقبرے ہی سے 1.5 ٹن سونا ملا۔ لہٰذا درج بالا سونے کی مقدار مناسب لگتی ہے۔

اب پانچ کروڑ کو دو سو سے ضرب دیجیے۔ دس ارب سونے کا مکعب چاروں طرف سے تقریباً 2.5 میٹر (8.2 فٹ) لمبا چوڑا ہو گا۔ گویا یہ مکعب باکس کے 2.5 فیصد میدان میں با آسانی سما جائے گا۔

لیکن درج بالا مقدار سے بھی ماہرین اتفاق نہیں کرتے۔ بعض کا خیال ہے کہ پچھلے پانچ ہزار برس میں پچیس لاکھ ٹن سونا نکل چکا۔ (ایک ٹن برابر ایک ہزار کلو)۔ بعض ماہرین کے خیال میں یہ مقدار محض پونے دو لاکھ ٹن ہے۔ پچیس لاکھ ٹن کا طلائی مکعب 59 میٹر (66) فٹ لمبا چوڑا ہو گا۔ درج بالا تخمینہ برطانیہ کے ایک ادارے "گولڈ سٹینڈرڈ انسٹی ٹیوٹ" کا ہے۔ یہ ادارہ سونے کی ماہیت و خرید و فروخت پر تحقیق کرتا ہے۔ اس کے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ اگر دنیا بھر میں تجوریوں، الماریوں اور ڈبوں میں محفوظ سونا نکال لیا جائے تو اس کا وزن 12.5 لاکھ ٹن ہے گا۔ اگرچہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ محض اندازہ ہے۔

اچھی اور بری خبر

سب سے پہلے اچھی خبر! امریکی جیالوجیکل سروے کا اندازہ ہے کہ دنیا کی کانوں میں اب بھی 52 ہزار ٹن سونا محفوظ ہے اور حضرت انسان آنے والی صدیوں میں اسے بھی نکال لیں گے۔ یاد رہے فی الوقت سب سے زیادہ سونا چین میں نکلتا ہے۔ 2012ء میں وہاں سے 370 ٹن سونا نکالا گیا۔ اس کے بعد آسٹریلیا (250) امریکا (230) روس
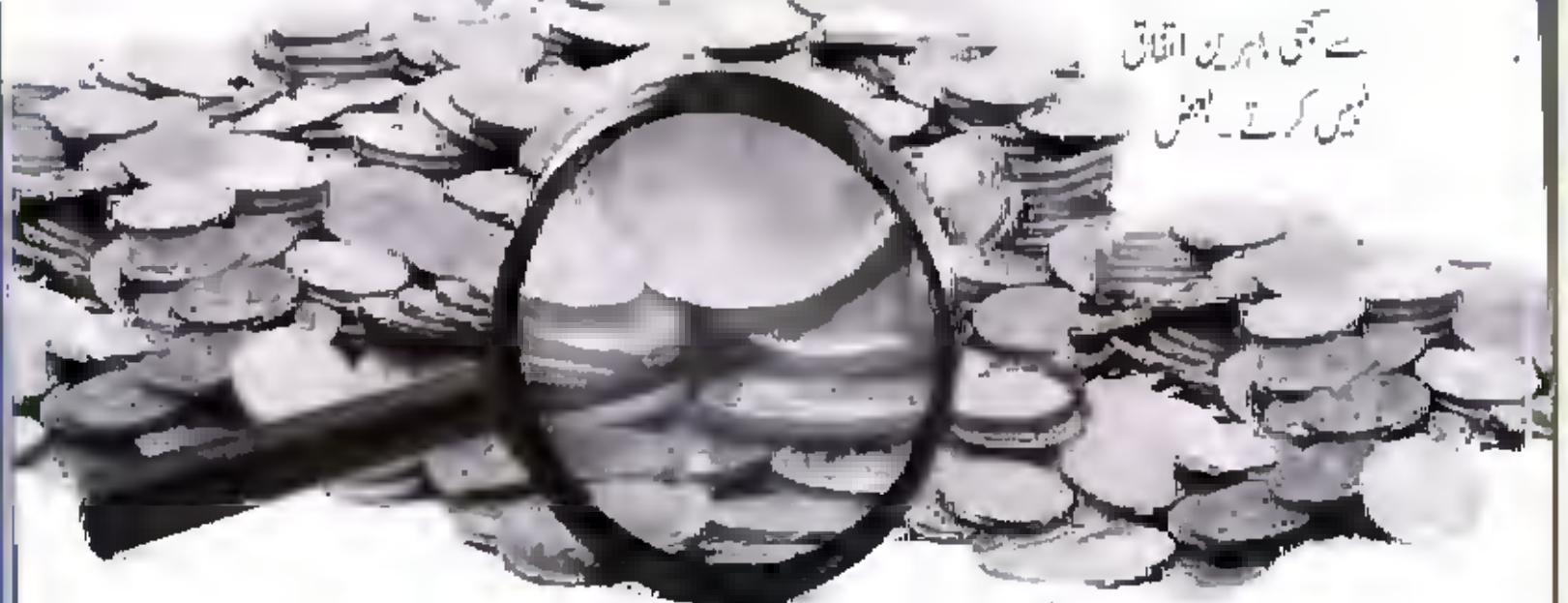
اونچا اور منفرد شاٹ

یہ کرکٹ کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ آسٹریلیا کی ٹیم کے ایک کھلاڑی جارج بانرز کا قد 6فٹ 6انچ اور وزن قریباً 102 کلوگرام تھا۔ اسے عموماً آسٹریلوی ہرکولیس کہا جاتا تھا۔ جارج بانرز زوردار ہٹیں لگانے کا ماہر تھا۔ اس نے آسٹریلوی ٹیم کے ساتھ انگلینڈ کے پانچ دورے کیے اور کل سترہ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ 1880ء میں جب سرزمین انگلینڈ پہ پہلا ٹیسٹ اوول کے میدان میں کھیلا گیا تو جارج نے ایک اونچی ہٹ لگائی۔ ایسی اونچی کہ گیند کے نیچے آنے تک وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ دو رنز مکمل کر چکا تھا۔ تیسرے رن کے لیے مڑا ہی تھا کہ کیچ آؤٹ ہو گیا۔ اپنی ٹیم کے لیے پہلی اننگز میں صرف دو رن ہی بنا سکا۔ بہرحال یہ ٹیسٹ کرکٹ کی منفرد شاٹ تھی کہ جس کے نیچے آتے آتے دو رنز بن گئے۔

(مراسلہ: سعید نذیر، لاہور)

(205)، جنوبی افریقا (170)، پیرو (165)، کینیڈا (102) اور انڈونیشیا (95) کا نمبر آتا ہے۔ پچھلے سال کل 2700 ٹن سونا نکالا گیا تھا۔

اہم خبر یہ ہے کہ سونے کا استعمال اب انقلابی تبدیلی سے گزرنے لگا ہے۔ پچاس ساٹھ برس قبل تک جتنا بھی سونا نکلتا تھا، وہ کسی نہ کسی شکل میں قابل استعمال رہتا تھا۔ لیکن اب لاکھوں الیکٹرونکس اشیا میں سونے کے ذرات استعمال ہو رہے ہیں۔ چونکہ ان ذروں کو دوبارہ حاصل کرنا بڑا مہنگا عمل ہے۔ لہٰذا ماہرین کو خدشہ ہے کہ یہ طلائی ذرات مٹی کچرے میں مل کر ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائیں گے۔

گویا تاریخ انسانی میں پہلی بار سونا اب واقعی "استعمال" ہونے لگا ہے۔ واضح رہے دنیا میں سب سے زیادہ سونا ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں درآمد کیا جاتا ہے۔ پچھلے سال بھارتیوں نے "860" ٹن سونا درآمد کیا تھا اور اس سال مارچ تک وہ 500 ٹن منگوا چکے ہیں۔ بھارتی حکومت بھارتیوں کی سونے سے محبت پر خاصی پریشان ہے کیونکہ اسے قیمتی زرمبادلہ خرچ کر کے سونا منگوانا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس سال بھارتی حکومت نے سونے کی درآمد پر لگا ٹیکس 6 فیصد سے بڑھا کر 8 فیصد کر دیا ہے تاکہ بھارتیوں کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

سونے سے بھی مہنگا معدن

جی ہاں پلاٹینم سونے سے زیادہ مہنگا معدن ہے۔ عالمی منڈی میں ایک کلو پلاٹینم کی قیمت 48113 ڈالر (48 لاکھ روپے سے زیادہ) ہے۔ اس کی کثافت اضافی 21.45 ہے۔ یعنی یہ معدن پانی سے 21.45 گنا زیادہ وزنی ہے۔

پلاٹینم بیسویں صدی میں نکلنا شروع ہوا۔ ہر سال کانوں سے قریباً 136 کروڑ اونس پلاٹینم نکالا جا رہا ہے۔ اب تک نکلا ہوا سارا معدن 6.3 میٹر (قریباً 20 فٹ) مکعب میں آ جائے گا۔ یعنی اب بھی صرف ایک کمرے میں سما جائے گا۔ واضح رہے پلاٹینم کی کانیں روس، امریکا، جنوبی افریقا، کینیڈا اور کولمبیا میں واقع ہیں۔ ◆◆◆

جرم و سزا

مکافاتِ عمل کی سنسنی خیز کتھا

عامر احمد خان

میں نے کمبل اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا مگر سردی تھی کہ ہڈیوں میں اترتی چلی گئی۔

"نواز! انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال دو، سردی لگ رہی ہے۔" میں نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

"ابھی ڈال دیتا ہوں جی۔" چند ہی لمحوں میں نواز سوکھی لکڑیاں اٹھائے کمرے میں آ گیا۔ "ڈاکٹر صاحب باہر برف باری شروع ہو چکی۔" اس نے لکڑیوں کو آگ لگاتے ہوئے بتایا۔

"اچھا نواز! تمہیں یہاں آئے پورے سات ماہ ہو چکے۔ پچھلے دو ماہ سے یہاں سردی ہے۔ خوب برف باری بھی ہو رہی ہے مگر تم آج بھی برف پڑنے پر یوں پرجوش ہو جاتے ہو جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بس ڈاکٹر صاحب ہم ٹھہرے صحرائے تھر کے باسی۔ بس سال صحرا میں گزارے۔ تاحدِ نگاہ ریت کے ٹیلے، آگ برساتا آسمان اور پیاسی ریتلی زمین۔ اتنی جلد بھلا کیسے عادی ہو جائیں اس الف لیلوی جگہ کے!" نواز نے اٹھتے ہوئے کہا "پر ڈاکٹر صاحب ایک بات ضرور ہے۔ ہم تو ٹھہرے پردیسی آدمی لیکن آپ تو یہیں پیدا ہوئے اور ملازمت بھی یہیں قریبی قصبے میں کرتے ہیں۔ یہ موسم آپ کے لیے تو اجنبی نہیں۔ مگر میں نے اکثر دیکھا ہے ایسے برفیلے موسم میں

آپ کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ آپ کے کمرے کی بتی بھی جلتی رہتی ہے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ واقعہ ہی کچھ ایسا تھا کہ کئی سال گزرنے کے باوجود میرے ذہن میں تازہ ہے۔ جب بھی اس طرح کا موسم آئے میری آنکھوں کے سامنے وہ تمام واقعات گھومنے لگتے ہیں۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں وہ واقعہ سننا چاہوں گا۔" نواز نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے آج ان یادوں کے سفر پر تنہا میں نہیں، بلکہ ہم دونوں چلتے ہیں۔" میں نے آتش دان پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب قصبے کے اسپتال میں بطور نیورو سرجن مجھے تعینات ہوئے تھوڑی ہی مدت ہوا تھا۔ سردیوں کی ایسی ہی ایک برفیلی اور تاریک رات میں فون کی گھنٹی مجھے خوابوں کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف لائن پر ڈاکٹر رمیض تھے۔ میرے چونگا (ریسیور) اٹھاتے ہی وہ تیزی سے بولے:

"ڈاکٹر شیراز! معاف کیجیے میں نے آپ کو اتنی رات گئے بے آرام کیا مگر کیا کروں ایک ہنگامی صورت حال آ پڑی ہے۔ یہاں نزدیک ہی دھند کے باعث ایک بس کو حادثہ پیش آیا ہے۔ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا اور نہ مسافروں کو گہری چوٹیں آئی ہیں مگر بس کے ڈرائیور کا خاصا خون بہہ چکا ہے۔ آپریشن کے لیے میں نے سرجن زاہد کو فون کر دیا ہے۔ ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھے ایک بچے کو بھی سر پر خاصی گہری چوٹ آئی ہے۔ بلکہ شیشے کے کچھ ٹکڑے بھی اس کے سر میں پیوست ہو چکے ہیں۔ میں نے ڈریسنگ تو کر دی ہے مگر خون رکنے میں نہیں آ رہا۔ اس کے دماغ کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ یہاں قصبے میں آپ ایک ہی نیورو سرجن ہیں۔ لہٰذا فوراً اسپتال آ جائیے۔ دیر مت کیجیے لڑکے کی حالت بے حد نازک ہے۔"

فون سنتے ہی میں نے کوٹ پہنا، مفلر کانوں پر لپیٹا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر کی طرف لپکا تو سامنے ابو اور امی کھڑے نظر آئے۔ "اس وقت اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہو اور ابھی کس کا فون آیا تھا؟" ابو نے سوال کیا۔

"اسپتال میں ایک کیس آیا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے کہ تم سرجن ہو۔ لوگوں کا علاج کرتے ہو۔ ہم نے اسی لیے تمھیں ڈاکٹر بنایا۔ مگر تم جانتے ہو کہ کئی گھنٹے سے بارش ہو رہی ہے۔ شام کو برف باری بھی ہوئی۔ پہاڑی علاقے کی سڑکیں ویسے ہی خطرناک ہوتی ہیں اور برف سے سڑکوں پر پھسلن بھی ہو گی اور دھند بھی چھائی ہے۔ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ صبح چلے جانا۔" امی نے فکرمندی سے کہا۔

"امی! ایک بس کو شدید حادثہ پیش آیا ہے۔ ایک بچے کے سر پر گہرے گھاؤ لگے ہیں۔ اوپر سے سر میں شیشے کے ٹکڑے بھی پیوست ہو گئے۔ اس کا جلد از جلد آپریشن کرنا پڑے گا۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر فوراً روانہ ہو جاؤ مگر گاڑی احتیاط سے چلانا۔ خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔" امی نے کہا۔

رات کا وقت تھا۔ میں نے ڈرائیور کو تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اکیلا اسپتال روانہ ہو گیا۔ گھر سے اسپتال تقریباً پینتالیس میل دور تھا۔ ہفتے کے پانچ دن میں سرکاری اسپتال کی طرف سے دیے گئے گھر میں رہتا تھا۔ دو دن چھٹی کر کے اپنے گھر واپس آ جاتا۔ جمعہ کی شب تھی۔ ان دنوں جمعہ کی چھٹی ہوا کرتی تھی۔ سڑک پر خاصی برف پڑ چکی تھی۔ اس لیے بامر مجبوری میں گاڑی ہلکی رفتار سے چلا رہا تھا۔ میرے دل میں رہ رہ کر بچے کا خیال آ رہا تھا جو شدید زخمی حالت میں تھا اور اس کی نبض پل پل ڈوب رہی تھی۔ ابھی میں شہر سے تیس میل پیچھے تھا کہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے مجھے سڑک پر ایک پتھر گرا ہوا دکھائی دیا جو شاید کسی پہاڑ سے لڑھک کر گرا تھا۔

میرے منہ سے بے اختیار ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ میں گاڑی روک کر نیچے اترا۔ دور سے دھند کے باعث مجھے صحیح طرح سے اندازہ نہیں ہوا تھا مگر قریب آ کر معلوم ہوا کہ یہ کوئی زیادہ بڑا پتھر نہیں۔ میں کوشش کر کے اسے سڑک سے ہٹا سکتا تھا۔ میں نے زور لگا کر پتھر ایک طرف کر دیا۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھولا اور ابھی میں اندر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ پستول کی ٹھنڈی نال میری گردن سے آ لگی۔ "کوئی چالاکی مت کرنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔" ایک مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"کک...... کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟"

اس اچانک پڑنے والی افتاد پر میں بوکھلا گیا۔ "دیکھو اگر تم کوئی رہزن ہو تو میری جیبوں سے روپے نکال لو اور مجھے جانے دو۔ میں ڈاکٹر ہوں اور ایک مریض کی جان بچانے جا رہا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

ہے کوئی جواب؟

نیکسویل کی ننھی بیٹی میلنڈا کو کہیں سے کہانیوں کی کتاب مل گئی۔ اس نے بہت شوق سے کتاب اپنے باپ کو پکڑا کر فرمائش کی "ابو! مجھے یہ پڑھ کر سنائیں۔"

نیکسویل نے دو تین دن تو کتاب سے کہانی پڑھ کر سنائی پھر اسے یہ کام غیر دلچسپ لگا۔ اس نے کہانیاں ریکارڈ کر لیں۔ جب میلنڈا کہانی کی فرمائش کرتی، وہ ٹیپ چلا دیتا۔ دو تین دن تو میلنڈا نے برداشت کیا لیکن ایک دن پھر اس نے کتاب لا کر باپ کے ہاتھ میں پکڑائی اور کہا: "ابو! کہانی!"

وہ بولا "مگر بیٹا! اب تو تمھیں خود بھی ٹیپ ریکارڈر چلانا آ گیا ہے۔"

میلنڈا تیزی سے بولی "جی میں ٹیپ ریکارڈر چلا سکتی ہوں مگر اس کی گود میں تو نہیں بیٹھ سکتی۔"

"او چلا یار! یہ بکواس بند کرو۔" مجھے لگتا ہے تمھاری زبان خاصی [illegible] ہے۔ چلو سڑک سے ایک طرف ہو جاؤ۔" اس نے حکمرانہ انداز میں کہا۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے مجھے باندھ دیا۔ تب میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ تیس سال سے اوپر کا چوڑا چکلا آدمی تھا۔

میں نے دوبارہ التجا کی کہ وہ مجھے جانے دے مگر اس نے بری طرح سے جھڑک دیا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا "تمھیں باندھنا بہت ضروری ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح تم پولیس تک پہنچ جاؤ۔ صبح تک یہ کار اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکی ہوگی۔ اگر رات کو مزید

برف باری نہ ہوئی اور تم برف میں دبنے سے بچ گئے تو
کوئی نہ کوئی تمھیں کھول دے گا۔" یہ کہہ کر اس نے کار
اسٹارٹ کر دی۔ میں دور تک سڑک پہ جاتی اپنی گاڑی
کی بتیاں دیکھتا رہا اور پھر وہ مدھم ہو گئیں۔ "اوہ وہ تو
اڈوں کی گاڑیاں چھینتا ہے!" میں نے سوچا۔

موسم انتہائی سرد تھا اور درجہ حرارت صفر سے بھی
نیچے۔ مجھے اپنے جسم کا رواں رواں سن ہوتا محسوس ہوا۔
اگر وہ گاڑی چور جاتے جاتے مجھے باندھ کر نہ جاتا تو
میں پیدل بھی اسپتال تک جا سکتا تھا۔ یوں شاید میں
بچے کی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں نے
انگلیوں سے ٹٹول کر رسی کی گرہ تلاش کی اور اسے
کھولنے کی سعی کرنے لگا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی کیونکہ
ایک تو گرہ بہت سخت تھی دوسرے رسی سے میرے
ہاتھ اتنی بری طرح جکڑے ہوئے تھے کہ میں اپنے
ہاتھوں کو زیادہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ ایسے میں
سردی کے باعث مجھے اپنا لہو رگوں میں منجمد ہوتا محسوس
ہو رہا تھا۔ پھر مزید ستم یہ ہوا کہ برف باری شروع ہو
گئی۔ اس وقت تو "مرے پر سو دُرے" والی مثال
مجھے خود پر صادق ہوتی محسوس ہوئی۔

اگر میں رسیوں کی قید سے خود کو آزاد نہ کر پاتا تو
برف میں دب جاتا یا سردی کی وجہ سے چل بستا۔ میں
نے تیزی سے سوچنا شروع کیا کہ اس صورت حال میں
کیا کروں؟ پھر میرے دماغ میں امید کی کرن لہرائی اور
میں نے کونے میں رکھی ایک نوکیلی چٹان کی طرف گھسٹنا
شروع کر دیا۔ یہ بڑا مشکل کام تھا کیونکہ میرے نیچے نرم
برف کی چادر تھی۔ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو
دباؤ بڑھنے سے برف نیچے کو دب جاتی۔ وہ نوکیلی چٹان
مجھ سے بمشکل تین فٹ کے فاصلے پر تھی مگر مجھے اس تک
پہنچنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔

چٹان کے قریب پہنچ کر میں اس کی طرف پشت
کر کے بیٹھا۔ پھر اندازے سے بندھے ہاتھ چٹان پہ
رکھے اور رسی کو رگڑنا شروع کر دیا۔ اس کوشش میں
میری کلائیاں اور ہاتھ زخمی ہو گئے مگر رسی تھی کہ کٹ
کر نہ دی۔ ایک موقع پر جب میں مایوسی اور درد کی
وجہ سے ہاتھ ہٹانے ہی والا تھا' مجھے رسی کٹتی محسوس
ہوئی۔ میں اور تیزی سے رگڑنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں
رسی ایک جگہ سے کٹ گئی۔ میں نے جلدی سے خود کو
آزاد کیا اور کلائی موڑ کر وقت دیکھا' رات کے
ساڑھے تین بج رہے تھے۔ قریباً سوا دو یا اڑھائی بجے
مجھے ڈاکٹر زینب کا فون آیا تھا۔

سردی سے میری حالت غیر تھی مگر میں جیسے تیسے
اٹھ کھڑا ہوا۔ اسپتال اب بھی تین میل کے فاصلے پر
تھا۔ پیدل یہ فاصلہ طے کرنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے
اور میں صبح ہی اسپتال پہنچ پاتا مگر اس کے سوا کوئی
چارہ نہ تھا لیکن ایک امکان ابھی بھی باقی تھا۔ بڑی
شاہراہ وہاں سے دو میل کے فاصلے پر تھی۔ شاید وہاں
مجھے کسی کار یا ٹرک میں لفٹ مل جاتی۔ میرے لیے تو
ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا اور کہاں دو میل۔ مگر میں
نے ہمت اور قوت ارادی کو مجتمع کیا اور گرتا پڑتا چلنے
لگا۔ سڑک پر چلنا بھی بہت مشکل تھا کیونکہ وہ برف کی
سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نرم برف پر جہاں میرا
قدم پڑتا' اندر دھنس جاتا۔ سردی سے اعصاب تک سن
ہوتے جا رہے تھے۔ جانے کیسے اور کتنی دیر میں' میں
مرکزی شاہراہ تک پہنچ ہی گیا۔

اس خراب موسم میں مرکزی شاہراہ بھی سنسان نظر آ رہی تھی۔ اب میرے لیے مزید کھڑے رہنا ناممکن تھا لہٰذا میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ برف باری اب تھم چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے دور کسی گاڑی کی روشنی نظر آئی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ہلانے شروع کیے۔ مگر گاڑی میرے قریب سے تیزی سے گزر گئی۔ گاڑی والوں نے دھند کی وجہ سے مجھے نہیں دیکھا یا پھر مجھے کوئی چور ڈاکو سمجھے۔ مایوسی کی ایک لہر میرے رگ و پے میں اتر گئی اور میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ کوئی ٹرک ہے۔ میں نے تیزی سے ہاتھ ہلائے۔ ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر ٹرک روک دیا اور پوچھا "تم کون ہو؟"

میں نے اسے جلدی جلدی بتایا کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ ایمرجنسی میں اسپتال جا رہا تھا کہ ایک شخص نے میری کار چھین لی۔ ڈرائیور نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اندر درجہ حرارت باہر کی نسبت زیادہ تھا اور مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ ٹرک والا کوئی نیک آدمی تھا۔ اس نے مجھے اسپتال پہنچا دیا۔ وہاں خاصی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ حادثے کی وجہ سے تمام عملے کو ایمرجنسی میں بلا لیا گیا تھا۔ اسپتال داخل ہوتے ہی میرا سامنا ڈاکٹر رمیض سے ہوا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولے "ڈاکٹر شیراز! آپ نے آنے میں دیر کر دی۔ وہ بچہ آپ کا انتظار نہ کر سکا اور ایک گھنٹا پیشتر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ میں نے آپ کو سوا دو بجے فون کیا تھا اور اب پونے پانچ ہو رہے ہیں۔" پھر ان کی نظر میرے حلیے پر پڑی.....

بکھرے بال ہاتھوں پر خراشیں۔ وہ حیرت سے مجھے تکتے ہوئے بولے "ڈاکٹر شیراز! خیریت تو ہے؟"

میں نے انھیں خود پر بیتی کہانی سنائی۔

"اوہ بہت افسوس ہوا آپ اندر جا کر آرام کریں میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

ایک منٹ، ڈاکٹر رمیض اس بچے کا کوئی رشتہ دار.....؟ میں نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ماں تھی جسے معمولی چوٹیں آئیں ہیں۔ اس کی حالت بیٹے کی موت کا سنتے ہی غیر ہو گئی۔ ہم نے بڑی مشکل سے نیند کا انجکشن دے کر اسے سلایا ہے۔ اس کے پرس سے چند فون نمبر ملے تھے۔ ہم نے ان تمام فون نمبروں پر اطلاع کر دی ہے۔" ڈاکٹر رمیض نے بتایا۔

"میں اس بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ابھی آپ آرام کریں اور کپڑے تبدیل کر لیں۔" ڈاکٹر رمیض نے کہا تو میں اندر چلا گیا۔ کچھ آرام کیا تو طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ صبح سات بجے کے قریب ڈاکٹر رمیض میرے کمرے میں آئے اور کہا "ڈاکٹر شیراز پہلے آپ ناشتا کر لیں پھر بچے کو دیکھ لیجیے گا۔ اس کا باپ بھی آ گیا ہے۔ وہ زار و قطار رو رہا ہے۔ وہ بچہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔"

"میں فوراً اس سے ملنا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔

میں پھر ڈاکٹر رمیض کے ساتھ وارڈ میں پہنچا تو دیکھا ایک شخص آٹھ سالہ بچے کے سینے پر سر رکھے رو رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا تو مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں میں مرچیں بھر گئی ہوں۔ مجھے کمرا دھند سے بھرتا ہوا محسوس ہوا..... یہ تو وہی تھا جس نے مجھ سے کار چھینی تھی۔

◆◆◆

ہماری نئی نسل کا سوال

امریکا آباد ہوں یا کینیڈا؟

تکلیفوں سے پُر ایک نرالے سفر کی کہانی، اس نے مغربی چکا چوند سے مرعوب پاکستانی نوجوانوں کی کایا پلٹ ڈالی

(ذوالفقار احمد چیمہ (ڈی آئی جی موٹروے پولیس)

خالد میرا کالج کے زمانے سے دوست ہے۔ آج کل وہ ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے دار ہے۔ گھر میں خوشحالی ہے۔ تینوں بچوں میں سے دو، فاطمہ اور علی لندن کی یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔ چند روز قبل اسی نسل کے ذریعے اس کا ایک خط موصول ہوا۔ خط کے کچھ حصے پیش ہیں:

کل مجھے اپنی بھانجی کی منگنی میں شرکت کرنے اسلام آباد پہنچنا تھا، لہٰذا ہم لاہور سے صبح سات بجے نکل کھڑے ہوئے۔ فاطمہ، علی اور عمر بھی ساتھ تھے۔ گوجرانوالہ پہنچے تو ایک جلوس کے باعث سڑک بند ملی۔ کچھ گاڑیاں تو واپس مڑ گئیں مگر ہمارے ڈرائیور نے گاڑی

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا (القرآن)
آیئے رمضان کی بابرکت ساعتوں میں قرآن کریم کی تلاوت
اور فہم کے حوالے سے اپنے تعلق کی "تجدید نو" کریں
تحسین القرآن
ایک ایسا منفرد قاعدہ جو پختہ عمر طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ قاعدہ حروف تہجی کے مخارج اور ان کی جداگانہ صفات کا فہم پہنچاتے ہوئے قرآن مجید کی مثالوں کے ذریعے تلفظ کی درستگی کی طرف رہنمائی کرتا ہے تاکہ اہلِ ایمان غلطیوں کی نشان دہی کے ذریعے تلاوت کرتے ہوئے لحنِ جلی یعنی واضح غلطی کے گناہ سے اجتناب کرسکیں۔
قاعدہ تحسین القرآن کے ریکارڈ کیے گئے آڈیو لیکچرز
ویب سائٹ: www.tadabburulquran.com پر موجود ہیں
ملنے کا پتہ
ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث، اسلام آباد
ای میل: Ahmad_cite@yahoo.com
فون: 0303-4508302
صفحات: 78
ہدیہ: 50 روپے

تیزی سے نکال لی۔ وہ اس لیے کامیاب ہوا کہ ابھی مظاہرین کی تعداد کم تھی۔

گجرات پہنچے تو پھر وہی تماشا دیکھنے کو ملا۔ بڑی تعداد میں لڑکے کاروں کے شیشے توڑ رہے تھے۔ ہمارے ڈرائیور کی پہلی کامیابی نے اس کا اعتماد اور حوصلہ بڑھا دیا تھا، سو یہاں بھی مظاہرین کو غچہ دے کر نکلنا چاہا۔ وہ نکل تو گیا، مگر ایک نوجوان نے کار پر ڈنڈا دے مارا جس سے ڈگی پر ڈینٹ پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر بچے بہت پریشان ہوئے۔ علی مظاہرین پر ناراض تھا اور بار بار "بے وقوف لڑکے" کہہ کر انھیں برا بھلا کہہ رہا تھا۔ عمر ڈرائیور پر ناراض ہوا جبکہ نادیہ دونوں کو ٹھنڈا کرتی رہی۔

راہ میں جابجا رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم واپس مڑ جاتے مگر بہن کی اکلوتی بیٹی کی منگنی میں پہنچنا ضروری تھا۔ گوجر خان سے بخیریت گزر گئے لیکن اس سے چند کلومیٹر آگے سڑک پھر بند ملی اور ہنگامہ بھی زیادہ تھا۔ جواں سال لڑکوں نے ڈنڈے اٹھا رکھے تھے۔ وہ ہر گزرنے والی سواری کو روک رہے تھے اور اس پر ڈنڈے برساتے۔ ہماری کار بھی مظاہرین میں پھنس گئی۔

چند لڑکوں نے ڈنڈے مار کر ونڈ سکرین توڑ ڈالی۔ علی نے اتر کر انھیں روکنے کی کوشش کی تو کسی نے اسے بھی ڈنڈا دے مارا جو اس کے بازو پر لگا۔ میں نے ان کی منتیں کیں اور ڈرائیور نے علی کو کھینچ کر کار میں بٹھایا اور اسے پیچھے بھگا لے گیا۔ بچ بچا کر واپس آئے تو سڑک کے کنارے ٹریفک پولیس کا ایک افسر کھڑا نظر آیا۔ اس سے پوچھا کہ اسلام آباد جانے کے لیے کون سا طریقہ اور راستہ اختیار کیا جائے؟

ٹریفک افسر حیران کن حد تک بااخلاق تھا۔ اس نے پوری ہمدردی سے بتایا "پنڈی تک دو تین اور جگہوں پر بھی سڑک بند ہے۔ کئی گھنٹے یونہی بندش رہنے کا اندیشہ ہے۔ اگر آپ کو ایندھن اور وقت کا مسئلہ نہیں تو چند کلومیٹر آگے جا کر ایک سڑک چکوال کو جاتی ہے۔ وہاں سے موٹروے کے ذریعے اسلام آباد پہنچا جا سکتا ہے۔" ہم نے گاڑی چکوال کی جانب موڑ لی جو وہاں سے پچاس کلومیٹر دور تھا۔ راستہ مانوس تھا نہ چکوال ہماری منزل تھی، مگر مجبوراً ان دیکھے راستوں پر چل پڑے۔

علی بازو پر لگا زخم سہلاتے ڈنڈا بردار لڑکوں کو انگریزی میں گالیاں دینے لگا۔ عمر نے بھی بڑے بھائی کی حمایت میں ساتھ ساتھ پاکستان کو کوسنا شروع کر دیا۔ "کیا ملک ہے! نہ بجلی ہے نہ ڈسپلن، نہ سیکیورٹی۔ سڑک پر آ کر غنڈے گاڑیاں تباہ کر رہے ہیں اور انھیں کوئی روکنے والا نہیں۔ پولیس کہاں ہے؟ یہ ملک رہنے کے قابل نہیں۔ بابا! چھوڑیں پاکستان کو امریکا یا کینیڈا چلے جائیں۔" علی نے بھی عمر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

میں نے کہا "رکو بیٹا! اتنے جذباتی نہ ہو۔ ملک کوئی ہاسٹل کا کمرا نہیں جو یکایک چھوڑ دیا جائے۔ ملک پرانی کار کی طرح بھی نہیں ہوتے کہ جب چاہا اس کی جگہ نئی لے لی۔ یہ اپنا ملک ہی ہے جس نے ہمیں شناخت، پہچان اور عزت دی۔ اپنا ملک ایسی نعمت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے قومیں صدیوں تک لڑتی ہیں۔"

علی بولا "بابا! یہ پرانی باتیں ہیں جو ہم سالہا سال سے سنتے آ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "بیٹا! آپ دیکھ رہے تھے کہ غربت میں پلے ان نوجوانوں کی آنکھوں سے انتقام اور نفرت ٹپک رہی تھی۔ ملک کے تمام دانشور مدت سے کہہ رہے ہیں کہ اگر حالات نہ سدھرے تو نوجوان بغاوت پہ اتر آئیں گے۔"

مگر کہنے لگا "انھیں بغاوت کرنی ہے تو جا کر حکمرانوں کے خلاف کریں، ہماری کاریں کیوں توڑ رہے ہیں؟ کیا لوڈشیڈنگ کے ذمے دار ہم ہیں؟"

میں جواب دینے لگا تو فاطمہ جو چھوٹے بھائی علی کے بازو پہ مالش کر رہی تھی، بول پڑی "بابا! پلیز مجھے بولنے دیں۔"

میں خاموش ہو گیا تو وہ بولی "بھائی! بابا نے بالکل ٹھیک کہا کہ یہ غربت، محرومیوں اور ناانصافیوں کے مارے لوگ ہیں۔ تمھیں ان پر بہت غصہ آ رہا ہے نا، کیونکہ تمھارے بازو پہ ایک ڈنڈا لگ گیا جب کہ ان کے سروں پہ ہر روز ظلم اور زیادتیوں کے کوڑے برستے ہیں۔ ہماری کار کا محض ایک شیشہ ٹوٹا، تو ہمیں کتنی تکلیف ہوئی۔ مگر ان کے جذبات و احساسات کے شیشے تو ہر روز کرچی کرچی ہوتے ہیں۔ یہ بے وسیلہ پاکستانی اپنی محرومیوں کا ذمے دار باوسیلہ لوگوں کو سمجھتے ہیں۔

"وہ سوچتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں تو دوسروں کے پاس مال و دولت کیوں ہوا! چند گھنٹے کی تکلیف برداشت کرنا تمھارے لیے مشکل ہے۔ حالانکہ کچھ دیر بعد جب تم گھر پہنچ جاؤ گے تو وہاں تمھارے لیے ہر سہولت اور ہر نعمت موجود ہے۔ یو پی ایس ہے اور جنریٹر بھی، لہٰذا لوڈشیڈنگ کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ لوگ جب گھروں کو

برائی کے خلاف جہاد

میرے نانا، حاجی محمود الملک (استاذ العلما حضرت علامہ مقبول احمد (پرنسپل دارالعلوم محمدیہ غوثیہ عمر خیل شرقی) کے چچا اور مولانا ڈاکٹر عبدالجبار (فاضل بھیرہ شریف) کے والد گرامی تھے۔ 1938ء میں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے گاؤں کڑی خیسور میں پیدا ہوئے۔ بعدازاں وہاں سے ہجرت کر کے قریبی علاقہ عمر خیل شرقی میں سکونت اختیار کر لی۔ زندگی کے باقی سال وہیں بسر کیے اور 26 اگست 2011ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

حاجی صاحب مرحوم نے اپنی ساری زندگی دین کے لیے وقف کیے رکھی۔ آج کے دور میں یہ بات مفقود ہے کہ برائی کو حسب استطاعت روکا جائے جس کا حدیث پاک میں ذکر ہے "اگر تم کسی برائی کو دیکھو تو اُسے ہاتھ سے روکو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو زبان سے روکو۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اُس برائی کو اپنے دل میں برا خیال کرو۔" (او کما قال النبی)۔ موجودہ دور کا انسان اگر کہیں برائی ہوتی دیکھے تو اُسے روکنے کے بجائے یہ سوچ کر ٹال دیتا ہے "مجھے کیا پڑی ہے کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی؟"

اس کے برعکس حاجی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے علاقے میں جس جگہ آپ کو خبر ملتی کہ کوئی خلاف شرع کام ہو رہا ہے تو اپنے سارے کام چھوڑ فوراً پہنچتے اور متعلقہ افراد کو ناصحانہ انداز میں تنبیہ کرتے۔ اگر وہ بات مان لیتے تو ٹھیک ورنہ آپ قدرے سخت لہجہ اپناتے اور بالآخر اپنی بات منوا کر ہی دم لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علاقہ اور آپ کو جاننے والے آپ کے سامنے کوئی خلاف شرع یا خلاف سنت کام کرنے سے باز رہتے۔

(مرسلہ: عبدالعزیز عمر خیلوی، عمر خیل شرقی)

لوٹیں گے تو وہاں سوائے غربت اور محرومیوں کے انھیں کچھ نہیں ملے گا۔ پکانے کے لیے سبزی اور بجلی کا بل دینے کو پیسے نہیں۔''

تھوڑی سی تکلیف پہنچنے پر تم ملک چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ جانتے ہو، جن ملکوں میں تم جانے کے خواہش مند ہو وہاں کے نوجوان اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اپنے وطن کو اپنا گھر سمجھتے اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ میری گوری ہم جماعتیں مجھے طعنے دیتی ہیں کہ تم لوگ تھوڑی سی زیادہ اجرت کے لیے آسانی سے اپنا ملک چھوڑ دیتے ہو۔ اپنا ملک تو گھر ہوتا ہے۔ گھر کے کسی حصے میں گند جمع ہو جائے یا کسی کمرے کا فرش خراب ہو یا کسی حصے کی چھت ٹوٹے، تو گھر چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہیے۔ بلکہ اس حصے کی صفائی اور مرمت کرانی چاہیے۔ کئی اقوام کو اپنے گھر کے مختلف حصوں کی صفائی و مرمت کراتے کئی سو سال لگے، تب جا کر اپنا گھر بہتر بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔''

فاطمہ نے بات جاری رکھی۔ ''دیکھو بجلی، صحت اور تعلیم کی سہولتیں اہم ہیں، مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ نہ ملیں تو گھر ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں جانے والے ہمیشہ غیر اور اجنبی ہی سمجھے جاتے ہیں اور ان سے غیروں جیسا سلوک ہوتا ہے۔ میرے پاکستانی نژاد برطانوی ہم جماعت اس پریشانی اور دکھ کا اظہار اکثر کرتے ہیں کہ وہ آج بھی تعصب کا شکار ہیں۔ وہ آج بھی اپنی شناخت سے محروم ہیں۔ میرے اپنے تجربے تمھارے خوابوں کی جنت کی اصل حقیقت بتانے کے لیے کافی ہیں۔''

عمر نے درمیان میں ایک آدھ جملہ ضرور کہا، مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ بڑی بہن کی باتیں بھائیوں کو متاثر کر رہی تھیں۔

''علی! تم تو جانتے ہو، ایشیا اور افریقا کے چھوٹے ملکوں کی طالبات بھی میرے ساتھ ہوسٹل میں رہتی ہیں۔ ان کے ملک بھی غربت اور مسائل میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ملک، زبان اور کلچر سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ ادھر پاکستان میں میڈیا نہ جانے کس ایجنڈے کے تحت یورپ اور بھارتی تمدن پھیلا کر ہماری نئی نسل کو مرعوبیت کی دلدل میں دھکیل رہا ہے۔ میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی ہے کہ یورپ اور امریکا کے طلبہ ملک سے محبت کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ وہ امریکا کے سابق صدر کینیڈی کی اس تقریر سے بہت متاثر ہیں:

"Ask not what America will do for you. Ask what you can do for your country"

(''یہ مت پوچھو کہ امریکا تمھیں کیا دے گا، بلکہ اپنے آپ سے پوچھو کہ تم اپنے ملک اور وطن کے لیے کیا کر سکتے ہو۔'')

فاطمہ کی باتوں میں دلائل تھے اور واقعات و مشاہدات بھی۔ اب تم اسلام آباد میں داخل ہو چکے تھے۔ اس مرحلے پر میں نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا ''عمر تم کہاں جا کر آباد ہوں..... انگلینڈ یا کینیڈا؟''

دونوں بھائی یک زبان بول پڑے ''کہیں بھی نہیں، ہم اپنے ملک ہی کو امریکا اور کینیڈا بنائیں گے۔ بلاشبہ پاکستان ہی ہمارا گھر ہے۔ ہم اس کی کمزور دیواریں اور ٹوٹی ہوئی چھتیں ٹھیک کریں گے اور اس کا گند صاف کر کے اسے دنیا کا بہترین ملک بنائیں گے۔''

◆◆◆

مزاح

رمضی میاں نے سودا خریدا

پریشان و اداس لمحوں کو شاداں بنا دینے والا شگفتہ قلم پارہ

غزالہ مجید

وہ خود تو کبھی سودا خریدنے نہیں گئے مگر ملازم کی لائی ہر چیز میں کیڑے نکالنا گویا ان کا فرضِ اولین بن چکا تھا۔ خاص طور پر چھٹی والے دن پان لگا کر برآمدے میں بیٹھ جاتے۔ ادھر گلو غریب سودا لے کر بائیسائیکل سے اترا، ادھر رمضی میاں کے سوالات کا آغاز ہوتا:

"یہ گوشت کہاں سے اٹھا لیا کم بخت۔" پہلے گوشت کی باری آتی۔

"میاں ایک ہی تو قصائی ہے جو اچھا گوشت دیتا ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کتے کا گوشت ہے۔"

"خدا کا نام لیں میاں، کتے وہاں کہاں سے آ گئے۔ روزانہ تازہ بکرے کرتا ہے اپنا قصائی۔"

"آج ہی اخبار میں خبر آئی ہے کہ مارکیٹ میں سرعام کتے کا گوشت فروخت ہو رہا ہے۔" رمضی میاں نے فتویٰ صادر کر دیا۔ "یہ گوشت بلیوں کتوں کو کھلا دو۔"

ان کا یہ ارشاد سن کر اندر سے بیگم چلاتی ہوئی نکل آئیں۔ "کیا خبط ہو گیا ہے تمھیں، گوشت بلیوں کو کیوں ڈالا رہے ہو! دماغ تو ٹھکانے پر ہے تمھارا!!"

"ذرا اس گوشت کا حلیہ تو دیکھو۔ بھلا بکرے کا

گوشت ایسا ہوتا ہے! ضرور یہ کہیں اور سے گندا گوشت اٹھا لایا ہے۔ بھلا بنارس قصائی ایسا گوشت بناتا ہے!''

''میاں خدا کی قسم، بنارس سے ہی بنوا کر لایا ہوں۔'' کلو نے فریاد کی۔

''چپ کر بے.... ایک چپت لگاؤں گا....'' رمضی میاں غرائے۔ اس دوران بیگم گوشت کا لفافہ اٹھا باورچی خانے جا چکی تھیں۔

اب رمضی میاں نے سبزی کی طرف رخ کر لیا۔ ''یہ گوبھی کیا کوڑے سے لایا ہے! اور یہ ٹماٹر بھرکس ہو رہے ہیں....''

کلو روہانسا ہو کر بولا ''اسی شہراتی منحوس کی دکان سے لایا ہوں میاں.... اب اور کدھر جاؤں!''

''سودا جہاں سے بھی لے.... ذرا آنکھیں کھلی رکھا کر مردار!.... تو تو لگتا ہے اماں پیسے پھینکنے جاتا ہے۔'' رمضی میاں نے کچوکے دیے۔

''میاں آپ خود جا کر لے آیا کریں سودا! میں بے چارہ اب کیا کروں، اس سے اچھا سودا پوری مارکیٹ میں نہیں ہے۔''

رمضی میاں کی غیرت کو تازیانہ لگا، بولے ''اچھا تو تیرا خیال ہے میں سودا نہیں خرید سکتا....'' ''ارے برخوردار.... میں تو ایسا سودا خریدتا ہوں کہ دکاندار کا کلیجہ نکال لاتا ہوں۔''

کلو مجرم بنا کھڑا تھا۔ بولا ''میاں میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا....''

''میں خوب سمجھتا ہوں تجھے.... آج کے بعد تو یہیں گھر پر رہنا.... میں خود سودا لے کر آیا کروں گا۔''

بیگم گوشت سنبھال کر اب سبزی لینے آ رہی تھیں۔ میاں کے ارادے بھانپ کر بولیں ''اب اکیلے گھر سے مت نکل کھڑے ہونا۔ کلو کو ساتھ لے کر جانا.... بازار میں بہت ہجوم ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو کہیں منہ کے بل جا گرو۔''

رمضی میاں اچانک غصے میں آ گئے۔ ''کیوں کیا میں اکیلا بازار نہیں جا سکتا؟ کیا میں اندھا کانا ہوں یا مخبوط الحواس؟ کلو کیا میرا ہاتھ پکڑ کر لے جائے گا؟''

''تم سے تو بات کرنا ایک عذاب ہے۔ عقل کی بات تو تم سنتے ہی نہیں ہو۔'' بیگم نے جرح کی۔

''ہاں عقل کے چراغ تو بس تمھارے پاس ہی روشن ہیں....''

بحث مباحثہ کافی دیر جاری رہا اور بالآخر بیگم کو ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

قصہ مختصر اگلے روز صبح صبح رمضی میاں کلو کو ساتھ لیے گھر سے فاتحانہ شان کے ساتھ سودا لینے روانہ ہوئے۔ کلو کے ہاتھ میں ٹوکری تھی۔ رمضی میاں شلوار قمیص پر واسکٹ اور ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ کپڑوں سے عطر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ منہ میں پان کا بیڑا تھا۔ سب سے پہلے بنارس قصائی کی دکان پر پہنچے۔ شناسائی تو تھی، انھیں دیکھ کر بنارس نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ حال احوال پوچھا۔ رمضی میاں نے ابتدائی گفتگو کے بعد استفسار کیا ''آج گوشت کیسا ہے؟''

''ہمارے ہاں تو روز ہی دیسی بکروں کا گوشت ہوتا ہے میاں۔'' بنارس نے بے پروائی سے کہا۔ وہ بڑے انہماک سے کسی گاہک کے لیے ران کاٹ رہا تھا۔

''کل ہمارے ملازم کو کیا چھیچھڑے اٹھا کر دے دیے تھے؟'' رمضی میاں جارحانہ انداز میں بولے۔

بنارس گوشت کاٹتے کاٹتے چونکا۔ رمضی میاں کی آواز اتنی بلند تھی کہ دکان پر کھڑے سارے لوگ بھی چونک گئے۔

"نہیں نہیں میاں، گوشت تو میں خود بنا کر دیتا ہوں۔ کہیں آپ کے نوکر نے غلطی سے کسی دوسرے گاہک کا گوشت نہ اٹھا لیا ہو۔" بنارس نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا۔

"کلو ہے تو ذرا بے وقوف، مگر اتنا اندھا بھی نہیں میرا ملازم... ضرور تمہارے کسی نوکر نے چھیچھڑے کاٹ کر دیے ہوں گے۔" رمضی میاں کا غصہ کسی طرح دور ہونے میں نہیں آیا۔

"چلو میاں، آج آپ کو خوش کر دیتے ہیں۔" بنارس نے رمضی میاں سے جان چھڑانے کی پوری کوشش کی مگر آج وہ بڑے جلال میں تھے۔

"خیر تو تو ہمارا پرانا قصائی ہے، تیرا تو اعتبار ہے مجھے... مگر کل اخبار میں چھپا ہے کہ اس مارکیٹ میں کتوں کا گوشت فروخت ہوتا ہے۔"

رمضی میاں نے شانِ استغنا سے کہا۔ سارے گاہک چونک کر رمضی میاں کو دیکھنے لگے۔ بنارس کی حالت یہ تھی کہ گویا کاٹو تو لہو نہیں بدن میں! اچک کر بولا

"میاں یہ اخبار نویس بڑے غیر ذمے دار ہیں۔ ان باتوں کا بھلا حقیقت سے کیا تعلق! ہم تو بیس سال سے یہیں گوشت فروخت کر رہے ہیں!"

رمضی میاں بڑے پیار سے بولے "ارے بنارس تو بلاوجہ برا مان گیا۔ تیری دکان پر تو کبھی میں نے بکرے کے علاوہ کسی مشتبہ جانور کا گوشت نہیں دیکھا۔"

بنارس جوشِ جذبات میں بولا "ہاں ہاں میاں... یہاں سارے قصائی بڑے ایمان دار اور اللہ والے ہیں... پتا نہیں کس مردود نے یہ بات بنائی ہے!"

رمضی میاں نے بنارس کو مزید تسلیاں دیں کہ وہ اسے اس الزام سے بری الذمہ گردانتے ہیں۔ مگر اس دوران میں دکان پر موجود گاہک، حتیٰ کہ بازار سے گزرنے والے لوگ بھی بحث کے موضوع سے آگاہ ہو چکے تھے۔ آس پاس اس قسم کے فقرے اچھلنے لگے:

"توبہ توبہ! میں تو اس دکان پر آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔"

"دیکھو تو، دیکھنے میں کیسا شریف آدمی لگتا ہے!"

"ارے ہے۔ ابھی کل ہی تو پورا بکرا کٹوایا ہے میں نے۔"

"اٹھا کر پھینکو سارا گوشت!"

بنارس رمضی میاں کو یوں دیکھ رہا تھا گویا ابھی چھرے سے حلال کر دے گا۔ کلو نے ٹہوکا دیا "میاں اگلی دکان پر چلیے... بنارس کا موڈ خراب ہے۔"

رمضی میاں بھی بنارس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ وحشت زدہ سے ہو گئے تھے۔ کلو کو لیے اگلی دکان کی طرف چل دیے۔

یہ قصائی رمضی میاں کی گفتگو سن چکا تھا۔ بڑے گستاخانہ لہجے میں بولا "جی بزرگوار!"

"اچھی گوشت چاہیے ذرا خاص قسم کا۔" رمضی میاں نے بڑے اخلاق سے کہا۔

"خاص سے کیا مراد ہے آپ کی؟" قصائی طنزیہ لہجے میں بولا۔

شاید اسے رمضی میاں کی صلاحیتوں کا خوب اندازہ تھا کہ ذرا ڈھیل دی تو گوہر افشانیاں کرنی شروع کر دیں گے۔

"اچھی بات سنو... بڈھے بکرے کا گوشت نہ ہو۔ ہڈی نیلی نہ ہو۔ گوشت کا رنگ گلابی اور ریشے نرم ہوں۔" رمضی میاں نے عالمانہ شان سے کہا۔

"بزرگوار آپ خود تسلی کر لیں..... یہ سامنے رانیں ٹنگی ہیں۔" قصائی نے اکھڑ لہجے میں کہا اور دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رمضی میاں نے رانوں کا بغور جائزہ لیا اور بولے "اس بکرے کے منہ میں دانت کیسے تھے؟"

"خبر نہیں۔" قصائی نے مختصر جواب دیا۔

"آنکھوں کا رنگ کیسا تھا؟" قصائی خاموش رہا۔

"کوئی مرض تو نہیں تھا اسے؟ مطلب یہ کہ ٹی بی..... ایڈز وغیرہ!" رمضی میاں نے شوشہ چھوڑا۔

قصائی نے خونخوار نظروں سے رمضی میاں کو دیکھا اور بولا "میاں یہ ایک صحت مند بکرا تھا....."

"ہاں..... رانیں تو صحت مند ہیں..... سری دیکھ لیتا تو اطمینان ہو جاتا۔" رمضی میاں نے حسرت زدہ انداز میں یوں کہا گویا بکرا انہیں داماد پسند کرنے جا رہے ہوں۔

قصائی بدتمیزی سے بولا "ایسی تفتیش تو بر رشتہ کرتے وقت بھی کوئی نہیں کرتا بزرگوار! آج آپ دال سبزی پکا لیں..... اور آئندہ گوشت خریدنے کسی سمجھدار آدمی کو بھیجیں۔"

"میں تجھے کیا پاگل نظر آتا ہوں؟" رمضی میاں نے اسے شعلہ بار نظروں سے گھورا اور آگے بڑھ گئے۔

"میرا خیال ہے مچھلی خریدی جائے۔" رمضی میاں نے جیسے خود سے کہا اور کلو کو بغل میں دابے مچھلی والے کی دکان پر آ کھڑے ہوئے۔

"یہ مچھلی کہاں سے پکڑی ہے برخوردار؟" رمضی میاں نے حاکمانہ انداز میں پوچھا۔

"آپ بتائیں کہ کتنی تول دوں! اپنے کام سے کام رکھیں۔" مچھلی والے نے بدتمیزی سے کہا۔

"بھئی پتا نہیں تم سب لوگ لڑنے پر کیوں ادھار کھائے بیٹھے ہو!" رمضی میاں بڑبڑاتے گئے۔

"میاں ہمارے پاس ٹائم نہیں ہوتا۔" مچھلی والے نے مختصر جواب دے کر جان چھڑائی۔

"اچھا بھئی یہ مچھلی کی آنکھوں کی پتلیاں کیوں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ یوں جیسے کوئی نشہ کیا ہو یا رات بھر نیند نہ آئی ہو۔"

"کتنی تول دوں میاں؟" دکاندار نے ان کی الجھن کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھہر جا بھائی..... ذرا ٹھہر تو دیکھ لوں مچھلی کے۔" یہ کہہ کر رمضی میاں مچھلیوں کے گلپھڑے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے اور پھر بڑے اعتماد سے اعلان کیا "یہ مچھلی کم از کم تین دن کی باسی ہے۔ جس نے کھائی، اسے ہیضہ ہو جائے گا۔"

"بزرگوار! آپ مت خریدیں مچھلی، مگر فضول باتیں نہ کریں۔ ہمارا روزی کا معاملہ ہے۔" دکاندار نے فریاد کی۔

رمضی میاں اتنی آسانی سے باز آنے والے کہاں تھے۔ "خوب! تمھارا روزی کا معاملہ ہے۔ لوگ بھلے کیا..... مر جائیں..... میں پوچھتا ہوں خوف خدا نہیں ہے تمہارے دل میں؟"

مچھلی والا اشتعال میں آ کر نہ جانے رمضی میاں کے ساتھ کیا سلوک کرتا کلو انہیں زبردستی گھسیٹتا ہوا دکان سے باہر لے آیا۔

"میاں آپ کیوں بلاوجہ لوگوں کے گلے پڑتے ہیں۔" کلو لرز کر بولا۔ "یہ دکاندار بڑے غنڈے ہیں، بات بات پر چاقو نکال لیتے ہیں۔"

رمضی میاں مرد مجاہد بن کر بولے "دیکھتا ہوں کتنے قتل کر دیں گے..... جہاں بھر کے چور اور بے

ایمان ہیں۔ وہ پیسے کے فائدے کی خاطر دوسروں کی جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔"

رمضی میاں بڑبڑاتے ہوئے سبزی کی دکان پر جا پہنچے۔ وہاں سبزی کی ٹوکریوں کا جائزہ لینے کے بعد فرمایا۔ "ارے میاں سبزیوں پر پانی چھڑک چھڑک کر وزن میں اضافہ کر رہے ہو! یہ کیا طریقہ ہے؟"

سبزی والا ذرا خوش مزاج تھا۔ خندہ پیشانی کرتے ہوئے بولا "میاں! ذرا سبزیوں کو تازہ رکھنے کے لیے پانی چھڑک رہا ہوں۔ آپ حکم کریں کون سی سبزی چاہیے۔ انشاءاللہ صحیح تول ہوگا۔"

رمضی میاں عالمانہ انداز میں بولے "برخوردار سنا ہے سبزیوں پر زہر یلے اسپرے کیے جاتے ہیں اور یہ طرح طرح کی بیماریاں پھیلا رہی ہیں۔"

سبزی والا ہراساں ہو کر بولا "آہستہ بولیں جی! آپ غریبوں کی روزی پر لات کیوں مارتے ہیں؟ ساری دنیا میں یہی اسپرے استعمال ہو رہے ہیں۔ ہم غریبوں کی گردن میں تو یونہی پھانسی کا پھندہ ڈال دیا جاتا ہے۔"

سبزی والے کی عاجزانہ گفتگو سن کر رمضی میاں کو شاید رحم آ گیا۔ "برخوردار! میں تمھاری روزی کا دشمن نہیں۔ دراصل آج کل اخباروں میں یہی خبریں آ رہی ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ معاشرے سے برائی کا وجود مٹ جائے۔"

سبزی والا گلوگیر آواز میں بولا "ہم غریبوں کو اتنی بڑی باتیں کہاں سمجھ آتی ہیں صاحب! ہم تو پیٹ پالنے کے چکر میں رہتے ہیں۔"

سبزی والے کی عاجزانہ گفتگو سے رمضی میاں کا حوصلہ مزید بلند ہو گیا۔ وہ ساتھ کھڑے ایک ریڑھی والے کے لتے لینے لگے: "اسے تو کیا کوڑے سے سبزی اٹھا لایا؟"

سبزی والے نے اشتعال میں آ کر کہا "زبان سنبھال کر بات کریں جی۔ صبح منڈی سے بولی لگا کر تازہ مال لایا ہوں۔ دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا...!"

رمضی میاں تاؤ کھا کر بولے "تجھے میرے دماغ میں کیا خلل نظر آتا ہے!"

سبزی والے نے سوال کا جواب دینے کی بجائے کلو کو مخاطب کر کے کہا "کیوں بے کلو! انھیں گھر سے باہر کیوں لے آیا؟ کنٹرول کر کے رکھا کر انھیں۔ ساری مارکیٹ میں صبح سے آوارہ گائے کی طرح گھوم رہے ہیں۔"

کلو بگڑ کر بولا "یہ پاگل نہیں اپنے میاں رمضان ہیں..."

سبزی والا بولا "صبح سے اس بندوں کے گلے پڑ چکے... اور یہ کیا میاں لگے ہیں!"

یہ الفاظ سنتے ہی رمضی میاں گھونسہ تان اس کی طرف بڑھے۔ اس نے گھونسہ کھانے کا انتظار نہیں کیا بلکہ رمضی میاں کو اس زور دار دھکا دیا کہ وہ ریڑھی پر منہ کے بل جا گرے۔ پھر سنبھل کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جلال میں آ کر کڑکے "ٹھہر جا بدذات، میں ابھی تجھے پولیس کے حوالے کراتا ہوں۔"

سبزی والا چلا کر بولا: "میں کسی سے نہیں ڈرتا... دیکھتا ہوں میرا کیا کرلو گے۔"

رمضی میاں کپڑے جھاڑتے ہوئے بولے "یہ تو تجھے جلد پتا چل جائے گا۔"

کلو جو اس مار پٹائی سے انتہائی خوفزدہ نظر آ رہا تھا اور رمضی میاں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا تھا لرزتی آواز میں بولا "میاں! خاموش ہو جائیں...... چلیے گھر

چلتے ہیں...... یہ آدمی چاقو نکال لیتا ہے بات بات پر!"

رمضی میاں باآواز بلند تقریر کر رہے تھے۔ "زمانہ ہی ایسا ہے۔ جو حق کی بات کرے اسے سولی پر لٹکایا اور سنگسار کر دیا جاتا ہے۔ سقراط کو ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔"

آس پاس کے دکاندار کام چھوڑ ٹھیلے کے آس پاس جمع ہو گئے۔ اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا جو لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ رمضی میاں لوگوں کے گھیرے میں ایک کھاگ سیاسی رہنما کی طرح تقریر کرنے لگے۔ اپنے حساب میں ایک عوامی رہنما کی طرح رتبہ شہادت پر فائز ہونے والے تھے۔

ایک دکاندار رمضی میاں کو سمجھاتے ہوئے بولا "بزرگوار! آپ بازار آنے کی زحمت نہ کیا کریں۔ آپ کے ملازم کو ہم نے پہچان لیا ہے۔ وہ آپ کو باقاعدہ سودا لا کر دے گا۔"

رمضی میاں چلائے: "اس کم ذات اور بے حیا آدمی نے میری توہین کی ہے۔"

ریڑھی والا گرجا "خبردار جو مجھے گالی دی۔ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

وہ بار بار رمضی میاں کو مارنے لپک رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے اسے دو آدمیوں نے قابو کر رکھا تھا۔ ادھر رمضی میاں کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی: "تو نے مجھے پاگل کہا! جرأت کیسے ہوئی!"

"اور کیا پاگلوں کے سر پہ سینگ ہوتے ہیں!"

کلو بیچارہ ایک طرف کھڑا رو رہا تھا۔ بالآخر ایک معتبر باریش دکاندار کے سمجھانے پر رمضی میاں ذرا خاموش ہوئے۔ ادھر ریڑھی والے کو لوگ زبردستی پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ اس طرح یہ خونریز لڑائی ختم ہوئی۔ ساری مارکیٹ کے دکانداروں نے رمضی میاں سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اور انھیں سمجھا بجھا کر کلو کے ساتھ گھر واپس روانہ کر دیا۔

رمضی میاں گھر پہنچے تو بیگم بے چینی سے صحن میں ٹہل رہی تھیں۔ محلے کے ایک لڑکے نے انھیں جھگڑے کی خبر کر دی تھی۔ وہ بے چاری انتہائی پریشان تھیں۔ رمضی میاں کو گرد آلود کپڑوں میں آتے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھیں۔ اور بولیں "میں نہ کہتی تھی کسی روز کہیں سے مار کھا بیٹھو گے۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔"

رمضی میاں طیش میں آ کر بولے "تمھیں کس نے کہا کہ مجھے مار پڑی؟ ارے بھئی اس مردود نے دھکا دیا اور میں ریڑھی پر جا گرا ہوں۔"

بیگم ہاتھ نچا کر بولیں "شاباش، مبارک ہو۔ اس عمر میں خوب عزت افزائی ہو رہی ہے۔ اپنی عمر دیکھو اور حرکتیں دیکھو۔"

"کیوں کیا جیب کاٹتا پکڑا گیا ہوں، یا کسی کی بکری کو بھگا لایا ہوں میں!" رمضی میاں کہاں ہار ماننے والے تھے۔

"بس اب یہی کسر رہ گئی ہے۔ زبان قابو میں نہیں، ہر جگہ لیڈری کرنے کا شوق خوار کراتا ہے تمھیں...... پھر بھی عقل نہیں آتی۔"

رمضی میاں تاؤ میں آ کر بولے "گلی سڑی سبزیاں اور باسی گوشت اٹھا لاتا تو بہتر ہوتا...... اب ذرا تم دیکھنا، میں ان دکانداروں کا کیا انتظام کراتا ہوں۔ فوڈ محکمے کے اعلیٰ افسر سے خود مل کر ساری خبریں پہنچاؤں گا۔"

بیگم چلا کر بولیں: "خبردار جو اب گھر سے باہر قدم رکھا...... اے کلو! ان کے لیے نہانے کا پانی رکھ اور حمام میں دھلا ہوا جوڑا بھی ٹانگ دے۔"

◆◆◆

معاشرتی کہانی

بیٹے کا گھونسلا

انسان کی بقا و بھلائی مثبت معاشرتی تبدیلیوں سے لڑنے میں نہیں انھیں اپنانے میں پوشیدہ ہے

جاوید بسام

بابا کرم داد نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو گھر جانے کے بجائے نہر کی طرف ہو لیا۔ نہر کنارے گھنے درخت لگے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کچھ دور چل کر دیکھا کہ دونوں بیٹے رحیم اور سلیم بھی پیچھے آ رہے ہیں۔ جلد ہی وہ اس کے قریب پہنچ گئے لیکن احتراماً دو قدم پیچھے چلنے لگے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور آسمان کا رنگ نارنجی ہو گیا تھا۔ رحیم نے دھیرے سے سلام کیا اور بولا "بابا پھر آپ نے کیا سوچا؟"

بابا رک گیا، گھوم کر انھیں دیکھا اور بولا "سوچنا کیا ہے میں نے کل تمھیں بتا دیا تو تھا۔"

سلیم لجاجت سے بولا "بابا اجازت دے دیں ہم کچھ اور کام کر لیتے ہیں۔"

"ضرور کرنا اور کام لیکن میرے مرنے کے بعد۔" وہ بیری کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

دونوں بھائیوں کے چہروں پر افسردگی چھا گئی۔ رحیم بولا "بابا کس بات سے کیوں ڈرتے ہو؟"

بابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں

بھائی اس کے قریب بیٹھ گئے۔

بابا کرم داد ایک جولاہا تھا۔ کھڈی پر کپڑا بنتا تھا۔ اس کا خاندان پشتوں سے یہی کام کرتا آیا تھا۔ بیٹے بھی اچھے کاریگر تھے۔ ایک وقت تھا جب انھیں سر اٹھانے کی بھی فرصت نہ ملتی لیکن پھر زمانے نے پلٹا کھایا۔ جدید مشینیں آتی گئیں اور ان کا کام تقریباً بند ہو گیا۔ اب چند مخصوص لوگ ہی کھڈیوں پر کپڑے بنتے تھے۔

بیٹے چاہتے تھے کہ کوئی اور کام کر لیں لیکن بابا انھیں اجازت نہ دیتا۔ اس کا کہنا تھا جب تک انھیں کام مل رہا ہے وہ اسے نہیں چھوڑ سکتے۔ اگرچہ اسے احساس تھا کہ مہنگائی روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ گزر بسر کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ لیکن وہ بیٹوں سے کہتا "میں بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن تم تو ماشاء اللہ جوان ہو۔ اس کام میں جدت پیدا کرو، کسی طرح اسے بڑھاؤ۔"

بیٹوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی۔ کئی دن سے ان کے درمیان یہی بحث چل رہی تھی۔ بابا معاملہ فہم آدمی تھا لیکن اس دفعہ وہ اپنی بات پر ڈٹ گیا۔

تینوں خاموشی سے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ پھر رحیم ہمت کر کے بولا "بابا ہم کب تک اپنے ماضی سے چپکے رہیں گے؟ لوگ ترقی کر رہے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آج کل تو جانور بھی اپنی پرانی عادتیں چھوڑ رہے ہیں۔" جانوروں کی بات اس کے منہ سے ایسے ہی نکل گئی۔

بابا نے ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنس کر بولا "میں کب تمھیں ترقی سے روکتا ہوں؟ میرا یہ کہنا ہے کہ یہ کام نہ چھوڑو۔ تم ابھی دوسروں سے بہت اچھے ہیں۔ حلال کی تھوڑی کمائی جھوٹ اور بے ایمانی کی زیادہ کمائی سے بہتر ہوتی ہے۔ جہاں تک تم نے جانوروں کی بات کی تو ذرا اوپر دیکھو۔"

بیٹوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا جہاں بیری کے درخت پر بیوں کے مخروطی گھونسلے لٹکے تھے۔ بابا بولا "یہ بھی ایک طرح کے جولاہے ہیں۔ بڑی محنت سے اپنا گھونسلا بنتے ہیں۔ ان کا گھونسلا بہت مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ صدیوں سے یہ گھونسلے بناتے آئے ہیں اور آج بھی بنا رہے ہیں۔" اس نے کچھ توقف کیا پھر بولا "ہم ایک ہنر جانتے ہیں تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھائیں؟ ہاں جس دن یہ کام ملنا بند ہو گیا تو پھر کچھ اور کریں گے۔"

بابا ہر بار انھیں لاجواب کر دیتا تھا۔ آخر سلیم ہار کر بولا "اچھا ہمیں کچھ دنوں کے لیے شہر تو جانے دیں۔"

"ضرور جاؤ، میں نے کب روکا ہے۔ سفر تو وسیلہ ظفر ہے۔"

دوسرے دن دونوں بھائی شہر روانہ ہو گئے۔ شہر میں گاؤں کے کئی لوگ موجود تھے۔ دونوں بھائی ان سے ملے۔ وہ مختلف کاموں میں لگے تھے۔ کوئی سبزی بیچ رہا تھا تو کسی نے مرغیوں کے گوشت کی دکان کھول رکھی تھی۔ ان کے رہن سہن سے لگتا تھا کہ وہ اچھا کما رہے ہیں۔ ان سے مل کر دونوں کی رنجیدگی بڑھ گئی۔

ایک دن دونوں بھائی ساحل سمندر کی سیر کرنے گئے۔ واپس آتے ہوئے وہ ایک پوش علاقے سے گزرے جہاں جدید فرنیچر اور جیسی روشنیوں سے مزین شیشے کی دیواروں والی دکانیں اور شو روم کھلے تھے۔ انھیں دیکھ کر دونوں کی آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول

گئیں۔ وہ حیرت سے دیکھتے چلے گئے۔ اچانک ان کی نظر ایک شوروم پر پڑی جس پر "کھڈی" لکھا تھا۔ اندر کپڑے بھی لٹکے نظر آئے۔ رحیم حیرت سے چیخا

"کھڈی . . یہاں شہر میں؟"

سلیم جوش اور اشتیاق سے بولا "اندر چلتے ہیں۔ دیکھیں تو یہاں کیا ہوتا ہے۔" دونوں میں بحث ہونے لگی کہ اندر جانا چاہیے کہ نہیں۔ آخر جذبہ تجسس سے مجبور ہو کر دونوں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اتفاق سے وہاں کوئی گاہک نہیں تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے منیجر نے انھیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور بولا "ہاں بھئی کیسے آئے ہو؟"

"ہم کھڈی کے کاریگر ہیں۔" سلیم نے کہا۔

"اچھا اچھا" مبارک یہاں آؤ!" اس نے کسی کو اندرونی حصے سے آواز دی۔ فوراً ہی ایک بڑی عمر کا آدمی باہر آیا۔

منیجر بولا "مبارک! یہ کھڈی کے کاریگر ہیں انھیں بدرے نے بھیجا ہے۔"

مبارک نے کہا "آؤ اندر آ جاؤ۔" وہ پلٹ کر چل دیا۔

دونوں بھائی حیرت سے بت بنے کھڑے تھے۔

منیجر بولا "جاؤ رک کیوں گئے؟"

کریم بولا "جناب! ہمیں کسی بدرے نے نہیں بھیجا ہم تو یہاں سے گزر رہے تھے۔ کھڈی کا نام پڑھ کر اندر چلے آئے۔"

"تمھیں یہ کام آتا ہے؟"

"ہاں آتا تو ہے۔"

"بس پھر چلے جاؤ۔"

دونوں اندر چلے گئے۔ وہاں کئی کھڈیاں لگی تھیں جن پر کاریگر کام کر رہے تھے۔

"ہمیں کاریگروں کی ضرورت ہے۔ تمھیں کام پوری طرح آتا ہے نا؟" مبارک نے پوچھا۔ دونوں نے گردن ہلائی۔ انھیں اسی وقت ملازمت مل گئی۔ چند روز وہاں کام کر کے دونوں بھائیوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہاں روایت کے ساتھ ساتھ جدت کو بھی اپنایا گیا تھا۔

کارخانے کا نگران ان کے کام سے بہت خوش

راز فاش ہو گیا

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا جنازہ تیار تھا۔ پورے ہندوستان سے لوگ اس میں شرکت کرنے آئے۔ حضرت صاحب اس خطے کے اولیا کرام میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ جنازے میں شرکت کے لیے جمع خلقت اس انتظار میں تھی کہ جنازہ پڑھانے کا اعزاز کسے حاصل ہوتا ہے۔ اتنے میں ایک شخص اٹھا اور اس نے خواجہ بختیار کاکیؒ کی وصیت پڑھنی شروع کی۔ اس میں تحریر تھا "میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے زندگی میں کبھی کوئی نماز قضا نہ کی ہو۔"

وصیت ختم ہوئی تو مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ لوگ ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کوئی شخص آگے نہ بڑھا۔ چند لمحے سکوت اور انتظار کے بعد ایک شخص کھڑا ہوا' آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھا اور امام کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے حضرت کی نماز جنازہ پڑھائی اور نم آنکھوں سے کہا "جانے والا تو چلا گیا' دوسروں کے راز فاش کر گیا۔" آپ جانتے ہیں نماز جنازہ پڑھانے والے کون تھے۔ وہ بادشاہ وقت شمس الدین التمش تھے۔

(عامر شہزاد شاہ' چونیاں)

ہوا۔ جتنی صفائی اور نفاست ان کے ہاتھوں میں تھی کسی اور کاریگر کے پاس نہ تھی۔ ایک دن رحیم نے بابا کو فون کر کے بتایا کہ وہ یہاں کارخانے میں کام کر رہے ہیں۔ یہ سن کر بابا بھی بہت حیران ہوا۔ رحیم نے کہا کہ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو شہر آ کر دیکھ لیں۔

بابا بولا "بیٹا! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے تمھیں حلال کمائی کھلائی ہے مجھے یقین ہے تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔"

اس نے دعائیں دے کر فون بند کر دیا۔

دونوں بھائی بھی خوشی خوشی وہاں کام کرتے رہے۔ انھیں بہت اچھے پیسے مل رہے تھے۔ ایک دن نگران بولا "ہمیں ایک آرڈر پورا کرنا ہے۔ تم یہ چیزیں گاؤں سے بنوا لاؤ۔" اس نے چند نمونے بھی دیے۔

رحیم نمونے لے کر گاؤں گیا اور بابا کو دکھائے۔ بابا بولا "ہاں ہم یہ بنا سکتے ہیں۔" اس نے ایک ملازم رکھا اور فوراً کام شروع کر دیا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ منیجر اور نگران ان کے گرویدہ ہو گئے۔ سارا سال بابا کو کام ملتا رہا۔ گاؤں کا کارخانہ بھی تیزی سے چلتا رہا۔ دونوں بھائی اپنی فطری خوش اخلاقی اور دوسروں کی مدد کا جذبہ رکھنے کے باعث ہر ایک کو جلد دوست بنا لیتے تھے۔ وہ اکثر شوروم میں بھی مدد کرنے آ جاتے۔ وہاں جب وہ بڑی محنت سے بنائی اپنی چیزوں کو بھاری قیمت پر بکتا دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔

شہر کے امرا جدت کی تلاش میں رہتے۔ وہ نت نئے ڈیزائن بنواتے اور وعدہ لیتے کہ یہ کسی اور کو بنا کر نہیں دیے جائیں گے۔ غرض اسی طرح دن گزرتے رہے۔ دونوں بھائی اچھا کما رہے تھے۔ بابا کا کام بھی خوب چل رہا تھا۔ ہر ماہ وہ خاصی رقم بچی انداز کر لیا کرتے۔ اسی طرح تین سال گزر گئے۔

پھر ایک دن دونوں بھائی گاؤں آ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ بابا نہر کنارے ٹہلنے گیا ہوا تھا۔ وہ بھی وہیں چل دیے۔ بابا انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ وہ بغیر اطلاع آئے تھے۔ ایسا لگتا تھا انھیں کوئی ضروری بات کرنی ہے۔

"اور سناؤ بیٹا! کیسے آنا ہوا؟" بابا ان کے چہرے پڑھتے ہوئے بولا۔ وہ اسی درخت کے نیچے آن بیٹھے جہاں پہلے ایک دن بیٹھے تھے۔

رحیم بولا "بابا! آپ کہا کرتے تھے نا کہ ہم نے اپنا کام کرنا ہے اسی میں ترقی کرنی ہے؟"

بابا نے اثبات میں گردن ہلائی۔

رحیم بولا "بابا ہمیں شہر میں ایک دکان مناسب کرائے پر مل رہی ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیں۔ وہاں ہم اپنا بنایا ہوا مال بیچا کریں گے۔ کیا ہم یہ دکان کھول لیں؟"

بابا ہنس کر بولا "تم کیا سمجھتے ہو میں تمھیں منع کروں گا؟ بیٹا ضرور دکان کھولو اللہ تمھیں ترقی دے۔ ہمارا بنیادی کام تو وہی رہے گا۔"

دونوں بھائیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ انھوں نے بڑھ کر بابا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بابا بولا "بیٹا بیا آج بھی ماضی کی طرح اپنے گھونسلے بنا رہا ہے کیونکہ وہ اسی میں اچھا لگتا ہے۔"

دونوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا جہاں بیوں کے گھونسلے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

◆◆◆

خصوصی تحریر

بھارتی آمریت جنھیں خرید سکی نہ جھکا سکی

سید علی شاہ گیلانی

محبوب گیلانی

اس شیر دل کشمیری رہنما کا ذکر خیر جن کے عزم مصمم نے حریت پسندی کو نئے معنی پہنائے اور جنھوں نے غاصبوں کے سامنے کسی قیمت پر سر نہ جھکا کر دلیری و جرأت کی نئی تاریخ رقم کر دی

12 جون 2010ء کو مقبوضہ کشمیر کے دارالحکومت سری نگر میں کہرام برپا ہو گیا۔ پچھلے دن کشمیری عوام ہندو یاتریوں کی چودھراہٹ کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ تبھی پولیس خواہ مخواہ آنسو گیس پھینکنے لگی۔ ایک گولے نے 17 سالہ فاروق بٹ کا سر پھاڑ ڈالا اور وہ موقع پر ہی شہید ہو گیا۔ فاروق میڈیکل کالج میں داخلے کی تیاری کر رہا تھا۔ عنقریب ہی اس کی منگنی بھی ہونے والی تھی۔ جب وہ المناک انداز میں دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے والدین غم و اندوہ سے نڈھال ہو گئے۔ ان کی حالت زار سری نگر کے عوام کو مزید طیش میں لے آئی جو نااہل ریاستی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔

13 جون کو بدقسمت فاروق کا جنازہ اٹھا تو پورا سری نگر امڈ آیا۔ ماؤں، بہنوں کے بین نے سخت دل رکھنے والوں کے قلب بھی موم کر ڈالے۔ اب یہ واقعہ آمرانہ بھارتی حکومت کے خلاف سینوں میں اب شعلہ بار جذبات ابلنے کا

سبب بن گیا۔ جنازے میں کلمہ شہادت پڑھنے کے علاوہ ''ہم مانگیں آزادی'' اور ''مجرموں کو سزا دو'' کے بلند آہنگ نعرے بھی سنائی دیے۔

غم و غصے کی لہر نے پھر پورے مقبوضہ کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہزارہا نوجوان بھارتی حکمرانوں کے خلاف نعرے لگاتے سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کے احتجاج سے نئی دہلی میں سرکاری ایوانوں کے در و دیوار ہلنے لگے۔ حسب روایت بھارتی حکومت نے اس احتجاج کو بزور کچلنا چاہا۔

فوج و پولیس نہتے کشمیری مظاہرین پر گولیاں چلانے لگیں۔ جب مزید نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا، تو مظاہروں میں بھی شدت آ گئی۔ حتیٰ کہ مقبوضہ کشمیر کی گلیوں اور سڑکوں میں کشمیریوں اور بھارتی فوجیوں کا دوبدو مقابلہ ہونے لگا۔ ایک طرف محض پتھر اور اینٹیں تھیں، تو دوسری طرف مشین گنیں اور بکتر بند گاڑیاں!

ہماری مدد کیجیے

دونوں قوتوں کا کوئی موازنہ ہی نہیں تھا، مگر کشمیری نوجوانوں نے محض خشت باری سے فوجیوں کی ناک میں دم کر دیا۔ آخر وزیراعلیٰ مقبوضہ کشمیر عمر عبداللہ نے ایک غیر معمولی قدم اٹھایا... اس نے ممتاز حریت پسند رہنما سید علی گیلانی سے مدد طلب کر لی۔ عمر عبداللہ کو یقین تھا کہ گیلانی صاحب اپنے اثر و رسوخ سے غصے میں بھرے کشمیری عوام کو قابو کر سکتے ہیں۔

ادھر سید علی گیلانی حسب دستور قید میں تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں جب بھی تحریک آزادی زور پکڑتی، تو بھارتی حکومت انھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیتی یا گھر میں مقید کر ڈالتی۔ وجہ یہ کہ ان کا شمار ایسے کشمیری رہنماؤں میں ہوتا ہے جو بھارتی حکومت کے خلاف جہاد برحق سمجھتے ہیں۔

13 جون کی صبح گیلانی صاحب نے ایک احتجاجی مظاہرے سے خطاب کرنا تھا۔ لیکن اس دن پو پھٹنے سے قبل ہی سیکڑوں سپاہیوں نے جنوبی سری نگر میں واقع ان کی رہائش گاہ پر دھاوا بول دیا۔ جیسے ہی وہ گھر سے باہر آئے، سپاہیوں نے انھیں دبوچا اور جیل پہنچا دیا۔

جب کشمیری نوجوان سڑکوں پر نکلے، تو گیلانی صاحب خوشی سے نہال ہو گئے۔ آخر نئی نسل کو احساس ہو گیا تھا کہ بھارتی حکومت نے انھیں غلام بنا رکھا ہے۔ لیکن جب ظالم بھارتی سیکورٹی فورسز نے 110 سے زائد کشمیری شہید کر ڈالے تو گیلانی صاحب کو تشویش ہونے لگی۔ انھیں محسوس ہوا کہ بے گناہوں کا خون سڑکوں پر بہہ رہا ہے۔

چنانچہ انھوں نے عمر عبداللہ کو اطلاع بھجوائی کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں بے چینی و انتشار ختم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ ہیں۔ سو 14 اگست 2010ء کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے فوراً بعد انھوں نے گھر کے باہر پریس کانفرنس کی۔ وہاں ٹی وی کیمروں اور صحافیوں کا مجمع لگ گیا۔ گیلانی صاحب حسب معمول سفید کرتے، پاجامے میں ملبوس تھے۔ سفید داڑھی کے ساتھ وہ وقار، متانت اور سادگی کا نمونہ نظر آتے تھے۔ وہ بلند قامت نہ تھے مگر ان کی شخصیت کا سحر جلد دوسروں کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔

پریس کانفرنس میں سید علی گیلانی نے کشمیری عوام سے اپیل کی: '' آپ پولیس اور فوج پر پتھر نہ پھینکیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میں آزادی کی بے پناہ تڑپ

موجود ہے۔ مگر ہمیں پرامن رہتے ہوئے اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے۔ اگر پولیس آپ کو روکے تو بیٹھ جائیے اور کہیے کہ ہاں، گولی چلاؤ۔"

گیلانی صاحب کی اپیل نے دوست دشمن کو حیران کر دیا۔ کیونکہ وہ مسلح جدوجہد کے حامی تھے۔ بہرحال وادیٔ کشمیر میں ان کی اپیل نے کرشماتی اثر کیا اور ایک ہفتے بعد وہ پرسکون ہو گئی۔ وجہ صاف ظاہر ہے... ذات، نسل و فرقے سے بالاتر ہو کر سبھی کشمیری گیلانی صاحب کی بات سنتے اور اس پر دھیان دیتے ہیں۔

ساٹھ سال ہونے کو آئے، سید گیلانی مرد آہن کے مانند بھارتی حکمرانوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ بھارتی حکومت نے انھیں ہر طرح کا لالچ دیا، دھمکیاں دیں اور تشدد بھی کیا، مگر وہ اس کشمیری رہنما کو خرید سکے نہ جھکا سکے۔ اسی لیے ان کے جلوسوں میں جوشیلے نوجوان فخر سے اکثر یہ نعرہ بلند کرتے ہیں:

"نہ جھکنے والا گیلانی، نہ بکنے والا گیلانی۔"

جب وادی میں ہنگامے شروع ہوئے، تو میں نئی دہلی میں تھا۔ دو روز بعد سری نگر پہنچا۔ وہاں اب بھی اکا دکا مظاہرے جاری تھے، مگر کوئی نوجوان بھارتی فوج پر پتھر نہ پھینکتا۔ میں نے چند نوجوانوں سے اس تبدیلی کی وجہ معلوم کرنا چاہی، تو وہ بولے "ہمارے لیے اپنے جذبات کنٹرول کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر ہم باپ کی بات نہیں ٹال سکتے۔"

"ہاں میں باغی ہوں"

مقبوضہ کشمیر میں سید علی گیلانی کی مقبولیت صرف ایک لفظ "بغاوت" پر استوار ہے۔ کئی کشمیری نوجوان انھیں "بب" (باپ) یا "لاجہ" (محبوب) کہتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے کبھی حکمرانوں کے سامنے سر نہیں جھکایا، سو عوام انھیں اپنا حقیقی اور سچا رہنما سمجھتے ہیں۔

وادی میں بعض رہنما بھارتی حکومت سے گفت و شنید کے حامی ہیں، مگر گیلانی نے ایسی تجویز کو ہمیشہ ناپسندیدگی سے دیکھا۔ کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر قانون اور ماہر سیاست، ڈاکٹر شوکت حسین کا کہنا ہے: "ان کے غیر لچکدار اور مستقل رویے نے انھیں قابل اعتبار بنا دیا ہے۔ کشمیری عوام دیکھ چکے کہ بڑے بڑے کشمیری لیڈر بھارتی حکومت کے سامنے مٹی کے مادھو ثابت ہوئے۔"

ڈاکٹر شوکت کا اشارہ شیخ عبداللہ مرحوم کی طرف ہے۔ موصوف کئی برس تک مختلف جیلوں میں قید رہے۔ آخر انھوں نے ہار مان لی اور 1975ء میں اندرا گاندھی کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر ڈالا۔ یوں انھوں نے کشمیر کی آزادی بیچ کر خودمختاری پر مصالحت کر لی۔

اسی زمانے میں ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ تب سری نگر کے ایک سینما میں لیبیا کے مشہور مجاہد عمر مختار کی زندگی پر مبنی انگریزی فلم لگی۔ عمر مختار وہ عظیم مجاہد ہیں جنھوں نے جان دے دی، مگر غاصبوں کی غلامی کا

[illegible] جیلانی سری نگر میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن ہی میں صحافت میں دلچسپی لینے لگے۔ گریجویشن کے بعد کشمیر کے کئی انگریزی اخبارات و رسائل سے منسلک ہوئے۔ آج کل وہ امریکی کولمبیا یونیورسٹی سے صحافت میں ایم اے کر رہے ہیں۔

طوق گردن میں نہ ڈالا۔ فلم نے کشمیری نوجوانوں کو جوش و ولولے سے بھر دیا۔ وہ باہر نکلے، تو انھوں نے دیواروں پر لگے شیخ عبداللہ کے پوسٹر پھاڑ ڈالے اور ان کے خلاف نعرہ بازی کی۔

سید گیلانی بھی عمر مختار کے مانند سامراج سے مفاہمت کرنے کو تیار نہیں۔ پچھلے ساٹھ برس سے ان کا یہی مطالبہ ہے کہ کشمیریوں کو حق رائے دہی دیا جائے تاکہ وہ خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔

پاکستان کے کٹر حمایتی

جب برطانوی ہندوستان سے رخصت ہوئے، گیلانی صاحب کی عمر 18 سال تھی۔ اوائل میں ان کا شمار بھارت کی حمایت کرنے والے کشمیری رہنماؤں میں ہوا۔ لیکن جلد ہی وہ جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر سے وابستہ ہو گئے۔ 1989ء میں کشمیریوں نے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا، تو آپ حزب المجاہدین تنظیم کے روحانی رہنما بن گئے۔ یہ پاکستان کی حمایتی تنظیم ہے جس میں جماعت اسلامی کشمیر کے مجاہد شامل ہوئے۔

مقبوضہ کشمیر میں مختلف الخیال رہنما ملتے ہیں۔ بعض وادی کو خودمختار مملکت دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ کچھ انڈین یونین میں رہتے ہوئے زیادہ خودمختاری چاہتے ہیں۔ دیگر صرف انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ان میں 84 سالہ سید گیلانی ہی پاکستان کے کٹر حمایتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے "مقبوضہ کشمیر میں جب بھی عام رائے شماری ہوئی، تو میں پاکستان کے حق میں بھرپور مہم چلاؤں گا۔"

مگر اسی سچائی کے باعث بھارتی عوام و خواص میں وہ سب سے زیادہ نامقبول کشمیری رہنما ہیں۔ مزید برآں ان کے کچھ جنگجویانہ نظریات کشمیریوں میں بھی زیادہ رائج نہیں ہو سکے جہاں صوفیائے کرام کا زور ہے۔ لیکن کشمیر کے سیاسی معاملات پر سید صاحب کی مضبوط و اٹل پوزیشن انھیں سب سے نمایاں کشمیری رہنما بنا ڈالتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ مسئلہ کشمیر حل کرا سکیں گے؟

اگست 2010ء میں گیلانی صاحب کے گھر میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے اور انکسار کا مجسمہ! ان کے چہرے مہرے یا رویے سے کسی طور نہ لگتا کہ وہ لاکھوں کشمیریوں کے محبوب رہنما ہیں۔ انھوں نے کہا "ظالم اور مظلوم، دونوں کو بعض معاملات پر مفاہمت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن ہمارے معاملے میں ظالم کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤ۔ وہ مقبوضہ کشمیر کو متنازع علاقہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ بات اسی وقت آگے بڑھے گی جب کشمیر سے فوج واپس چلی جائے، کالے قوانین ختم ہوں اور قیدی رہا کیے جائیں۔"

میں نے پوچھا "آپ کے نزدیک مسئلے کا حل کیا ہے؟"

"یہی کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیر میں عام رائے شماری کرائی جائے تاکہ مسئلہ پُرامن انداز میں حل ہو سکے۔"

مزدور کے ہاں جنم

نوجوان کشمیریوں نے جب سے آنکھ کھولی ہے، وہ گیلانی صاحب کو بھارت پر گرجتے برستے دیکھ رہے ہیں۔ مگر پرانی نسل جانتی ہے کہ ماضی میں ان کا انداز

فکر مختلف تھا۔ درحقیقت موجودہ نظریات اپنانے سے قبل شاہ صاحب عجب کایا پلٹ سے گزرے۔

آپ 29 ستمبر 1929ء کو پیدا ہوئے۔ ضلع بارہ مولا میں ایک گاؤں زوری منز واقع ہے۔ وہیں ان کے والد سید پیر شاہ گیلانی آباد تھے۔ سید پیر نیل دار تھے، یعنی نہر کے کناروں کی مرمت کرنے والے مزدور! آمدن اتنی تھی کہ سادگی و عزت سے گزر بسر ہو جائے۔ تاہم گھریلو ماحول پر غربت غالب تھی۔

گیلانی صاحب نے ہوش سنبھالا تو انھیں علاقے کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ گھر سے "10" میل دور تھا۔ ننھے گیلانی علم کی چاہ میں روزانہ 20 میل پیدل چلتے۔ ان کی محنت رنگ لائی اور انھوں نے 1945ء میں میٹرک کر لیا۔ وہ پھر دینی تعلیم و تربیت پانے لاہور چلے گئے۔ جب سید پیر علیل ہوئے، تو واپس گاؤں چلے آئے۔ جلد ہی انھیں گاؤں کی مسجد کا امام بنا دیا گیا۔ ساتھ ساتھ گیلانی صاحب پرائیوٹ طور پر بی اے کی تیاری بھی کرنے لگے۔

شیخ عبداللہ کے ساتھ

یہ 1949ء کا واقعہ ہے، مولانا محمد سعید ایک جلسے میں شرکت کرنے زوری منز تشریف لائے۔ وہ شیخ عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ تب نماز جمعہ کا خطبہ گیلانی صاحب نے دیا۔ گو وہ صرف 20 سال کے تھے مگر مولانا محمد سعید نوجوان کشمیری کی موثر خطیبانہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔

بھارت کے حامی کشمیری رہنما مولانا محمد سعید جلد ہی ذاتی طور پر نشوونما پاتے گیلانی صاحب کے سرپرست بن گئے۔ انھوں نے نوجوان کو اپنا سیکرٹری مقرر کیا اور سری نگر لے آئے۔

گیلانی صاحب سری نگر میں واقع نیشنل کانفرنس کے صدر دفتر مجاہد منزل میں رہنے لگے۔ مولانا محمد سعید نے اگلے چار برس ان کی برین واشنگ کرتے گزارے تاکہ سید گیلانی سیکولر رہنما میں ڈھل جائیں۔ کانفرنس کے رہنماؤں نے انھیں ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر لگوا دیا تاکہ وہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔

جب سید صاحب کے جوہر کھلے، تو وہ کانفرنس کے اخبار، روزنامہ خدمت میں مضامین لکھنے لگے۔ ایک مضمون میں انھوں نے بھارتی سیکولر پسندی کو خوب سراہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے کمیونسٹوں سے بھی مناظرے کیے۔ سیکولر پسندوں اور کمیونسٹوں میں دن رات اٹھنے بیٹھنے کے باوجود گیلانی صاحب نے پنج وقتہ نماز سے کبھی منہ نہیں موڑا۔

جماعت اسلامی میں آمد

1954ء میں سید صاحب کی ملاقات قاری سیف اللہ سے ہوئی۔ قاری صاحب جماعت اسلامی کشمیر کے بانیوں میں شامل تھے۔ انھوں نے نوجوان رہنما کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتب سے آشنا کرایا۔

یوں سرعت سے مولانا محمد سعید کی سیکولر تعلیمات کا اثر ختم ہوا اور گیلانی صاحب پر اسلامی نظریات کا سکہ جم گیا۔

اب گیلانی صاحب مقبوضہ کشمیر میں جماعت اسلامی کے سپاہی بن گئے۔ ان کا واحد مطمع نظر یہ ٹھہرا کہ علاقے میں جماعت کو مقبول و معروف بنایا جائے۔ انھوں نے جدوجہد کا آغاز اپنے آبائی علاقے سے کیا۔ وہ مقامی مساجد میں خطبات جمعہ دیتے، مدارس میں پڑھاتے اور ایک مڈل اسکول میں فارسی کی تعلیم دیتے۔

جماعت اسلامی کے تمام مبلغین کی مانند گیلانی صاحب چاہتے تھے کہ علاقے میں اسلامی تعلیمات پرامن انداز میں اس طرح پھیلائی جائیں کہ تمام مشرکانہ و ہندووانہ رسومات کا خاتمہ ہو جائے۔ انھوں نے خصوصاً نئی نسل پر یہ سچائی بھی آشکارا کی کہ وادی کے تمام پیر و سجادہ نشین بڑے جاگیردار ہیں۔ انھوں نے صدیوں سے غریب کشمیریوں کو ایک طرح سے اپنا غلام بنا رکھا تھا اور ان کا استحصال کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس حقیقت نے کشمیری نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیں اور وہ رفتہ رفتہ جماعت اسلامی کے نظریات قبول کرنے لگے۔

ادھر گیلانی صاحب کو بھی بتدریج یہ احساس ہوا کہ سیاست اور حکومت میں شامل ہوئے بغیر کشمیری معاشرے میں مثبت تبدیلیاں پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ سو جماعت اسلامی کشمیر نے فیصلہ کیا کہ ریاستی الیکشن میں حصہ لیا جائے۔ گیلانی صاحب نے 1972ء میں سوپور سے انتخاب لڑا اور پہلی بار لڑنے کے باوجود کامیاب ہوئے۔ 80ہزار لوگوں نے انھیں ووٹ دیا۔ اسی حلقے سے وہ مزید دو بار منتخب ہوئے۔

پہلے الیکشن میں ان کا مقابلہ کانگریسی امیدوار غلام رسول کار سے تھا جن کی عمر اب 90 سال ہو چکی۔ وہ بتاتے ہیں: ”گیلانی صاحب ہمیشہ جوش و جذبے سے معمور رہتے۔ امید ہر وقت ان کے ساتھ رہتی اور مثبت طرز فکر انھیں فائدہ پہنچاتا۔“

پارٹیاں بدلنا سیاست دانوں کا معمول ہے مگر گیلانی صاحب پچھلے ساٹھ برس سے جماعت اسلامی کے ساتھ وفاداری و خلوص کا رشتہ نبھاتے چلے آ رہے ہیں۔ جماعت نے بھی ان کا خیال رکھا اور انھیں کسی دنیاوی تکلیف میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔

الیکشن میں دھاندلی

وادی کشمیر میں تحریک آزادی کا آغاز 1987ء سے ہوا۔ پچھلے کئی برس سے نیشنل کانفرنس کے امیدوار دھونس، دھاندلی سے جیتتے چلے آ رہے تھے۔ الیکشن 1987ء میں پہلی بار ایک عوامی جماعت، مسلم یونائیٹڈ فرنٹ نے بھارت نواز پارٹی کی اجارہ داری کو چیلنج کیا۔

سری نگر کے علاقے امیرا کدل سے سید یوسف شاہ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے مضبوط امیدوار تھے۔ توقع کے مطابق انھوں نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ حتیٰ کہ انھوں نے پولنگ اسٹیشن میں جیت کے کاغذات پر دستخط بھی کر دیے۔ مگر اگلے دن ریڈیو کشمیر نے اعلان کیا کہ علاقے سے نیشنل کانفرنس کے امیدوار غلام محی الدین کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ سن کر قدرتاً سید یوسف شاہ غم و غصے سے بھر گئے۔ جب انھوں نے احتجاج کیا، تو انھیں پولنگ ایجنٹوں سمیت جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ جب رہائی ملی، تو سید یوسف سرحد پار کر کے آزاد کشمیر چلے آئے۔ وہ

پھر سرگرمی سے آزادی پسند کشمیری نوجوانوں کو تیار کرنے لگے تاکہ مقبوضہ کشمیر بھارت اور اس کے پٹھو کشمیری رہنماؤں کی گرفت سے نکل سکے۔ انھوں نے ''سید صلاح الدین'' عرف اختیار کیا اور مختلف کشمیری جہادی تنظیموں کی بنیاد رکھی۔ وہ آج بھی جہادِ کشمیر کے محاذ پر سرگرمِ عمل ہیں۔

الیکشن 1987ء میں گیلانی صاحب اپنی نشست پر جیت گئے تھے۔ مگر جب وادی میں مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا تو انھوں نے استعفیٰ دے ڈالا۔

تحریک آزادی کا آغاز

پاکستانی حکومت پر اکثر یہ الزام لگتا ہے کہ 1988ء میں اس کے بھیجے گئے فوجیوں نے مقبوضہ کشمیر میں تحریک آزادی کا آغاز کیا۔ اس الزام میں کوئی حقیقت نہیں۔ کشمیری صحافی ہونے کے ناتے میں اس امر کا گواہ ہوں کہ 1988ء میں ہزارہا کشمیری نوجوان سرحد پار کر کے آزاد کشمیر گئے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آزاد کشمیر یا پاکستان کے باسیوں نے انھیں بنیادی جنگی تربیت دی اور اسلحہ بھی فراہم کیا۔ سو کشمیری نوجوان اے۔کے 47 رائفلیں لیے مقبوضہ کشمیر پہنچے اور بھارتی سرکاری تنصیبات و فوج پر حملہ آور ہو گئے۔

بھارتی حکومت نے پوری قوت سے عوامی جوش و ولولہ کچلنے کا فیصلہ کیا۔ جلد ہی وادی میں جابجا فوجی نظر آنے لگے۔ سو کشمیر ارض پر مثلِ جنت نشان خطہ دنیا میں سب سے زیادہ عسکریانہ (Militarised) علاقہ بن گیا۔ آج بھی وہاں ہر دس شہریوں کے سر پہ ایک بھارتی فوجی یا سپاہی کھڑا ہے۔ جب کہ امریکا نے عراق پر قبضہ کیا، تو وہاں 186 شہریوں پر ایک امریکی متعین تھا۔

بھارتی سکیورٹی فورس کی تعداد بے محابا بڑھی، تو لامحدود طاقت نے ہندو فوجیوں کو سرکش بنا دیا۔ وہ پھر معمولی معمولی باتوں پر کشمیری عوام کو ظلم کا نشانہ بنانے لگے۔ ہزارہا کشمیری نوجوان اغوا کر کے شہید کر دیے گئے۔ اسی باعث وادی کے چپے چپے پر پھیلی ''گمنام قبریں'' عالمی ضمیر کا مذاق اڑاتی نظر آتی ہیں۔

لیکن کشمیری مجاہدین نے محدود وسائل کے باوجود بھارتی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ ان کی بے مثال بہادری و شجاعت نے انھیں راتوں رات کشمیری عوام میں ہیرو بنا دیا۔ حتیٰ کہ سڑکوں پر بندوقیں لہراتے نوجوان بھی قصاب کی دکان یا نکڑ کے جنرل اسٹور کی طرح روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئے۔

''ہم لاتعلق نہیں رہ سکتے''

کشمیری نوجوانوں کی برپا کردہ ولولہ انگیز مسلح تحریک آزادی کو شروع میں سید علی گیلانی نے متذبذب نظروں سے دیکھا۔ لیکن چند ماہ بعد وہ نوجوانوں کے پرجوش حمایتی بن گئے۔ جماعت اسلامی کشمیر کے دیگر رہنماؤں کو انھوں نے بتایا ''ہم میدانِ جنگ میں جانیں دیتے اپنے بچوں سے بے اعتنائی

نہیں برت سکتے۔"

دراصل بھارتی سیکیورٹی فورسز سے نبرد آزما بیشتر کشمیری نوجوان اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن تھے۔ سو گیلانی صاحب کا ان کی طرف جھکاؤ فطری امر تھا۔ حتیٰ کہ وہ دیگر رہنماؤں کی پروا کیے بغیر شہید نوجوانوں کی نماز جنازہ پڑھانے لگے۔ جو کشمیری آزادی کی راہ میں مردانہ وار اپنی جانیں دے رہے تھے، گیلانی صاحب ان سے بھلا کیسے لاتعلق رہ سکتے تھے؟

ظفر اکبر بھٹ حزب المجاہدین کے سابق کمانڈر رہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: "گیلانی صاحب ہمیشہ ہمارے محبوب رہنما رہے۔ جب وہ زیر زمین گئے تو ہم دعائیں لینے ان کے پاس جاتے تھے۔" ظفر اکبر نے 1988ء سے مسلح جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا۔ تاہم 2002ء کے بعد سے وہ غیر مسلح انداز میں جدوجہد کر رہے ہیں۔

بھارتی حکومت کو سرعام ہرکٹ کرنے کے باعث بھارت کی اسٹیبلشمنٹ انھیں اپنے لیے بڑا خطرہ سمجھتی تھی۔ چناں چہ اب تک گیلانی صاحب پر "بارہ قاتلانہ حملے" ہو چکے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ہر بار اپنے برگزیدہ بندے کو دشمن سے محفوظ رکھا۔ یکم اکتوبر 1996ء کو بھارتی فوجیوں نے ان کے گھر پر دو راکٹ فائر کیے۔ راکٹ دیوار پھاڑتے ہوئے اندر پہنچے اور پھٹ پڑے مگر بفضل خدا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

دشمن نے گیلانی صاحب کے اہل خانہ کو بھی نشانہ بنایا۔ 2005ء میں نامعلوم افراد نے ان کے داماد ایڈووکیٹ الطاف احمد کو گولیاں مار دیں۔ ایک گولی گردن میں جا گھسی مگر الطاف احمد بچ گئے۔ اب بھی ہر وقت ان کی جان جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

لیکن ان الم ناک واقعات سے پریشان یا دل برداشتہ ہونے کے بجائے گیلانی صاحب زیادہ شدت سے بھارتی حکومت کے مخالف بن گئے۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتیوں نے جو مظالم ڈھائے، وہ ان کے گواہ ہیں... 80ہزار شہدا، ہزارہا نوجوانوں کی گمشدگی، خواتین کی بے حرمتی، ناجائز اسیری اور بے نام قبریں!

معاصرین سے اختلاف

1993ء میں مقبوضہ کشمیر کی چھبیس سیاسی جماعتوں نے سیاسی اتحاد، حریت کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ مدعا یہ تھا کہ بھارت سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر مشترکہ جدوجہد ہو سکے۔ سیاسی اتحاد کے منشور کی رو سے کوئی رکن جماعت ریاستی الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتی۔

2002ء میں الیکشن سر پر آئے، تو حریت کانفرنس کی بعض جماعتوں نے چاہا کہ اس میں حصہ لیا جائے۔ یوں اتحاد میں پھوٹ پڑ گئی۔ تب سے اتحاد تین حصوں میں تقسیم ہو چکا۔ ان کی قیادت بالترتیب سید گیلانی، میر واعظ عمر فاروق اور شبیر شاہ کر رہے ہیں۔

سید صاحب اپنے غیر لچکدار رویے کے باعث کبھی کبھی معاصرین کی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ مثلاً مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ پاکستانی ایجنٹ ہیں۔ حالانکہ گیلانی صاحب نے اپنے اصولوں کو کبھی خیرباد نہیں کہا۔ خصوصاً کسی پاکستانی حکمران نے عام رائے شماری سے ہٹ کر بات کی، تو سید صاحب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس ضمن میں جنرل پرویز مشرف سے ان کی ملاقات چشم کشا رہی۔

جنرل پرویز مشرف سے ٹاکرا

پاکستان کے سابق حکمران جنرل مشرف

مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر حل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی سعی رنگ لائی اور 7 اپریل 2005ء کو سری نگر اور مظفر آباد کے مابین بس چلنے لگی۔ میر واعظ عمر فاروق نے اس اقدام کو خوش آئند قرار دیا۔ تاہم گیلانی صاحب کا کہنا تھا کہ یہ محض نمائشی اقدامات ہیں۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے استبدادی پنجوں سے رہائی دلوائی جائے۔

نو دن بعد 16 اپریل کو جنرل پرویز مشرف نے بھارت کا دورہ کیا۔ 18 اپریل کو پاکستان ہاؤس نئی دہلی میں جنرل مشرف اور گیلانی صاحب کی ملاقات ہوئی۔ گیلانی صاحب کے ایک رفیق بھی اس میٹنگ میں شریک تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ آغاز ہی سے گیلانی صاحب کا رویہ جارحانہ رہا۔ اس ملاقات میں کچھ یوں گفتگو ہوئی۔

جنرل مشرف نے کہا "گیلانی صاحب! حالات بدل چکے ہیں۔"

انھوں نے جواب دیا "جی ہاں! حالات بدل چکے مگر ایک عقیدہ یا اصول کبھی نہیں بدلتا۔"

جنرل مشرف: "ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس مذاکرات کا حصہ بن جائیں۔ آپ کی مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

علی گیلانی: "آپ کے خیال میں نتیجہ کیا نکلے گا؟"

جنرل مشرف: "ضرورت اس امر کی ہے کہ اتفاق رائے پیدا کیا جائے۔"

علی گیلانی: "اتفاق رائے یہ ہے کہ بھارتی حکومت کشمیر کو بہ حیثیت متنازع علاقہ تسلیم کرے، علاقے سے فوج نکالے، تمام قیدی رہا کرے اور سیاہ قوانین واپس لے۔ تب ہم مذاکرات کا سوچ سکتے ہیں۔ اور جی ہاں، مذاکرات سہ فریقی ہوں گے۔ آپ، میں اور وہ (بھارتی) میز پر بیٹھ کر ہی کوئی نتیجہ نکال سکتے ہیں۔"

گیلانی صاحب کے رفیق مزید افشا کرتے ہیں کہ ضلع ڈوڈا میں جماعت اسلامی کے امیر ملک نور فیاض بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب فیاض نے جنرل مشرف سے ہاتھ ملانا چاہا، تو انھوں نے نظر انداز کر دیا۔ یہ دیکھ کر گیلانی صاحب گویا ہوئے "جنرل صاحب! یہ شریف آدمی گریجوایٹ ہے، کوئی ان پڑھ جاہل نہیں۔"

وہ ملاقات مفید ثابت نہ ہو سکی۔ گیلانی صاحب کو جنرل مشرف کی امریکا پسندی پر بھی اعتراض تھا۔ علی گیلانی کی مخالفت نے جنرل صاحب کو ناراض کر دیا۔ وہ پھر انھیں نظر انداز کرنے لگے...... جب کہ مقبوضہ کشمیر میں میر واعظ عمر فاروق جنرل مشرف کے آدمی بن گئے۔

کشمیریات کے ماہر شیخ شوکت حسین کہتے ہیں "اس وقت گیلانی صاحب نے کشمیری تحریک کو مقدم سمجھا اور اسے تحفظ دیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ وہ پاکستانی حکومت کے پچھلگو نہیں۔ میر واعظ جنرل صاحب کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے لگے۔ یہ کہ مقبوضہ کشمیر میں خودمختار حکومت قائم ہو جائے اور سرحدیں اہم نہ رہیں۔

اور مسئلہ حل نہ ہو سکا

میں میر واعظ سے بھی ملا۔ سری نگر کے علاقے نگین میں ان کی رہائش گاہ واقع ہے۔ وہ کشمیری علیحدگی پسندوں میں مقبول سمجھے جاتے ہیں۔ اسی باعث وہ 2004ء میں نئی دہلی جا کر وزیراعظم من موہن سنگھ سے

بھی ملے۔ تاہم یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔

میرواعظ کو بھارتی حکومت سے گلہ ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں اب تک کوئی معین و مستقل سرکاری پالیسی نہیں بنا سکی۔ اسی لیے اعتدال پسند کشمیری رہنما چاہنے کے باوجود مسئلہ کشمیر حل نہیں کر سکے۔ ان کی ناکامی نے علاقے میں گیلانی صاحب اور دیگر رہنماؤں کو مزید مقبول بنا دیا جو بھارت سے مکمل آزادی چاہتے ہیں۔

اشوک بھان ریٹائرڈ بھارتی سرکاری افسر ہیں۔ جموں و کشمیر کے آئی جی پولیس رہے۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں انھوں نے مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں گیلانی صاحب سے خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ بتاتے ہیں: ''میں 2002ء میں پہلی بار ان سے ملا۔ تب میں نے گزارش کی کہ آپ کی جماعت (اسلامی) پاکستان میں بھی قبولیت عامہ حاصل نہیں کر سکی۔ آپ غیر معروف ہستی کی طرح جان مت دیں، بلکہ مذاکرات سے مسئلہ کشمیر حل کریں اور امر ہو جائیں۔ مگر گیلانی صاحب نے انکار کر دیا۔

مخالفین کی کمی نہیں!

آج بھارت، پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں گیلانی صاحب کے مخالفین کی کمی نہیں..... اس طبقے میں بھارتی حکومت، کشمیری پنڈت، سیکولر و قوم پرست کشمیری رہنما، پاکستانی سیکولر معتدل علیحدگی پسند، بھارت پسند کشمیری رہنما حتیٰ کہ بعض جماعتی لیڈر شامل ہیں۔ بعض لوگ انھیں جدید دور میں غیر متعلق سمجھتے ہیں..... کیونکہ گیلانی صاحب کا اب بھی اصرار ہے کہ قرارداد اقوام متحدہ کی روشنی میں رائے شماری ہونی چاہیے۔

سیاسی مخالفت ایک طرف، دوست دشمن سبھی گیلانی صاحب کی شرافت، دیانت اور اخلاقی قوت کے معترف ہیں اور اس امر کے بھی کہ انھوں نے تحریک آزادی کشمیر کی راہ میں ان گنت قربانیاں دی ہیں۔

1962ء میں پہلی بار گیلانی صاحب کو حوالۂ زنداں کیا گیا، تو ان کی بیگم فاطمہ امراض قلب میں مبتلا ہو گئیں۔ چناں چہ ان کے چھ بچوں (چھ بیٹیاں اور دو بیٹوں) کی تعلیم و تربیت از حد متاثر ہوئی۔ بڑی بیٹی شفیقہ تب آٹھویں کلاس میں تھی۔ اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی تاکہ گھر بار سنبھال سکے۔

آج شفیقہ اپنے شوہر کے ساتھ سوپور میں مقیم ہے۔ وہ کہتی ہے: ''میں اپنے والد کے قریب نہیں ہو سکی، مگر مجھے ان کے مشن کا ضرور معلوم ہو گیا۔ جب ہم بچوں کو ان کی ضرورت ہوتی، وہ جیل میں یا جماعت کے کاموں میں مشغول ہوتے۔'' فروری 1970ء میں فاطمہ بیگم انتقال کر گئیں۔ تب ان کا سب سے چھوٹا بیٹا نسیم صرف 10 ماہ کا تھا۔ اسے ہندی پورہ کے ایک خاندان نے پالا جو بچے کی نعمت سے محروم تھا۔

تاریخ بدلی نہیں جا سکتی

کچھ عرصہ قبل میری گیلانی صاحب سے ملاقات ہوئی، پیرانہ سالی کے باوجود وہ قریبی مسجد میں نماز فجر پڑھاتے ہیں۔ تکمیل نماز کے بعد وہ مجھے اپنی مطالعہ گاہ لے گئے۔ وہاں پہلے انھوں نے کچھ وقت قرآن پاک پڑھنے میں گزارا۔ تب وہ بہت تر و تازہ اور پرسکون نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنی نم سبز آنکھیں مجھ پر گاڑیں اور گویا ہوئے ''انسان جب بھی قرآن مجید کا مطالعہ کرے، اسے نئے معنی ملتے ہیں، نیا جوش و جذبہ

میسر آتا ہے۔ یہ کتاب آپ کی رہنمائی کرتی ہے کہ پیدل کیونکر چلا جائے اور اپنے پڑوسیوں، دوستوں، والدین، بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔"

میں نے سوال کیا: "کوئی اہم سیاسی فیصلہ کرنے سے قبل بھی آپ قرآن پاک سے رہنمائی لیتے ہیں؟"

وہ ترنت بولے: "بالکل! میں ہر فیصلے میں اس کتاب سے رہنمائی لیتا ہوں۔ قرآن کا جوہر یہ نکتہ ہے کہ تمام تر حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔"

تب مجھے یہ جوشیلے و شیر دل بزرگ ایک فرمانبردار طالب علم محسوس ہوئے۔ گفتگو پھر سیاست کی جانب مڑ گئی۔ اب ان کا رکھ رکھاؤ بھی بدل گیا، لہجے میں تلخی آ گئی۔ وہ تلخی سے بولے: "میں [illegible] بارہ سال قبل دو کشمیری گرفتار ہوئے اور انھیں تہاڑ جیل میں قید رکھا گیا۔ اب انکشاف ہوا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ کیا یہ قانون ہے؟ کیا اسے انصاف کہتے ہیں؟"

"آپ طالبان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا انھیں اسلامی طرزِ حیات کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں، نہیں، نہیں... وہ ہرگز اسلام کے نمائندے نہیں۔ ان کے عمل انتقام کی پیداوار ہیں۔" گیلانی نے یہ کہہ کر گہرا سانس لیا اور کہا "اسلام تو بے گناہ انسانوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

اسی وقت ناشتا آ گیا۔ وہ روٹی اور دو ابلے انڈوں پر مشتمل تھا۔ گیلانی صاحب کئی عوارض کا شکار ہیں۔ اسی باعث سادہ ناشتا کرتے ہیں۔ جب فارغ ہوئے تو مسلح جدوجہد پر بات ہونے لگی۔ میں نے پوچھا: "کیا آپ مسلح جدوجہد کے حامی ہیں؟"

انھوں نے کچھ دیر توقف کیا، پھر گویا ہوئے:

"بھارتی حکومت نے اسلحے کی طاقت کے بل پر ہمیں آزاد ہونے سے روک دیا۔ ہمارے پرامن جلوسوں پر بھی گولیاں چلائی گئیں۔ سو آخر کار ہم نے بھی بندوقیں اٹھا لیں۔"

میں نے سوال کیا: "مقبوضہ کشمیر میں تو غیر ملکی جنگجو بھی موجود ہیں۔ ان کی بابت آپ کیا کہتے ہیں؟"

وہ بولے: "آپ کو مشرقی پاکستان تو یاد ہو گا۔ جب وہاں کچھ لوگوں نے تحریک آزادی چلائی، تو بھارت نے وہاں فوج بھجوا دی۔ بھارتی حکومت نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ اسی طرح جب پاکستان، کشمیری بھائیوں کی مدد کرتے ہیں، تو انھیں کیونکر غلط کہا جائے؟"

دوران گفتگو پھر مقبوضہ کشمیر میں پاکستانیوں کی خفیہ کارروائیوں اور اقوام متحدہ کا ذکر آیا۔ میں نے بتایا کہ بعض کشمیری رہنما مسئلہ کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں کو مردہ سمجھتے ہیں۔ یہ سن کر گیلانی صاحب طیش میں آ گئے۔ کہنے لگے: "ارے بھئی، یہ عالمی قراردادیں [illegible] ہیں، تو مجھے بتاؤ، ہم کشمیریوں کے پاس کیا بچا؟ اور ان [illegible] پاکستان کا بھی بنیادی کردار ہے۔ [illegible] اقبال [illegible] تحریک آزادی میں ناکامی و پسپائی کے لیے آئے ہیں [illegible] اس کا یہ مطلب نہیں کہ تاریخ کا دھارا بدل دیں۔ آج بھی مسئلہ کشمیر حل کرنے کا بہترین طریقہ رائے شماری کرانا ہے۔"

اسی وقت نوجوانوں کا ایک گروہ کمرے میں داخل ہوا۔ بوڑھے علی گیلانی جلد ہی ان میں گھل مل گئے۔ ان کی پشت دیوار سے لگی تھی۔ دیوار پر ایک بڑا سا پوسٹر چسپاں تھا۔ اس پر بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کا کشمیریوں سے کیا گیا یہ وعدہ درج تھا کہ جموں و کشمیر میں رائے شماری کرائی جائے گی۔ ◆◆

قدم قدم پر ساتھیوں سے دوڑ لگانے کے شوقین ایک نوجوان کی سبق آموز داستان

مبشر علی زیدی

میں بہت سال بعد ساہیوال پہنچا تو دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اتنے زور سے جیسے میں بہت دور سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچا ہوں۔

میں آیا تو واقعی بہت دور سے تھا۔ نو سو کلومیٹر دور کراچی اور چوبیس سال کے فاصلے سے۔ چوبیس سال پہلے ہم ساہیوال میں رہتے تھے۔ میرا بچپن وہیں گزرا۔ پانچویں جماعت قائداعظم پبلک اسکول سے پاس کی۔ پھر بابا کا تبادلہ ہوا تو ہم کراچی منتقل ہو گئے۔ اتنے طویل عرصے کے بعد میں ساہیوال کو دوبارہ دیکھنے اور اپنے بچپن کے دوستوں سے ملنے واپس آیا تھا۔

تیز گام میں سفر کے دوران میں ساری رات نہیں سو سکا اور بچپن میں پیش آنے والے واقعات یاد کرتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بچپن

تجربات زندگی

سال پرانی نہیں، چوبیس گھنٹے پہلے کی باتیں ہوں۔

مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں محلے کے بچوں کے ساتھ دوڑ کے مقابلے میں شریک تھا۔ میری عمر کم تھی، کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مقابلے میں دو چار سال بڑے لڑکے بھی تھے۔ میں وہ دوڑ نہ جیت سکا۔ میرے ہمسائے صابر نے مقابلہ جیت کر انعام حاصل کر لیا۔

مگر میں اس دوڑ کو کھیل سمجھ کر نہیں بھلا سکا۔ عید پر چمک دمک والے جوتوں کے بجائے تیز دوڑ میں استعمال ہونے والے جوتے خریدے اور باقاعدگی سے مشق شروع کر دی۔ میں روزانہ اسٹیڈیم کے دو چکر لگاتا۔ اگلے سال دوڑ کا مقابلہ ہوا تو میں نے سب کو ہرا دیا۔ مجھے انعام ملا اور سب کی شاباش بھی۔ کراچی آنے کے بعد میں کالج اور یونیورسٹی کے مقابلوں میں حصہ لیتا رہا اور قومی چیمپئن شپ میں شرکت کرتے کرتے رہ گیا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ پہلی جماعت کے ششماہی امتحان میں ایک لڑکا شاہد اول آیا تھا اور میں دوم۔ دراصل میں زیادہ وقت کھیل کود میں لگا رہتا تھا اس لیے

نتیجہ توقع کے مطابق نہ ملا۔ لیکن کوئی اور اول آیا' یہ میں برداشت نہیں کر سکا۔ میں نے کھیل کود کم کیا اور پڑھائی میں دل لگا لیا۔ سالانہ امتحان میں حسب خواہش پہلی پوزیشن ملی تو کچھ تسکین پائی۔

اس کے بعد مجھ پر ایک اور طرح کی فکر سوار ہو گئی۔ میں اوّل تو آ گیا لیکن اب شاہد بدلہ لینے کے لیے زیادہ محنت کرتا تھا۔ میں نے سوچا' مجھے بھی زیادہ محنت کرنی چاہیے۔" گرمیوں کی چھٹیاں آئیں' تہوار آئے' موسم بدلے' اسکول بدلا اور حد یہ کہ شہر بدل گیا' لیکن میری فکر اور میری پڑھائی کا معمول نہیں بدلا۔ دوسری' تیسری' چوتھی' پانچویں' میٹرک' گریجوایشن اور ماسٹرز میں ہر سال اوّل آتا رہا۔

مجھے یاد آیا جب ہم خانیوال میں رہتے تھے تو ایک بار بچوں کے کسی رسالے نے کہانی لکھنے کا مقابلہ کرایا۔ میں نے بھی ایک کہانی بھیجی اور میرے دوست رشید نے بھی۔ رشید کی کہانی چھپ گئی اور میری والی ناقابل اشاعت قرار پائی۔ اس دن میں بہت رویا۔ پھر آنسو پونچھ کر فیصلہ کیا کہ بہت جلد میری کہانی بھی شائع ہو گی۔ دیکھتا ہوں رسالے والے کتنی کہانیاں ناقابل اشاعت قرار دیتے ہیں!

میں بہت محنت سے کہانیاں لکھنے لگا اور ایک دو نہیں' آٹھ دس کہانیاں لکھ ڈالیں۔ پھر ان سب کو مختلف رسالوں میں بھیج دیا۔ وہ سب کہانیاں چھپ گئیں۔ یہ سلسلہ چل پڑا اور کراچی منتقل ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری کئی کتابیں شائع ہوئیں اور مجھے ایک بڑے میڈیا ادارے میں اچھی نوکری مل گئی۔

☆

چوبیس سال بعد میں خانیوال پہنچا تو عجیب فکر میں مبتلا تھا۔ فکر یہ تھی کہ میں زندگی میں کچھ کر نہیں سکا' بڑا آدمی نہیں بن سکا' پتا نہیں میرے دوست مجھ سے کس طرح ملیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری ناکامیوں پر ترس کھائیں' یہ بھی ممکن ہے کہ میرا مذاق اڑائیں۔

مگر یہ سب میرا وہم ثابت ہوا۔ دوست ایسے نہیں تھے جیسا میں سمجھتا تھا۔ بدلے بھی نہیں۔ سب دوستوں نے ایسے استقبال کیا جیسے وہ برسوں سے میرے منتظر ہوں۔ ہر کوئی اصرار کرتا رہا کہ میں اس کے گھر پر قیام کروں۔

پہلے دن کئی دوستوں سے ملاقات ہوئی لیکن مجھے رشید کی تلاش تھی۔ وہی رشید جو مجھ سے اچھا لکھاری تھا۔ دوسرے دن میں اسے ڈھونڈتا اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس لیے وہ زیادہ مصروف نہیں تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ میرے گلے لگ گیا' خوش ہو ہو کر حال احوال پوچھتا رہا۔

کچھ دیر بعد میں نے پوچھا "رشید! آج کل تم کن رسالوں کے لیے کہانیاں لکھ رہے ہو؟ اب تک کتنی

اظہار ہمدردی

ریشماں کا منگیتر کافی عرصے سے دبئی گیا ہوا تھا۔ اب شادی کے لیے آنے والا تھا۔ ایک روز ریشماں نے شرماتے ہوئے زرینہ کو بتایا:

"وہ دبئی میں اپنے دوستوں سے کہتا پھر رہا ہے کہ میں شہر کی سب سے خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

"ہائے اللہ۔ یہ تو بہت بُری بات ہے۔" زرینہ فوراً ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ "اتنا عرصہ اس نے منگنی تمہارے ساتھ رکھی اور اب شادی کسی اور سے کرنے جا رہا ہے۔"

(مرسلہ: تنویر حسین، نارووال)

کتابیں چھپ گئیں؟ کس اخبار میں کالم لکھتے ہو گیا؟"

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھتا رہا۔ کہنے لگا "میں نے تو زندگی میں کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی۔"

اب میں حیران رہ گیا۔ میں نے کہا "تم تو بہت اچھے ادیب تھے۔ بچپن میں تمہاری کہانی ایک رسالے میں چھپی تھی۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا "وہ کہانی میری بڑی بہن نے ایک پرانی کتاب سے نقل کی تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی۔ کتابیں لکھنا آتیں تو یہاں دکان پر بیٹھتا؟"

مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اب رشید سے کیا بات کروں۔ اجازت لے کر اٹھا اور اپنے پرانے محلے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں شاہد سے ملاقات ہوئی۔

ہم دونوں گزشتہ روز مل چکے تھے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور میرے لیے میٹھی لسی بنوائی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے میں نے پوچھا "شاہد تم پڑھائی میں بہت اچھے تھے۔ کون سی ڈگری لی اور آج کل کیا کر رہے ہو؟"

شاہد بولا "بھائی میں پڑھائی میں خاک اچھا تھا' بڑی مشکل سے رٹا لگا کر پاس ہوتا تھا۔"

"نہیں' تم ایک بار پہلی جماعت میں اول آئے تھے نا۔"

"وہ تو میری چچی کلاس ٹیچر تھیں' انھوں نے میرے نمبر بڑھا دیے۔ یاد نہیں' اگلے سال دوسری ٹیچر آئی تو میں فیل ہو گیا تھا۔"

"پھر تم نے کس شعبے میں ایم اے کیا؟"

"کون سا ایم اے؟ انٹر کے بعد ابو کے ساتھ آڑھت کے کاروبار میں لگ گیا۔ لسی پیو۔"

لسی پینے کے بعد میری طبیعت بھاری ہو گئی۔ بوجھل قدموں سے اپنی قیام گاہ کی طرف جانے لگا تو راستے میں صابر چوک میں بیٹھا نظر آیا۔ وہی صابر جس سے دوڑ کا مقابلہ ہارنے کے بعد مجھ پر اتھلیٹ بننے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر منہ چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے پہچان گیا۔

"مبشر! میرے دوست! اتنے سال بعد تمھیں دیکھا ہے۔ اکیلے اکیلے کدھر گھوم رہے ہو؟"

"صابر! تم مجھے کیسے پہچانے؟"

"مجھے بھولے نے بتایا تھا کہ تم آئے ہوئے ہو۔ اجنبی صورت دیکھ کر میں نے ذہن پر زور ڈالا تو سمجھ گیا کہ یہ تم ہی ہو سکتے ہو۔ ورنہ تو میں پورے شہر کو پہچانتا ہوں۔"

"صابر! تمھیں یاد ہے دوڑ کا ایک مقابلہ تم نے جیتا تھا اور ایک میں نے۔ پھر میں کراچی چلا گیا۔ تم نے اس کے بعد کتنی دوڑیں جیتیں؟ قومی چیمپئن شپ میں کتنی بار شرکت کی؟"

صابر چپ چاپ میری صورت دیکھتا رہا' جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا جواب دینا چاہیے۔ پھر پشاوری چپل اتار کر اپنا دایاں پیر دکھایا۔ اس کی تین انگلیاں غائب تھیں اور پیر تھوڑا سا مڑا ہوا تھا۔

"ہماری ٹریکٹر ٹرالی الٹ گئی تھی۔ میری جان بچ گئی لیکن یہ پیر اس کی زد میں آ گیا۔ شکر ہے بھائی' اس لاٹھی کے ساتھ چل پھر لیتا ہوں۔ اللہ معذوری سے بچائے۔" وہ کہتا چلا گیا۔

☆

تیرگام سے واپسی کے سفر میں بھی میں رات بھر نہیں سو سکا۔ بس یہی سوچتا رہا کہ ہم زندگی بھر خواہ مخواہ دوسروں سے دوڑ لگاتے رہتے ہیں..... دراصل ہمارا مقابلہ اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ ◆◆◆

بھارتی الیکشن کمیشن کی کامیابی کا راز

80 کروڑ ووٹروں والے مشکل و وسیع انتخابی عمل کے باوجود بھارت کی سیاسی جماعتیں نتائج قبول کر لیتی ہیں

عابد مہدی

پچھلے چند ماہ تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے الیکشن کمیشن آف پاکستان کو نشانہ بنائے رکھا۔ انھیں شکایت ہے کہ دوران الیکشن دھاندلی روکنے کے لیے کمیشن خاطر خواہ اقدامات نہیں کر سکا۔

اسی دوران ہمارے پڑوس میں بھارتی الیکشن کمیشن کے زیر اہتمام پارلیمانی انتخابات کامیابی سے انجام پائے۔ حالانکہ بھارت آبادی اور رقبے کے لحاظ سے پاکستان کے مقابلے میں کئی گنا بڑا ہے۔ سو بھارتی کمیشن کی کامیابی کا راز کیا ہے؟

اس ضمن میں ماہرین کا کہنا ہے کہ بھارتی الیکشن کمیشن آزاد و خود مختار ادارہ ہے۔ اسی آزادی نے اسے ایک طاقتور ادارہ بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے دنوں بھارتی بری فوج کے نئے سربراہ جنرل دلبیر سنگھ کا تقرر بھی الیکشن کمیشن کی اجازت ہی سے ہوا۔

درحقیقت انتخابات کے انعقاد سے دو ہفتے قبل الیکشن کمیشن نے وزارت دفاع کو اجازت دی تھی کہ وہ جنرل دلبیر سنگھ کی فائل اپائنٹمنٹ کمیٹی کو بھجوا دے۔ اس کمیٹی کے سربراہ وزیراعظم من موہن سنگھ تھے۔ مگر کمیٹی

اس ضمن میں کمیشن سے دو ٹوک فیصلہ چاہتی تھی جو بالآخر اسے مل گیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا بھارتی بری فوج کے چیف کی تقرری میں الیکشن کمیشن کا بھی کردار ہے؟ عام حالات میں کمیشن کا اس اہم تقرری سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، مگر جیسے ہی انتخابات ہونے کا اعلان ہو، وہ بھارت کا عارضی حکمران ادارہ بن جاتا ہے۔

امن و امان سے منصفانہ الیکشن کرانے کے لیے بھارتی آئین نے الیکشن کمیشن کو بے پناہ اختیارات دے رکھے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کمیشن دلیری اور بہادری سے یہ اختیارات استعمال کرتا ہے۔ اسی باعث وہ دنیا میں سب سے بڑا انتخابی میلہ بھی کامیابی سے منعقد کرا لیتا ہے۔

بھارت میں 80 کروڑ سے زیادہ ووٹر بستے ہیں۔ پھر لسانی، جغرافیائی اور دیگر مسائل مدنظر رکھے جائیں، تو انتخابات کا عمل دماغ چکرا دینے والی سرگرمی بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھارتی الیکشن کمیشن کامیابی سے انتخابات کراتا ہے۔ اور سبھی امیدوار و جماعتیں انتخابی نتائج تسلیم کر لیتی ہیں۔ اس پر اظہار کرتے ہوئے کوئی عاجلانہ و فوری قدم نہیں اٹھاتا۔

دوسری طرف الیکشن کمیشن پاکستان ہر انتخابات کے موقع پر تنازعات و اسکینڈلز کا نشانہ بن جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ از روئے آئین پاکستان الیکشن کمیشن کو بھی بھارتی کمیشن جیسی خودمختاری اور اختیارات حاصل ہیں۔ تاہم ان کے مابین کچھ فرق بھی ہیں۔

شہاب الدین یعقوب قریشی جولائی 2010ء تا جون 2012ء بھارتی الیکشن کمیشن کے سربراہ رہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: "عدالتیں کسی طور ہمارے کام میں مداخلت نہیں کر سکتیں۔ اس امر کی ضمانت آئین نے دی ہے۔ اسی باعث کمیشن کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ آزادی سے عمل کر سکے۔"

یہی وجہ ہے کہ جب بھی بھارت میں پارلیمانی یا ریاستی انتخابات ہوں، کمیشن افسر شاہی کا کنٹرول سنبھال لیتا ہے۔ یوں سیاسی حکومتوں سے افسر شاہی (بیوروکریسی) کا کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ الیکشن کمیشن اپنی مرضی سے کسی بھی افسر کو کہیں بھی تعینات کر سکتا ہے۔ یوں وہ یقینی بناتا ہے کہ کوئی سرکاری افسر دوران انتخابات کسی سیاسی جماعت کی مدد نہ کر سکے۔ مزید براں ہر علاقے کا سیاست دان مشکوک سرکاری افسروں کے خلاف درخواست بھی دے سکتا ہے۔ اگر کوئی سرکاری افسر جانب دار نکلے، تو اس کا فوراً تبادلہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہو جائے، تو کوئی سرکاری افسر وزیراعلیٰ یا وزرا سے نہیں مل سکتا۔ حتیٰ کہ کوئی افسر ٹیلی فون یا موبائل پر بھی کسی وزیر سے بات کرے، تو الیکشن کمیشن اسے معطل کر سکتا ہے۔ مدعا یہی ہے کہ افسر شاہی دوران الیکشن کسی سیاسی جماعت کی طرف داری اور نہ ہی دھاندلی کر سکے۔

الیکشن کمیشن کی سخت گرفت کے باعث ہی سبھی سرکاری افسر تیر کے مانند سیدھے رہتے ہیں۔ انھیں جرأت نہیں ہوتی کہ وہ کوئی غلط قدم اٹھا سکیں۔ اگر کہیں سے دھاندلی کی شکایات موصول ہوں، تو اس حلقہ انتخابات میں دوبارہ الیکشن ہوتا ہے۔

بھارتی الیکشن کمیشن کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ وہ پارلیمانی انتخابات کرانے کے سلسلے میں کبھی بری فوج سے مدد نہیں لیتا۔ سکیورٹی کی تمام ذمہ داریاں پولیس، رینجرز اور دیگر نیم فوجی دستے انجام دیتے ہیں۔ الیکشن

درویش وزیر اعظم (سید مزمل حسین)

تقسیم ہند کے بعد پاکستان آنے والوں نے بھارت میں اپنی چھوڑی جائداد کے جھوٹے سچے کلیم بھرنے شروع کر دیے اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے بڑی بڑی کوٹھیاں، بنگلے، زمینیں اور جائدادیں الاٹ کروا لیں۔ سب سے زیادہ جاگیریں، کوٹھیاں، بنگلے اور زمینیں آبادکاری کمشنروں نے اپنے بہن بھائیوں اور عزیز و اقارب کو جھوٹے کیس بنا کر الاٹ کروا دیں۔

نواب آف کرنال، پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ خان لیاقت علی خان سے کسی نے کہا کہ آپ بھی اپنی ریاست کرنال کا کلیم داخل کر دیں۔

انھوں نے جواب دیا ''اگر میں کرنال کی ریاست کا کلیم بھر کر اس کے عوض پاکستان میں زمین الاٹ کرا لوں، تو دوسرے پاکستانی کہاں جائیں گے اور انھیں کیا ملے گا۔'' چناں چہ انھوں نے اپنی جائداد کا کلیم داخل نہیں کیا۔

16 اکتوبر 1951ء کی صبح جب نواب زادہ لیاقت علی خان کراچی سے راولپنڈی لیاقت باغ میں جلسے کے لیے روانہ ہوئے، تو وہ اپنی پھٹی ہوئی جرابیں خود اپنے ہاتھ سے سی رہے تھے۔

جب قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہونے کے بعد ہسپتال میں ان کے جسم سے گولیاں نکالنے کے لیے ان کی قمیص اتاری گئی تو انکشاف ہوا کہ ان کی بنیان میں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔

شہادت کے بعد جب وزیر اعظم پاکستان کا بینک اکاؤنٹ چیک کیا گیا، تو اس میں صرف 8 روپے اور 6 آنے پڑے ہوئے تھے۔ آخری وقت میں ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے ''اے اللہ تو پاکستان کی حفاظت فرما۔''

رب کائنات سے میری یہی دعا ہے کہ اے باری تعالیٰ! ہمیں ایسا وزیر اعظم عطا کر جو پاکستان کے عوام کے لیے اپنی کروڑوں اربوں روپے کی جائداد کی قربانی دے سکے۔

''اے باری تعالیٰ! ہمیں ایسا وزیر اعظم عطا کر جس کی بنیان تین جگہ سے پھٹی ہوئی ہو۔''

''اے باری تعالیٰ! ہمیں ایسا وزیر اعظم عطا کر جس کے بینک اکاؤنٹ میں صرف 8 روپے اور 6 آنے پڑے ہوں اور اے باری تعالیٰ! ہمیں ایسا وزیر اعظم عطا کر جس کی زبان پر آخری وقت میں یہ الفاظ ہوں: اے اللہ تو پاکستان کی حفاظت فرما۔''

کمیشن جب بھی ان سیکیورٹی فورسز کی خدمات حاصل کرے، تو وہ اسی کی ''کمانڈ'' میں آجاتے ہیں۔

الیکٹرانک ووٹنگ مشین اپنا لینا بھی بھارتی الیکشن کمیشن کی جدت ہے۔ بھارت میں یہ مشینیں 2004ء سے زیر استعمال ہیں۔ ان کی وجہ سے نہ صرف کمیشن کو کروڑوں بیلٹ پیپر چھاپنے کے خرچے سے نجات ملی بلکہ ووٹ گننے کا عمل بھی گنتی کی طرح آسان بنا دیا۔

تاہم پاکستانی الیکشن کمیشن کے مانند وہ بھی پیسے اور اثر و رسوخ کی طاقت کو کم نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم پیشہ امیدواروں کی بڑی تعداد حالیہ لوک سبھا تک پہنچنے میں کامیاب رہی۔ ان نو منتخب ارکان پر قتل، ڈکیتی، بے حرمتی، چوری اور فراڈ کے مقدمے چل رہے ہیں۔

حالیہ الیکشن میں بھی ہر امیدوار نے جیت کی خاطر بے دریغ پیسا خرچ کیا۔ الیکشن کمیشن نے انتخابی اخراجات کی حد 70 لاکھ روپے رکھی تھی۔ مگر بیشتر امیدواروں نے اپنی انتخابی مہمات پر سات تا دس کروڑ روپے خرچ کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر ممالک کی طرح بھارت میں بھی اب پیسے والے ہی الیکشن جیت سکتے ہیں۔

بھارتی الیکشن کمیشن پر تنقید

حالیہ انتخابات کے دوران بی جے پی اور الیکشن کمیشن خاصی پونچھیں لڑاتے رہے۔ لہٰذا اب مودی

حکومت بن جانے کے بعد خدشہ ہے کہ وہ الیکشن کمیشن کے اختیارات کم کرنے کی سعی کرے گی۔

یشونت سنہا بی جے پی کے سینئر رہنما ہیں۔ واجپائی دورِ حکومت میں وزیرِ خارجہ اور وزیرِ خزانہ رہے۔ کچھ عرصہ قبل مشہور بھارتی نیوز ویب سائٹ این ڈی ٹی وی پر ان کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس میں سنہا صاحب نے مطالبہ کیا کہ بھارتی الیکشن کمیشن کے اختیارات کم کیے جائیں۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

☆

آج کل بھارت پر ایک نیا حکمران..... الیکشن کمیشن حکمرانی کر رہا ہے۔ ابھی لوک سبھا کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ آنے والے دنوں میں راجیہ سبھا (سینٹ) اور کئی ریاستوں کے الیکشن ہوں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ مستقبل میں بھی ملک کے کسی نہ کسی حصے پر الیکشن کمیشن کا راج رہے گا۔

مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی وفاقی یا ریاستی سطح پر انتخابات ہوں، تو حکومتی نظام رک سا جاتا ہے۔ تب الیکشن کمیشن کی منظوری کے بغیر کسی افسر کا تبادلہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی نئی اسکیم پیش نہیں ہو سکتی۔ غرض افسر شاہی یا انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دورانِ انتخابات پھر کام کس طرح ہو؟ مذہبی تقریبات، میلوں، کرکٹ میچوں وغیرہ کے موقع پر انتظامیہ مکمل کر انتظامات نہیں کر پاتی۔ غرض بھارتی الیکشن کمیشن اتنا طاقتور نہیں ہونا چاہیے کہ حکومت کو ہی مفلوج کروا لے۔

ماضی میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ الیکشن کمیشن کی منظوری کے بغیر بعض انتظامی فیصلے کیے گئے۔ مثال کے طور پر میں 1981ء میں وزیرِ اعلیٰ بہار، رام سندر داس کا پرنسپل سیکرٹری تھا۔ اسی دوران لوک سبھا کا الیکشن آ پہنچا۔ سیاسی و انتظامی سطح پر فیصلہ ہوا کہ چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کا تبادلہ کر دیا جائے۔ اس تبادلے پر حسبِ توقع الیکشن کمیشن نے سخت احتجاج کیا۔ مگر ہم نے بھی اپنا قانونی مقدمہ تیار کر رکھا تھا۔ ہم نے کمیشن کو جواب دیا کہ ان دونوں افسروں کا انتخابات سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں۔ سو وہ الیکشن کمیشن کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے۔ الیکشن کمیشن نے ہمارا استدلال قبول کر لیا۔

اسی طرح 1991ء میں وزیرِ اعظم چندر شیکھر نے لوک سبھا میں اپنی حکومت کی تحلیل کا اعلان کیا۔ پھر راشٹرپتی بھون (قصرِ صدارت) کی طرف جانے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے پارلیمنٹ ہاؤس میں واقع اپنے دفتر آئے۔ وہیں ان کی ملاقات مشیرِ خزانہ منموہن سنگھ سے ہوئی۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھے کہ اب ان کا کیا ہو گا؟

چندر شیکھر نے انھیں پریشان دیکھا تو پوچھا کہ وہ ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ مستقبل کے وزیرِ اعظم نے انھیں بتایا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین کی کرسی خالی پڑی ہے۔ وہ اس پر انھیں تعینات کر دیں۔ چندر شیکھر نے الیکشن کمیشن سے رجوع نہیں کیا، بلکہ صدر سے اجازت لی اور منموہن سنگھ کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا سربراہ بنا دیا۔

یہ مثالیں مدِنظر رکھتے ہوئے کانگریسی حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ از خود جنرل دلبیر سنگھ کو بھارتی فوج کا سربراہ بنا دیتی۔ حکومت جتنا زیادہ الیکشن کمیشن کی محتاج ہو گی، وہ ادارہ اتنا ہی خودسر اور طاقتور بن جائے گا۔

اب یہی دیکھیے کہ حالیہ لوک سبھا انتخابات پورے ایک ماہ پر محیط تھے۔ حالانکہ الیکشن کمیشن کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ انتخابات ایک ہفتے میں کرا سکیں۔ یوں خرچہ بھی کم آئے گا۔

◆◆◆

سکالرشپ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا

ادارہ آمنہ جنت نے اپنے پہلے مرحلے کا آغاز حضرت محمد رسول ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہ سکالرشپ کے تحت 125 بچے بچیوں کو سکول کی تعلیم کی فراہمی سے کر دیا ہے ایک بچے کی فیس ماہانہ خرچ کے طور پر 300 روپے فی بچہ کے حساب سے درکار ہیں ہمارے ایک اہل خیر بھائی نے 10 بچیوں کی فیس آئندہ 6 ماہ کے لیے ادا کر دی ہے جزاکم اللہ تعالیٰ!

آپ بھی کسی عظیم ہستی یا اپنے پیارے رشتہ دار کے نام سے سکالرشپ کا اجرا کر سکتے ہیں۔ یہ سکالرشپ نادار بچوں کی تعلیم کے لیے ہوگا اور ایک بچے کے سکول کی فیس اور ماہانہ اخراجات تقریباً 300 روپے ہیں اور ایک سکالرشپ سے کم از کم پانچ بچے مستفید ہو سکیں گے۔ ہمیں جن ناموں سے سکالرشپ ملے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ حضرت آمنہؓ والدہ ماجدہ حضور اکرم ﷺ سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

☆ حضرت عبداللہؓ والد ماجد حضور اکرم ﷺ سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

☆ مسٹر اینڈ مسز مرزا صادق بیگ سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

☆ مسٹر اینڈ مسز محمد شفیق خان سکالرشپ (برائے پانچ طالب علم)

اوپر دیے گئے چار سکالرشپ سے اس وقت 20 نادار بچے سکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند باقی ایک سو پانچ بچوں کا سہارا بنیں۔ ہماری راہنمائی فرمائیں اور دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

ادارہ آمنہ جنت فاؤنڈیشن سکول کے ماہانہ اخراجات

شعبہ انگلش میڈیم کے ایک طالب علم کا ماہانہ خرچ 300 روپے اور سالانہ 3600 روپے

شعبہ تعلیم القرآن کے ایک طالب علم کا تعلیمی ماہانہ خرچ 500 روپے اور سالانہ 6000 روپے

بمع کھانا و دیگر اخراجات فی بچہ ماہانہ -/3500 روپے

ادارہ کی 20 اسٹاف اراکین عملہ کی تنخواہوں، کچن، یوٹیلٹی بلز سمیت سکول کے ماہانہ اخراجات ایک لاکھ پچاس ہزار روپے ہیں۔

صدقات و خیرات و عطیات اور زکوۃ فنڈ؟

ادارہ تمام اہل خیر خواتین و حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ آپ نیک مقصد کی آبیاری کے لیے بھرپور تعاون فرمائیں رمضان المبارک و دیگر ایام میں اپنے صدقات و زکوۃ فنڈ دے کر عنداللہ ماجور ہوں اپنے عطیات بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ شکریہ!

اگر آپ زرتعاون چیک یا ڈرافٹ کے ذریعے ارسال کرنا چاہیں تو چیک ڈرافٹ: آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 02745 ایم سی بی چونیاں برانچ (1240) کے نام بنوائیں۔ آن لائن بھی جمع کرواسکتے ہیں اس صورت میں مطلع ضرور کریں آن لائن کے لیے بینک اکاؤنٹ نوٹ فرمالیں:

نائل اکاؤنٹ نمبر PK86MUCB0673740401002745 ایم سی بی چونیاں۔

آمنہ جنت فاؤنڈیشن ادارہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے ادارے کو دیئے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

مزید رابطہ: پرنسپل رضیہ پروین آمنہ جنت فاؤنڈیشن ماڈل سکول رجسٹرڈ نمبر 5584 چونیاں ضلع قصور

فون نمبر: 0300-4735932-0322-7614497

تاریخ کہانی

شاہِ افغانستان کی واپسی

شاہ شجاع برطانیہ کی انڈس آرمی کے کن مصائب سے گزر کر افغانستان پہنچا؟
غزنی کا مضبوط قلعہ 72 گھنٹوں میں کیسے فتح ہو گیا؟
افغانستان کا طاقتور حکمران امیر دوست محمد کابل سے فرار کیوں ہوا؟
کیا غیر ملکی حملہ آوروں سے نفرت اور بغاوت افغانوں کے مزاج اور کلچر میں شامل ہے؟
پہلی اینگلو افغان جنگ میں جو کچھ ہوا کیا آج افغانستان میں اسی کی ریہرسل نہیں ہو رہی؟
پڑھیے تاریخ کی گتھیاں سلجھاتی پانچویں قسط

پروفیسر محمد فاروق قریشی

قلعہ بالا حصار کابل

پچھلی اقساط کی تلخیص:

افغانستان پاکستان کا شمالی ہمسایہ ملک ہے۔ یہ کوہ ہندوکش کی برف پوش چوٹیوں اور پہاڑی دروں کے درمیان پہاڑی، میدانی اور صحرائی خطوں پر مشتمل ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً 252000 مربع میل ہے اور وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مغربی ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کی آبادی تین کروڑ ہے جو تاجک، ازبک، ہزارہ، درانی، غلزئی اور پشتون قبائل پر مشتمل ہے۔ یہاں آپس کے درمیان قبائلی جھگڑے اور لڑائیاں، روایتی رقابتیں اور جنگجو سرداروں کے درمیان اتحاد بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ محلِ وقوع کے اعتبار سے عالمی بساط پر افغانستان کی اہمیت منفرد ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں افغانستان عالمی استعماری طاقتوں روس اور برطانیہ کے درمیان سرد جنگ کا میدان بن گیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔

1747ء میں احمد شاہ ابدالی نے درانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس میں موجودہ افغانستان، پشاور، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور کشمیر کے علاقے شامل تھے۔ احمد شاہ ابدالی کا تعلق سدوزئی قبیلے سے تھا۔ 1772ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ 1793ء میں تیمور شاہ کے انتقال کے بعد اس کے چوبیس بیٹوں میں جانشینی کی لڑائی چھڑ گئی۔ چنانچہ شاہ زمان، شاہ محمود اور شاہ شجاع نے یکے بعد دیگرے اقتدار سنبھالا۔ شاہ شجاع نے 1803ء سے 1809ء تک افغانستان پر حکومت کی۔ پھر اس کے سوتیلے بھائی شاہ محمود نے سدوزئی مخالف قبیلے بارک زئی سے مل کر شاہ شجاع کو کابل کی لڑائی میں شکست دی اور تخت سے محروم کر دیا۔ شاہ شجاع کچھ غدار ساتھیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گیا اور کشمیر کے گورنر کی قید میں رہا۔ شجاع کی بیوی وفا بیگم سدوزئی حرم اور بچوں کے ساتھ لدھیانہ میں انگریزوں کی عملداری میں پناہ لے چکی تھی۔ اس نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ سے مذاکرات کر کے شاہ شجاع کو کشمیر سے رہائی دلوائی لیکن اس کے بعد رنجیت سنگھ نے شجاع کو لاہور میں نظر بند کر دیا۔ دوران حراست اسے سخت اذیتیں اور مصائب برداشت کرنے پڑے۔ اس کے بیٹے کو باپ کے سامنے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کا گھر اور سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ آخر شجاع نے اپنی سب سے قیمتی متاع کوہِ نور ہیرا اس کے حوالے کر دیا، پھر بھی اسے رہائی نہ ملی۔ مجبوراً شجاع نے اپنے وفادار ساتھیوں کی مدد سے ایک سرنگ کھودی اور اس کے راستے لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد وہ لدھیانہ میں انگریزوں کے مہمان کے طور پر اپنی بیوی وفا بیگم سے جا ملا۔

تیس سالہ جلاوطنی کے دور میں شجاع نے تین مرتبہ اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پہلی مرتبہ اس نے کچھ فوج اکٹھی کر کے کشمیر پر حملہ کیا لیکن ناسازگار موسم اور دشوار گزار راستے کی وجہ سے ناکام رہا۔ دوسری مرتبہ اس نے پھر وفا بیگم کے زر و جواہرات کی مدد سے فوج بھرتی کی اور سندھ کے راستے قندھار پر حملہ آور ہوا لیکن بارک زئی حکمرانوں نے شکست سے دوچار کیا۔ اس کی فوج تباہ ہو گئی اور خود اسے بھاگ کر جان بچانا پڑی۔ تیسری مرتبہ اس نے انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے ساتھ سہ فریقی معاہدے کے ذریعے پشاور پر قبضہ کر لیا لیکن اپنے غیر ضروری تکبر اور شاہانہ رویے کی وجہ سے اپنے اتحادی سرداروں کی ہمدردیاں کھو بیٹھا اور ایک مرتبہ پھر اسے لدھیانہ میں پناہ لینا پڑی۔

شاہ شجاع اپنے کھوئے ہوئے تخت کی بازیابی کے لیے چوتھی اور آخری مرتبہ انگریزوں کی انڈس آرمی کے ہمراہ افغانستان پہنچا۔

انڈس آرمی سخت مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے قندھار پہنچی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی طاقت اور تعداد کے بارے میں مبالغہ آمیز خبروں نے اس کے دشمنوں کا حوصلہ پست کر دیا اور انھوں نے بغیر گولی چلائے جنوبی افغانستان کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ میک نیگٹن اس صورت حال پر بہت خوش تھا کیونکہ اس نے اپنے ناقدین کو مات دے دی تھی۔ اس کے نزدیک شاہ کا عمدہ استقبال اس کی مقبولیت کا ثبوت تھا۔ میک نیگٹن کو یقین تھا کہ اس کی رائے درست اور برنس کا موقف غلط تھا۔ یعنی شجاع تخت کا جائز وارث اور عوام میں ہردلعزیز تھا اور بارک زئی قابل نفرت اور غاصب تھے۔ اس نے قندھار کے محل سے آک لینڈ کو لکھا "ایسا لگتا ہے کہ ہم اچانک جنت

افغانستان پر بالادستی حاصل کرنے کی گریٹ گیم (Great Game) میں روس نے برطانیہ کو سفارتی شکست دے دی اور افغانستان کے طاقتور امیر دوست محمد خان کے ساتھ سفارتی اور فوجی معاہدے کر لیے۔ جواب آں غزل کے طور پر ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے فوجی قوت کے بل بوتے پر جلاوطن شاہ شجاع کو کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر افغانستان کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ 1838ء میں شاہ شجاع اور برطانیہ کی انڈس آرمی کی مشترکہ مہم جوئی کا آغاز کیا گیا۔

منصوبے کے مطابق برطانیہ، رنجیت سنگھ اور شجاع کے درمیان باہمی مدد اور تعاون کا معاہدہ ہوا جسے "اتحاد ثلاثہ" کا نام دیا گیا۔ شجاع نے انگریزوں سے کچھ یقین دہانیاں حاصل کیں کہ فتح کے بعد وہ اس کے خاندانی اور ملکی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور افغانستان کی تعمیرنو کے لیے مالی امداد فراہم کریں گے۔ منصوبے کے مطابق برطانیہ، رنجیت سنگھ اور شجاع کی فوجوں کا فیروزپور میں اجتماع ہونا تھا۔ شجاع کے پاس کوئی فوج نہ تھی چنانچہ عجلت میں فوج بھرتی کی گئی۔ جو غیر منظم افراد کا ایک ہجوم تھا۔ چونکہ یہ دستے مارچ پاسٹ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس لیے شجاع کو ان کے ہمراہ خاموشی سے شکارپور روانہ کر دیا گیا۔

27 نومبر کو سکھ اور کمپنی کی افواج فیروزپور کے میدان میں جمع ہو گئیں۔ یہ بڑا شاندار منظر تھا۔ لارڈ آک لینڈ کی بہنیں ایملی اور فینی ایڈن اس معرکے کی عینی شاہد تھیں اور انھوں نے رنجیت سنگھ کی طرف سے دی گئی دعوت میں مہاراجہ کی دلچسپ شخصیت اور اس کی شراب نوشی کا ذکر کیا ہے۔ رنجیت سنگھ نے آک لینڈ سے پوچھا کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ پھر اس نے آک لینڈ کو بتایا کہ ایک سکھ بیسیوں بیویاں رکھ سکتا ہے اور وہ نافرمانی کی جرات نہیں کر سکتیں۔ آخرکار فوج فیروزپور سے شکارپور کے لیے روانہ ہو گئی۔ فوج کے ساتھ ہزاروں نوکر اور باربرداری کے لیے ہزاروں اونٹ تھے۔ شکارپور میں فوج نے بڑی مہارت سے کشتیوں کا پل تعمیر کر کے دریا عبور کیا اور سندھ اور بلوچستان کے صحرا میں سفر کیا۔ سفر انتہائی مشکل اور مصائب سے بھرپور تھا۔ پانی اور خوراک کی سخت قلت تھی۔ رستے میں بلوچی ڈاکو بار بار لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے تھے۔ آخرکار درہ بولان نظر آ گیا۔ یہاں سخت گرمی تھی۔ راستہ پہاڑی، بنجر اور طویل تھا۔ توپوں اور گاڑیوں کو رسے باندھ کر اوپر چڑھایا گیا۔ حالات اتنے خراب تھے کہ روزانہ آدمی اور جانور ہلاک ہو رہے تھے۔ کئی دستوں میں بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔ درہ بولان سے گزر کر فوج کوئٹہ پہنچی جو اس وقت ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس سے آگے فوج نے ایک اور درہ کھوجک عبور کیا۔ یہاں سرسبز میدان اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ نظر آئے۔ جن کی نگرانی اچکزئی قبیلے کے افراد کر رہے تھے۔ وہ امیر دوست محمد کے حامی تھے اور شجاع کے مخالف تھے۔ جب انڈس آرمی قندھار کے قریب پہنچی تو دوست محمد کا ایک قریبی ساتھی حاجی خان کاکڑ اپنے ساتھیوں سمیت وفاداری تبدیل کر کے شاہ شجاع کے کیمپ میں شامل ہو گیا۔ جب شاہ شجاع قندھار میں داخل ہوا تو لوگوں نے پھولوں کے ہاروں سے اس کا استقبال کیا۔ یہاں شجاع نے اپنے دادا احمد شاہ ابدالی کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور مزار سے ملحق خانقاہ میں رسول پاک ﷺ کے مقدس اونی چغے کی زیارت کی۔ قندھار ایک پُرلطف جگہ تھی۔ موسم، خوراک اور پھلوں کی فراوانی کے لحاظ سے فاقہ زدہ انڈس آرمی کے لیے یہ جگہ جنت سے کم نہ تھی۔

میں اتر گئی ہے۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ قندھار کے علاقے میں مکمل سکون ہے۔ یہ بات حیران کن ہے کہ متفرق آبادی کے اس گنجان آباد شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ شاہ کی حاکمیت بتدریج سارے ملک میں قائم ہوتی جا رہی ہے۔ شاہ کا رویہ بھی بہتر ہوتا جا رہا ہے اور میری رائے اس کے بارے میں نہایت اچھی ہے۔ اس میں ارادے اور توانائی کی کمی نہیں۔ وہ بہت نرم مزاج، ہمدرد، ذہین اور مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ اس کے نقائص میں اس کا شاہانہ تکبر اور کنجوسی زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کا تکبر افغانستان کے سرداروں کو اس لیے بھی برا لگتا ہے کہ اس کے مخالف بارک زئی حکمران اپنے اتحادیوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ عوام اس کے شاہانہ طور طریقوں کے

عادی ہو جائیں گے۔ کنجوس وہ اس لیے ہے کہ اس کے پاس وسائل بہت محدود ہیں اور اس سے شاہانہ فیاضی کی توقعات بہت زیادہ ہیں۔"

8 مئی کو جب بمبئی فوج کے عقبی دستے شہر سے باہر کیمپ میں پہنچ گئے تو میک نیگٹن نے شہر سے باہر عیدگاہ میں شجاع کے لیے ایک شاندار دربار کا اہتمام کیا تاکہ قندھار کے لوگ رسمی طور پر شاہ سے اپنی وفاداری کا اظہار کر سکیں۔ اس موقع پر میک نیگٹن نے پہلی مرتبہ اپنا مکمل سرکاری لباس زیب تن کیا جیسا کہ دورا انگلستان میں ملکہ عالیہ کے دربار میں پہنا جاتا تھا۔ سرالیگزینڈر برنس سادہ سوٹ میں ملبوس

سرولیم میک نیگٹن

افغان سرداروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے افغان سرداروں کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلق استوار کر لیا تھا جس کا دعویٰ کوئی اور یورپی نہیں کر سکتا تھا۔ افغان سردار اپنی پگڑیوں، جواہرات سے مزین ہتھیاروں اور خوبصورت گھوڑوں کے ساتھ شان و شوکت میں سب سے سبقت لے گئے تھے۔ سرداروں کے پیچھے پیچھے جنرل کین، جنرل کاٹن اور جنرل ناٹ آئے۔ وہ ہرات گیٹ سے نکل کر شاہ شجاع کے قطار باندھے دستوں کے درمیان سے گزرے۔ ایک ہندوستانی رجمنٹ کے بینڈ نے برطانوی ترانے اور "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" کی دھنیں بجائیں اور شاہ شجاع کو رسمی طور پر افغانستان کے تخت پر بٹھایا گیا۔ انڈس آرمی کے دستوں نے مارچ پاسٹ کیا۔ ایک سو ایک توپوں کی سلامی دی گئی اور مختصر افغان ہجوم پر ہندوستانی روپے نچھاور کیے گئے۔ بادشاہ سلامت نے حکم دیا کہ غربا کی امداد کے لیے دو لاکھ روپے ان میں تقسیم کیے جائیں۔ شاہ کی عنایات خسروانہ نے عام لوگوں کے دن پھیر دیے اور ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔

شاہ کے کیمپ میں کھاگہمی، رجائیت، فیاضی اور شان و شوکت کے اس مظاہرے کے فوراً بعد ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جو عوام کی نظروں میں شاہ کی بے اختیاری اور زوال کے عمل کا نقطہ آغاز بن گیا۔ محمد حسین ہراتی نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

"ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی کسی کام سے جا رہی تھی۔ ایک غیر ملکی فوجی نشے میں دھت وہاں سے گزرا۔ اس نے لڑکی کو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا قریبی ندی کنارے لے گیا جہاں اس نے اس کے دامن عصمت کو تار تار کر دیا۔ لڑکی کی چیخ پکار سے راہگیر دوڑے اور انھوں نے اس کے اہل خانہ کو اطلاع دی۔ شہر میں سادات اور مذہبی علما پر مشتمل ایک ہجوم نے لڑکی کو اٹھایا اور انصاف کا مطالبہ لے کر بادشاہ یعنی شاہ شجاع کے پاس چلے گئے۔ افغان جو عزت اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس ہیں، صرف افسوس اور معذرت کے اظہار پر مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا "اگر غیر ملکی قبضے کے آغاز میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی کے ساتھ زیادتی ہو سکتی ہے تو آنے والے دنوں میں کسی کی بھی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ یہ واضح ہو گیا ہے کہ بادشاہ محض ایک کٹھ پتلی ہے اور نام کا بادشاہ ہے۔ لڑکی کے

خاندان اور ان کے حامیوں کو برطانوی قوت و جبروت کے مظاہرے سے خاموش کرا دیا گیا لیکن درانی قبیلہ غیظ و غضب سے سلگ رہا تھا کہ ان کی آن اور تفخر کو ٹھیس پہنچائی گئی تھی اور ان کی رگوں میں خون جوش مار رہا تھا۔ ندامت اور غضب ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ حاجی خان کاکڑ جیسے وفادار درانی سردار بھی قبیلے کی اس توہین پر پریشان تھے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے غصے کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ مگر ان کے رویے سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا تھا۔"

سراج التواریخ میں اس واقعے کو مختصرا یوں بیان کیا گیا ہے۔ "غیرت مند افغانوں کے سینوں میں انتقام کے بیج بوئے جا چکے تھے اور بالآخر اس کا بہت خوفناک نتیجہ برآمد ہوا۔ قبائلی راہنماؤں نے سوچنا شروع کر دیا کہ بادشاہ کو صرف اقتدار کا جام چاہیے اسے اپنی نیک نامی کا کوئی خیال نہیں۔ اس واقعہ کے بعد درانی سردار شاہ سے الگ ہو گئے اور کوئی مناسب موقع ملنے تک خفیہ تدبیروں میں مصروف رہے۔" ایک ممتاز زمیندار اور یوسف زئی پٹھان امین اللہ خان لغاری نے اسی منصوبے پر عمل کیا۔ اس کا باپ تیمور شاہ کے زمانے میں کشمیر کے گورنر کا نائب تھا اور اس نے سدوزئی خاندان کے اقتدار میں عروج حاصل کیا تھا۔ بہت سے دوسرے افغانوں کی طرح امین اللہ خان لغاری کو شجاع کی واپسی پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن وہ اس بات پر دہشت زدہ تھا کہ اس نے یہ کام غیر ملکی کافروں کی پشت پناہی سے کیا ہے۔ آبرو ریزی کے اس واقعہ کے بعد وہ کابل چلا گیا جہاں اس نے نواب باغ کو اپنا مرکز بنایا اور انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لیے ہم خیال مجاہدین سے اتحاد قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔

جلد ہی برطانوی فوج کے خلاف مزاحمت کے اکا دکا واقعات شروع ہو گئے۔ دو افسر دریائے ارغنداب پر مچھلی پکڑنے گئے۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو درانی قبیلے کے ایک ہجوم نے ان پر حملہ کر دیا۔ ایک کو خنجر کے وار سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ درہ کھوجک کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ برطانوی چوکیوں اور ڈاک کے ہرکاروں اور پیغام بروں پر حملے بڑھ گئے۔ برطانوی کیمپ کے دو سو غیر فوجی ملازمین کو جنھوں نے واپس ہندوستان جانے کی کوشش کی دھوکے سے پکڑ لیا گیا اور انھیں غیر مسلح کر کے ذبح کر دیا گیا۔ خزانہ، گولہ بارود اور اشیائے خوردونوش لے جانے والے قافلے لڑتے ہوئے درے عبور کرتے اور بھاری جانی و مالی نقصان اٹھاتے تھے۔ سپاہی سیتارام نے محسوس کیا کہ قندھار میں دو ماہ کے قیام کے دوران ہی ماحول میں ڈرامائی تبدیلی آ گئی۔ اس کے بقول "شروع میں ایسا لگا کہ لوگ شاہ کی واپسی سے خوش ہوئے ہیں لیکن وہ اپنے دلوں میں اس سے نفرت کرتے تھے کیونکہ وہ غیر ملکی فوج کے ساتھ واپس آیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس نے انگریزوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے کا راستہ دکھا دیا ہے۔ وہ اسے اسی طرح استعمال کریں گے جس طرح انھوں نے ہندوستان کو کیا اور اپنے قابل نفرت قوانین نافذ کریں گے۔ یہی وہ چیز تھی جس پر وہ غضب ناک تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر شاہ اکیلا اپنی فوج کے ساتھ آتا تو ٹھیک تھا۔ لیکن ان کے غصے میں اضافہ ہو گیا جب انھوں نے دیکھا کہ انگریز فوج ہندوستان واپس نہیں جا رہی۔ اگرچہ انھیں بار بار بتایا گیا کہ برطانوی فوج ان کے ملک پر قبضہ کرنے نہیں آئی لیکن وہ ہندوستان کی تاریخ کو نہیں بھلا سکتے تھے۔"

جلد ہی برطانوی فوجیوں اور سپاہیوں کو احکامات جاری کر دیے گئے کہ وہ گروپ کی صورت میں مسلح ہو کر باہر جائیں۔ یہ پابندی ان کے پورے قیام کے دوران نافذالعمل رہنے والی تھی۔ بے شک برطانوی افسر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ افغانستان میں امن بحال کرنے آئے ہیں اور وہ ملک کے قانونی اور خودمختار حکمران کی ہمایت پر آئے ہیں، لیکن انھیں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ وہ وہاں کتنے غیر مقبول تھے اور جانتے تھے کہ جس لمحے وہ اپنی محفوظ چھاؤنیوں سے باہر قدم رکھتے ہیں ان کے گلے کاٹے جا سکتے ہیں۔ ان بڑھتے ہوئے حملوں کے پیش نظر لارڈ آک لینڈ نے حالات خیز فیصلہ کیا کہ افغانستان میں شاہ شجاع کے تخت نشین ہونے کے بعد بھی برطانوی افواج وہاں قیام کریں گے۔ اس نے لندن کی حکومت کو لکھا "ہمیں کچھ عرصہ شاہ کی حمایت کے لیے وہاں قیام کرنا ہوگا۔"

جب قندھار میں شاہ شجاع کی تخت نشینی کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ پشاور میں کرنل ویڈ اور شجاع کے ولی عہد پرنس تیمور مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے وعدے کے مطابق مسلمان فوج ابھی تک نہیں بھیجی تھی۔ سکھ افسر اٹک کے مقام پر فوجیوں کو دریائے سندھ پار کرانے اور ان کو محفوظ خوراک اور چارہ فراہم کرنے میں عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ویڈ نے پشاور میں پرنس تیمور کا تعارف کرانے کے لیے جو دربار منعقد کیا وہ پرنس کی کمزور شخصیت اور اعتماد کی کمی کے سبب کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑ سکا۔ چناں چہ خیبر کے قبائل پرنس کی فوج کو محفوظ راستہ دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ویڈ کی طرف سے پچاس ہزار روپے کی رشوت اور دوسری ترغیبات بھی مؤثر ثابت نہ ہو سکیں۔ اپریل کے اختتام پر مہاراجا کی طرف سے پشاور کے گورنر کو احکامات بھیجے گئے کہ وہ حملے میں مدد دینے کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک رجمنٹ تیار کرے۔ مئی میں صرف (650) گھڑسوار تیار ہو سکے۔ خیبر کے قبائلی سردار شجاع سے مزید تحائف اور رقوم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پریشان حال ویڈ کی متعدد یاددہانیوں کے باوجود مہاراجا نے کوئی پھرتی نہ دکھائی۔ ایک ماہ بعد ویڈ کو مزید پریشان کن خبر ملی کہ رنجیت سنگھ بیہوشی کے ایک دورے کے بعد 27 جون 1939ء کو اٹھاون سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ مرنے سے پیشتر اس نے آخری کام یہ کیا کہ فراخ دلی سے فیاضانہ عطیات دیے۔ ولیم آسبورن کی رپورٹ کے مطابق اس نے کوہ نور ہیرا ایک گوردوارے کو دے دیا۔ جواہرات کا قیمتی ہار دوسرے کو اور اپنے پسندیدہ گھوڑے قیمتی مرصع سازوں سمیت تیسرے کو دے دیے۔ اس کی چار خوبصورت بیویوں اور پانچ کشمیری باندیوں نے اپنے آپ کو اس کی نعش کے ساتھ جلا کر بھسم کر لیا۔ ان عورتوں کی قربانیوں کے عوض مزارات بنائے گئے۔

شملہ میں ایملی ایڈن قندھار کی فتح کا جشن منا رہی تھی۔ وہ لکھتی ہے "ہماری کل کی رقص پارٹی زبردست ہوگی اور میں نے دوسری چیزوں کے ساتھ ایک نمایاں جگہ پر بڑے حروف میں (Kandahar) لکھ کر چسپاں کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ لیکن اب میں رنجیت سنگھ کی بیویوں کے انجام سے خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ میں ان سے چند ماہ پہلے ملی تھی۔ وہ واقعی خوبصورت اور خوش و خرم تھیں۔ ان جوان اور خوش باش خواتین نے اتنی جرأت سے موت کو گلے لگایا تھا۔ ان کی موت کتنی المناک ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک سو بیویوں کا انجام

صرف ایک بیوی کے قانون سے بہتر ہے کیونکہ وہ زیادہ لگاؤ اور وفاداری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔"

ویڈ کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ مہاراجا کی موت افغانستان کے حملے کے لیے سنگین مضمرات رکھتی ہے۔ رنجیت کے درباری امرا پہلے ہی انگریزوں کے ساتھ اتحاد کے لیے پرجوش نہ تھے۔ اب متنازعہ وراثت کی ممکنہ خانہ جنگی مزید مشکلات پیدا کر دے گی۔ اصل مسئلہ انڈس آرمی کے لیے اسلحہ، خوراک اور رقوم کی ترسیل کا تھا جس میں برطانوی عملداری اور افغانستان کے درمیان پنجاب کے قدیم قلعوں اور سکھ بدامنی سے شدید رکاوٹ پیدا ہو سکتی تھی۔ ایک فوجی مہم جس کی کامیابی پہلے ہی یقینی نہ تھی، مزید مشکلات کا شکار ہونے والی تھی۔

جس دن لاہور میں مہاراجا رنجیت سنگھ کی رحلت واقع ہوئی اسی دن یعنی 27 جون 1839 کو انڈس آرمی نے قندھار سے کابل کی طرف مارچ کیا۔ فوج کو تین یونٹوں میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ دس میل روزانہ کی رفتار سے آگے بڑھتے گئے۔ شجاع نے یقین دلایا کہ جب فوج غزنی پہنچے گی تو اس کے پوپلزئی قبیلے کے لوگ قلعے کا کنٹرول سنبھال کر اس کے دروازے کھول دیں گے۔ تین ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ قندھار میں چھوڑ دیا گیا جس کا برائے نام اختیار شجاع کے بیٹے پرنس فتح جنگ اور حقیقی اختیار جنرل ناٹ کے سپرد کیا گیا تھا۔ شجاع کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرنے والے اکثر درانی سردار قندھار ہی میں مقیم رہے البتہ حاجی خان کاکڑ جو مزید ترقی کا خواہشمند تھا فوج کے ہمراہ تھا۔

ہرات اور غزنی سے پریشان کن خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ ہرات میں انگریزوں کے اتحادی سردار وزیر یار محمد علیکوزئی نے برطانوی سفیر ایلڈرڈ پاٹنگر سے جھگڑا کیا اور اسے قتل کرنے کی کوشش کی حالانکہ پاٹنگر نے شہر میں تیس ہزار پاؤنڈ تقسیم کیے تھے۔ مزید یہ کہ یار محمد نے ایرانی بادشاہ محمد شاہ کے ساتھ خفیہ مذاکرات شروع کر دیے اور اس کو علانیہ یقین دلایا کہ وہ انگریزوں کی نوازشات کے مقابلے میں شاہ ایران سے وفاداری کو ترجیح دیتا ہے۔ اس اثنا میں کابل میں موجود ویڈ کے مراسلہ رسانوں نے اطلاع دی کہ دوست محمد برطانوی پیش قدمی کا مقابلہ کرنے کے لیے غزنی کے قلعے کی مرمت اور فوج کی تعمیر نو میں مصروف ہے۔ اس نے اشیائے خورونوش کا ذخیرہ دریائے کابل کے راستے جلال آباد پہنچا دیا اور کابل کے علما سے شاہ شجاع کے خلاف جہاد کا فتویٰ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اس نے شاہ ایران محمد شاہ کو مکتوب ارسال کیا اور زور دیا کہ انگریزوں کے افغانستان پر قبضہ کرنے سے پہلے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ ہرات پر دوبارہ فوج کشی کریں کیونکہ "ایک کتے کا منہ روٹی کے ایک ٹکڑے سے بند کیا جا سکتا ہے لیکن جب پیٹ بھرا ہو تو ایک ہاتھی بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتا۔" جب ان سرگرمیوں کی اطلاعات برطانوی کیمپ میں پہنچیں تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ دوست محمد پر جتنی جلدی حملہ کر دیا جائے اچھا ہے۔

قندھار سے غزنی تک دو سو میل کے سفر کا آغاز زرخیز اور شاداب ارغنداب وادی سے ہوا جہاں دریاؤں، اناروں اور انگوروں کے باغات اور گہرے سرخ شہتوت اور خربوزوں کی کثرت تھی۔ اس سے آگے غلزئی قبائل کا بنجر خشک پہاڑی علاقہ تھا جہاں کہیں کہیں پوست کے سفید پودے دکھائی دیتے تھے۔ سڑکیں دشوار گزار اور بعض اوقات ناقابل گزر تھیں۔

ولیم ٹیلر نے لکھا "غلزئی قبائل ہمارے آنے کی خبر سن کر متل گارت کے بنے ہوئے قلعوں میں جا چھپے۔ ان کے گھروں میں صرف بوڑھی عورتیں اور بھوکے کتے رہ گئے تھے جنھوں نے غیظ و غضب سے ہمارا استقبال کیا۔ تاہم ہم نے ان کے چھپائے ہوئے اناج اور چارے کے ذخائر دریافت کر لیے۔ ہمیں قریبی ندی نالوں سے پانی بھی دستیاب تھا۔ البتہ ہمارے لیے پریشان کن چیز ٹڈی دل کے جھنڈ تھے جو آسمان کو تاریک کر دیتے تھے اور ان کی مسلسل بھنبھناہٹ ہماری کج خراشی کا باعث تھی۔ ٹڈی دل افغانوں کی پسندیدہ خوراک معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ انھیں آگ پر بھونتے ہیں اور بڑے شوق سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا راشن اتنا اچھا اور متنوع نہیں تھا، پھر بھی ہم اس نعمت سے لطف اندوز ہونے پر مائل نہ ہو سکے۔"

بیس جولائی کو حملہ آور فوج غزنی کے قریب پہنچ گئی۔ پولچرئی قبائلیوں کا منصوبہ کہ وہ قلعے کے دروازے کھول دیں گے، بے نقاب ہو چکا تھا اور ان کی جگہ غلزئی قبائلیوں کو متعین کر دیا گیا تھا۔ غزنی کا قلعہ وسطی ایشیا کا سب سے بڑا اور ناقابل تسخیر قلعہ بن چکا تھا۔ فصیل بلند اور مضبوط تھی جس میں بے شمار برج تھے۔ اس کے چاروں طرف گہری اور چوڑی پانی سے بھری ہوئی خندق تھی۔ بارک زئی غزنی میں سخت مزاحمت کی تیاری کر چکے تھے۔ انگریز فوج کے سامنے ایک دوسرا جبرالٹر مورچہ زن تھا۔ جونہی حملہ آور فوج آگے بڑھی، افغان فوج کے گھڑسوار دستوں اور فصیل سے بھاری توپ خانے نے سخت مزاحمت کی۔ یہ سب کچھ جنرل کین کی اطلاعات کے خلاف تھا جو اپنی بھاری توپیں دو میل پیچھے قندھار چھوڑ آیا تھا۔ قلعے کی دیواریں اتنی بلند تھیں کہ ان کے اوپر چڑھنا ممکن نہیں تھا اور ہلکے توپ خانے کے گولے بالکل موثر نہیں تھے۔

افغانستان میں داخل ہونے کے بعد حملہ آور فوج کی یہ پہلی لڑائی تھی۔ مورخ مرزا عطا نے لکھا ہے "افغان نشانہ بازوں نے اپنے ہتھیاروں کا صحیح استعمال کیا۔ قلعے سے آنے والی ہر گولی خدائی سزا کے طور پر انگریز فوجیوں سے ٹکرائی تھی۔ طویل سفر کی وجہ سے فوجی بھوکے اور جانور اپنے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ شام تک ایک عارضی کیمپ اور مورچے بنا لیے گئے۔ لیکن قلعے سے 'زبر زن' اور 'بارہ بطر' توپوں کے گولے برسائے گئے جنھوں نے فوجیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کو پتنگوں کی طرح ہوا میں اچھال دیا۔"

رات کے وقت فصیل سے نیلی روشنی اور مشرقی پہاڑوں سے دوسرے رنگوں کی روشنی کے سگنل دیے گئے۔ صبح ہوتے ہی دو ہزار گھڑسوار غازی سبز جھنڈوں سمیت کیمپ کے عقب میں نمودار ہوئے اور انھوں نے "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے ہوئے شجاع کی فوج کے مورچوں پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر شجاعت کے جوہر دکھائے حتیٰ کہ وہ چاروں طرف سے گھر گئے۔ بیشتر نے جام شہادت نوش کیا، صرف پچاس آدمیوں نے ہتھیار ڈالے۔ جب ان کو شاہ شجاع کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے اسے "کافروں کا دوست کافر" کہہ کر اس کی توہین کی۔ جب شجاع ان کے سامنے کھڑا غصے سے کھول رہا تھا، ایک غازی نے خفیہ خنجر نکالا اور اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ شجاع کے محافظوں نے اس کو قابو کر کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد سارے قیدیوں کو اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا۔

موہن لال کشمیری برنس کا سیکرٹری اور مشیر تھا۔ وہ

افغانی، اردو، کشمیری اور فارسی روانی سے بولتا تھا۔ وہ بخارا کے سفر میں برنس کے ساتھ تھا۔ اس نے کچھ عرصہ قندھار میں وِیڈ کے سراغ رساں کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ برنس اس پر بہت اعتبار کرتا تھا اور 1939ء کے حملے میں وہ اسے چیف سراغ رساں کے طور پر افغانستان ساتھ لایا تھا۔ گزشتہ روز جب حملہ آور فوج غزنی کے قلعے کے قریب پہنچی تو دوست محمد کے ایک حریف بارک زئی شہزادے عبدالرشید خان نے صدفاصل کو عبور کیا اور اپنے آپ کو موہن لال کشمیری کے حوالے کر دیا جسے وہ قندھار میں اس کے قیام کے زمانے سے جانتا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران موہن لال پر منکشف ہوا کہ قلعے کے تمام دروازے اینٹوں سے بند کیے گئے تھے صرف کابل گیٹ کھلا رکھا گیا تھا تاکہ دوست محمد کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھنے میں آسانی ہو۔ جب برنس نے یہ معلومات جنرل کین کو دیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں سوائے اس کے کہ اسی رات کابل گیٹ پر حملہ کر دیا جائے اس امید پر کہ یہ اچانک حملہ ان کی کمزور پیشگی منصوبہ بندی کا ازالہ کر دے گا۔

نہایت عجلت میں یہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ دشمن کی توجہ ہٹانے کے لیے قلعے کے جنوب میں گولہ باری کی جائے گی تاکہ انجینئرز کا ایک گروپ رینگتے ہوئے کابل گیٹ کو دھماکے سے اڑانے کے لیے دھماکا خیز مواد نصب کر سکے۔ دھماکے کے فوراً بعد وسیع پیمانے پر سپاہی سنگینوں کے ساتھ حملہ کر دیں گے۔ ایسے منصوبے میں خطرات بہت زیادہ تھے لیکن کمانڈران چیف نے کہا کہ اس کے پاس اور کوئی متبادل نہیں اس لیے بھی کہ فوج کے پاس صرف دو تین دن کی رسد موجود تھی۔ دن کا باقی حصہ قلعے کی بیرونی دیواروں کا جائزہ اور کھوج لگانے میں صرف کیا گیا۔ رات کے بارہ بجے فوجی دستوں کو حکم دیا گیا کہ وہ چار بجے صبح جمع ہو جائیں اور اپنی ٹوپیوں کا سفید حصہ اتار دیں تاکہ فصیل کے اوپر سے نظر نہ آ سکیں۔ دو بجے صبح شاہ شجاع کو کابل گیٹ کے بالمقابل پہاڑی پر لے جایا گیا تاکہ وہ وہاں سے غزنی کے قلعے پر حملے کا مشاہدہ کر سکے۔ لیکن جونہی شجاع نے اپنی پوزیشن سنبھالی، قلعے کی فصیل سے توپوں نے آگ اگلنی شروع کر دی۔ شجاع غیر معمولی حوصلے کے ساتھ کسی تحفظ کے بغیر گولہ باری کی زد میں وہاں ڈٹا رہا تاکہ اپنے برطانوی اتحادیوں کو اپنے عزم و استقلال سے متاثر کر سکے۔

قلعے کے جنوبی حصے پر گولہ باری کے شور کے برعکس شمالی سمت میں مکمل خاموشی تھی۔ سپاہی سیتارام کے بقول حکم دیا گیا تھا کہ قلعے کے محافظوں کو دھوکا دینے اور ان کی توجہ ہٹانے کے لیے جنوبی حصے پر لگاتار فائرنگ کی جائے۔ اس رات تیز ہوا چل رہی تھی اور گرد کے بادلوں نے ہر چیز کو چھپا دیا تھا۔ ڈیورنڈ اور اس کے ساتھی انجینئر تاریکی میں رینگتے ہوئے قلعے کی دیوار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ تشویش میں مبتلا تھے کیونکہ میک نیکٹن نے قلعے کے بارے منصوبے کی خبر شجاع کی فوج کے افسروں کو دے دی تھی۔ کامیابی کا انحصار رازداری پر تھا۔ خوش قسمتی سے قلعے کی دفاعی فوج اس حملے سے بے خبر رہی۔ صبح صادق کی سپیدی میں جب ڈیورنڈ گیٹ سے صرف ایک سو پچاس گز دور تھا تو ایک سنتری نے اسے للکارا۔ گولی چلنے کی آواز سے واضح ہو گیا کہ ان کو دیکھ لیا گیا ہے فوری طور پر دفاعی فوج چوکس ہو گئی۔ فصیل سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور اچانک قلعے کی چھت سے نیلی روشنیاں پھوٹ پڑیں جن سے گیٹ کا قریبی حصہ روشن ہو گیا۔ قریبی

دیواروں سے خندق کے پل پر فائرنگ انجینئروں کا نام ونشان مٹا سکتی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ جب فصیل سے ہر طرف فائرنگ کی جا رہی تھی نچلے مورچوں سے پل پر زدی فائر نہیں کیا گیا۔

بارود کے تھیلے گیٹ کے ساتھ رکھ دیے گئے اور ان کے فلیتوں کو سلگا دیا گیا۔ قلعے کے محافظ فصیل کے اوپر چڑھ گئے اور دیوار کے عین نیچے گولیاں برسانے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ پتھر اور اینٹیں بھی گرا رہے تھے۔ جونہی زبردست دھماکا ہوا، انجینئروں نے بھاگ کر خندق میں چھلانگیں لگا دیں۔ بگل کی آواز سنائی دی اور فوجی دستے بریگیڈیئر ولیم ڈینی اور جنرل رابرٹ سیل کی قیادت میں شگاف کے اندر داخل ہو گئے۔ محمد حسین ہراتی پہاڑی پر شاہ شجاع کے قریب موجود تھا۔ اس نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے: "قلعے کا گیٹ اڑا دیا گیا۔ شجاع کے فوجی دستے دوڑتے ہوئے حملہ آور ہوئے اور انھوں نے زبردست لڑائی شروع کر دی۔ دفاعی فوج کے تین سو غازیوں نے تلواریں سونت کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے تین مرتبہ حملہ آوروں کو پیچھے دھکیل دیا۔ لیکن جنرل سیل اور جنرل کین نے اپنے فوجیوں کو اکٹھا کیا اور غازیوں کی شدید مزاحمت پر قابو پا لیا۔ تمام غازیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ قلعے کے کمانڈر دوست محمد خان کے بیٹے غلام حیدر خان کو اس کے ساتھیوں نے دھوکا دیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے انگریزوں سے رشوت وصول کی اور بغیر لڑے بھاگ گئے۔ غلام حیدر خان نے جان کی امان کے وعدے پر ہتھیار ڈال دیے۔

اس کے نتیجے میں قلعے کے تمام محافظوں نے ہتھیار ڈال دیے اور چلا چلا کر "امان" کی درخواست کی۔ کچھ کو قتل کر دیا گیا جب کہ باقی مردوں، عورتوں کو قید کر لیا گیا۔ حملہ آور فوجیوں کو مال و اسباب، مویشی اور دولت لوٹنے اور قتل و غارت کی اجازت دے دی گئی۔ ظلم و ستم اور بربریت کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات پیش آئے۔"

ایک فوجی افسر کیشور لکھتا ہے: "میں نے مرتے ہوؤں کے سامنے ایک بورچی میں تیس سے چالیس لاشیں رکھیں۔ ان میں سے کچھ ابھی تک جل رہی تھیں۔ ایک حملہ آور جماعت نے ایک گھر سے ایک افغان کو باہر نکالا۔ جونہی انھوں نے اپنا منہ موڑا اس کو فوراً ہی ختم کر لیا گیا۔ ایک عورت اور ایک بچہ ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ ہر گھر اور ہر دکان کو لوٹ لیا گیا۔ ہر گلی اور ہر جگہ آدمی جو خون آلودہ ہو، پانچ چھے مولاشوں کو گڑھوں میں پھینک دیا گیا اور

قلعہ غزنی

کم از کم ایک ہزار افغانوں کو قتل کیا گیا۔ زخمیوں کی حالت افسوسناک تھی۔ وہ گولیوں، سنگینوں اور توپوں کا نشانہ بنے تھے۔ صبح نو بجے تک مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ اب مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کا وقت تھا جو فوجیوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ "مرزا عطا رقم طراز ہے۔" انھیں تمام چیزیں باہر نکالنے میں پانچ دن لگے۔ یہاں سے تین ہزار ترکی، عربی، ایرانی نسل کے گھوڑے، کابل، بلخ، بخارا اور بغداد کے دو ہزار اونٹ، تہران اور اصفہان کے تلواری دستے، کشمیر کی سیکڑوں پشمینہ شالیں، ہزاروں پستول، ہزاروں منوں کے حساب سے آٹا، چاول، مکھن، بادام، نمکین پستہ اور کشمش ان کے ہاتھ آئے۔ نیز قندھار محل لائبریری سے ہزاروں فارسی، عربی، سائنس، منطق، ادبی تنقید، قانون اور ریاضی کے قیمتی اور بے مثال نسخے بھی لوٹ لیے گئے۔"

یہ ایک شاندار فتح تھی۔ غزنی کا ناقابلِ تسخیر قلعہ 72 گھنٹے کے اندر فتح ہو چکا تھا۔ ایک ہزار اموات کے علاوہ تین سو افغان زخمی ہوئے اور پندرہ سو قیدی بنائے گئے۔ اس کے مقابلے میں حملہ آور برطانوی فوج کے سترہ فوجی مارے گئے اور 65 زخمی ہوئے۔ اس حملے میں فتح خوش قسمتی کی مرہونِ منت تھی۔ محاصرے والی توپیں پیچھے چھوڑ کر اور ناکافی رسد کے ساتھ پیش قدمی جنرل کین کی فاش فوجی غلطی تھی۔ لیکن انسانی عقل، دانش اور بصیرت کے خلاف بعض اوقات جنگ ایسی مثالیں پیش کرتی ہے۔ جہاں خدائی ارادے کے نتیجے میں انسانی غلطی شاندار اور حیرت انگیز کامیابی میں بدل جاتی ہے اور جنرل کین کی غلطی نے ایسا ہی ثابت کیا تھا۔

21جولائی 1839ء کو غزنی فتح ہوا۔ کابل میں دوست محمد کو اڑتالیس گھنٹوں کے اندر غزنی کی شکست کی خبر مل گئی۔ اس نے ملک کے سب سے بڑے قلعے کو مضبوط بنانے پر تین ماہ صرف کیے تھے اور یہ صرف تین گھنٹوں کے اندر کافر حملہ آوروں کے ہاتھوں فتح ہو گیا تھا۔ آئندہ چند دنوں میں اسے مزید بری خبریں ملیں جنھوں نے اس کے اعتماد کو منتشر کر دیا اور اس کے حامیوں کے عزم و استقلال میں دراڑ پیدا کر دی۔ پہلی ناخوشگوار خبر یہ تھی کہ اس کا سب سے پیارا اور فعال بیٹا اکبر خان جسے اس نے ویڈ اور پرنس تیمور کی پیش قدمی روکنے کے لیے درہ خیبر کی حفاظت پر متعین کیا تھا۔ اچانک بیمار پڑ گیا۔ افواہ تھی کہ اس کو زہر دیا گیا ہے۔ جب دوست محمد نے اپنے لختِ جگر کو اس حالت میں دیکھا تو غم کی شدت نے اس کا دل چیر دیا اور وہ مایوسی سے اپنا سر پیٹنے لگا۔ اکبر خان کی بیماری نے دوست محمد کے جذبے اور عزم و ہمت پر برا اثر ڈالا تو دوسری طرف اس کی بیماری نے ویڈ کو درہ خیبر عبور کرنے کا وہ موقع فراہم کر دیا جس کا وہ منتظر تھا۔ اگرچہ اس کے پاس صرف پانچ ہزار سپاہی تھے اور مقامی قبائل اس حملے کے خلاف تھے لیکن وہ بڑھتے رہے۔ علی چوٹی کے نیچے علی مسجد پر قبضہ کر لیا اور جلد ہی اس کے آدمی جلال آباد کی طرف مارچ کر رہے تھے۔ بیمار اکبر خان کو فوری طور پر جلال آباد سے ایک چارپائی پر محفوظ جگہ منتقل کرنا پڑا۔

غزنی اور علی مسجد کی فتوحات نے ملحق قبائل پر بھی اثر ڈالا۔ کابل سے پانچ میل دور استالیف میں کوہستانی تاجک اپنے مذہبی راہنما اور پل خشتی مسجد کے امام میر حاجی کی قیادت میں بارک زئی حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوست محمد نے اپنے بھائی فاتح خان کے دور میں بہت سے کوہستانی سرداروں کو قتل کرایا تھا۔ اب تبدیل شدہ حالات میں اور ویڈ کی طرف سے مالی

ترغیبات کی وجہ سے میر حاجی نے اپنے قبائلیوں کو بیس سال پرانے خون کا انتقام لینے پر تیار کر لیا۔ انھوں نے کوہستانی کے بارک زئی گورنر اور دوست محمد کے سب سے بڑے سردار شیر علی خان کو اس کی گارے کی حویلی میں محصور کر لیا اور اس کے گرد شکنجہ کس دیا۔ جلال آباد اور غزنی کی طرف سے بڑھتی ہوئی افواج اور عقب میں کوہستانی بغاوت نے دوست محمد کو حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ مخالفین سے مذاکرات کے لیے تیار ہو گیا۔

دوست محمد کا سوتیلا بھائی نواب جبار خان کابل کے سرداروں میں سب سے زیادہ انگریزوں کا حامی سمجھا جاتا تھا۔

امیر دوست محمد خان

اس نے برنس اور چارلس میسن کی میزبانی کی تھی اور اپنے بیٹے کو وید کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے لدھیانہ بھیجا تھا۔ مزید برآں گزشتہ سال روسی سفیر وکی وچ کے مقابلے میں جبار خان نے اپنے بھائی کو انگریزوں کی طرفداری پر قائل کرنے کے لیے کافی محنت کی تھی۔ جبار خان سمجھوتے کی پیشکش کے ساتھ غزنی گیا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ شاہ شجاع کو بطور بادشاہ قبول کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ دوست محمد کو بطور وزیر حکومت میں شامل کیا جائے۔ اس کا بھائی فتح خان اور باپ پائندہ خان بھی سدوزئی کے حکمرانوں کے وزیر رہ چکے تھے۔ لیکن جبار خان بہت حیران و پریشان ہوا جب برطانوی افسروں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس کو مزید صدمہ اس وقت پہنچا جب انھوں نے اس کی بھتیجی اور غلام حیدر خان کی بیوی کو رہا کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس طرح انگریز اپنے غیر دوستانہ رویے کی وجہ سے ایک ہمدرد دوست سے محروم ہو گئے۔ رخصت کے وقت نواب نے ان سے کہا "اگر شجاع واقعی ایک بادشاہ ہے اور اپنے آباؤ اجداد کی مملکت میں واپس آیا ہے تو آپ کی فوج کی کیا ضرورت ہے؟ آپ اس کو اپنی دولت اور اسلحے کے بل پر افغانستان لے آئے ہیں۔ اب اسے افغانوں کے حوالے کر دو اور اگر وہ کر سکتا ہے تو اسے ہم پر حکومت کرنے دو۔"

چونکہ مذاکرات ناکام ہو چکے تھے دوست محمد کے پاس صرف ایک راستہ کھلا تھا۔ اس نے کابل میں اپنے حامیوں کو تیمور شاہ کے نامکمل مزار کے گرد باغات میں جمع کیا اور ان کے سامنے ایک جذباتی تقریر کی۔ "تم لوگوں نے پچھلے تیرہ سال میرا نمک کھایا ہے اس کے بدلے میں مجھ پر یہ عنایت کرو کہ مجھے عزت کی موت مرنے دو۔ فتح خان کے بھائی کا ساتھ دو تا کہ وہ فرنگی کتوں کی گھڑ سوار فوج پر ایک آخری حملہ کر لے۔ اگر وہ اس حملے میں ناکام ہو جائے تو تم جا کر شجاع کے ساتھ اپنے معاملات طے کر سکتے ہو۔" جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف قزلباش رہنما خان شیریں خان نے جواب دیا۔ دوست محمد کی ماں قزلباش قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے امید تھی کہ یہ قبیلہ اس کا ساتھ دے گا۔ لیکن دوسروں کی طرح قزلباش سردار نے بھی ہوا کا رخ پہچان لیا تھا۔ مولانا حامد شاہ کشمیری کے اکبر نامہ کے مطابق افغان سرداروں نے کہا "ایک جائز اور قانونی بادشاہ کے مقابلے میں وہ امیر کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ شاہ اور امیر میں فرق ہے۔ شاہ سے بغاوت نہیں کی جا سکتی۔"

دوست محمد اپنے ساتھیوں کی بیوفائی پر بہت دل برداشتہ ہوا۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں اس نے اپنے قبیلے کے پندرہ سو وفاداروں کو ساتھ لیا اور بامیان کے راستے "خلم" کی طرف فرار ہو گیا۔ اکبر نامہ بیان کرتا ہے۔ (ترجمہ)

جب صدہا دوستوں میں سے کوئی ساتھ نہ دے
جب وفا کی جگہ بے وفائی عام ہو جائے
صد افسوس! فرنگی اس ملک پر حکومت کرے گا
وہ اپنا قانون اور تہذیب نافذ کرے گا
کوئی یہاں عزت و غیرت سے نہ جی سکے گا
ظلم و ستم اور بدنصیبی سے نہ بچ سکے گا
کافر کی مدد سے جو یہاں حکومت کرے گا
اس بے غیرت شاہ کا قتل کار ثواب ہو گا

3 اگست 1839ء کو دوست محمد کے کابل سے فرار ہونے کی خبر برطانوی کیمپ میں پہنچی۔ اس کے بعد فوج کو کابل پہنچنے میں صرف تین دن اور لگے۔ 7 اگست کے دن انڈس آرمی شاہ شجاع کی قیادت میں افغان دارالحکومت میں داخل ہو گئی۔ شجاع نے خیرہ کن تاج، جواہرات سے مزین پیٹی اور بازوبند پہن رکھا تھا۔ میک نیگٹن نے بھی انتہائی پرتکلف اور چمکدار لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ شاہ شجاع تیس سال بعد بالا حصار میں تیموری محل میں داخل ہو رہا تھا۔ گلیاں اور بازار خاموش عوام سے بھرے ہوئے تھے جو شاہ کے گزرنے پر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن استقبال کی مسرت اور ہنگامہ مفقود تھا۔ جارج لارنس کے بقول کابل کے عوام نے شاہ کی واپسی پر مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ایک اور نوجوان افسر کا تبصرہ نہایت چشم کشا ہے۔ "یہ اپنی بحال شدہ مملکت کے دارالحکومت میں کسی شاہ کے داخلے سے زیادہ ماتمی جلوس معلوم ہوتا تھا۔" بظاہر عوام کے دل اور ان کی ہمدردیاں اپنے سابق حکمران کے ساتھ تھیں۔ صرف شاہ شجاع نے اپنے محل اور باغات میں داخل ہو کر مسرت کے جذبات کا اظہار کیا۔ جب وہ محل کی بالائی منزل پر چڑھا اور اس نے چاروں طرف پھیلا ہوا کابل دیکھا تو اس کا جوش و مسرت قابل دید تھا۔ اسے اپنے تیس سالہ خواب کی تعبیر بالآخر مل گئی تھی۔ وہ محل کی حالت زار پر رنجیدہ ضرور تھا لیکن آخرکار اپنے وطن اور اپنے گھر پہنچ کر بے حد خوش تھا۔

لندن میں شاہی خاندان ملکہ وکٹوریا کے عہد حکومت میں پہلی فوجی مہم کی کامیابی اور کابل کی آسان فتح پر بے حد خوش تھا۔ لندن کے معاشرے میں "معرکہ غزنی" (The Storming of Ghuznee) کے نام سے ایک نیا تیز رقص رائج ہو گیا۔ نوجوان ملکہ نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ یہ فتح "وسطی ایشیا پر قبضہ" کے مترادف ہے۔ انگریز سیاستدانوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ عملی طور پر یہ طے ہو چکا ہے کہ برطانیہ یا روس میں سے کون "ایشیا کا مالک" ہو گا۔ وزیراعظم میلبورن نے شاہ شجاع کی بالا حصار واپسی پر کہا کہ اب افغانستان کا اصل بادشاہ میک نیگٹن ہو گا۔ برطانوی حکومت نے میک نیگٹن، وِیڈ اور کین کو بیرن (Baron) یعنی لارڈ جب کہ آک لینڈ کو ارل (Earl) کے خطابات عطا کیے۔ شملہ میں بھی مہم کی کامیابی پر زبردست مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ ایملی ایڈن کے مطابق "اس عظیم ترین فتح کا جشن منانے کے لیے گورنر جنرل کی طرف سے شاندار رقص و سرود کا اہتمام کیا گیا۔ ساری جگہ کو تصاویر اور پھولوں سے سجایا گیا۔ شملہ میں موجود تمام افراد نے

تقریب میں شرکت کی۔"

کابل میں بھی فتح کا جشن منایا گیا جس میں سدوزئی کے حامیوں اور انعامات اور ترقیاں حاصل کرنے کے خواہشمندوں نے شرکت کی۔ شاہ شجاع نے بالا حصار میں اپنا پرانا دربار بحال کر لیا اور اپنی جلاوطنی کے وفادار ساتھی ملا شکور کو چیف آف اسٹاف مقرر کیا۔ اپنے دیرینہ دوست کرنل ویڈ کو خصوصی خلعت عنایت کی۔ شاہ نے اعلان کیا کہ جس طرح انگریزوں نے اس کی طویل جلاوطنی میں اس کے ساتھ احترام اور مہربانی کا سلوک کیا اس کے بدلے میں اس کے اور اس کے وارثان کی طرف سے ان کے ساتھ وفاداری اور شفقت روا رکھی جائے گی۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ معاملے کا موازنہ شہنشاہ ہمایوں سے کیا جس نے ایران کے صفوی دربار میں پناہ لی تھی اور اس کی مدد سے اپنی مملکت کو دوبارہ حاصل کیا تھا۔ شجاع نے اپنے تمام مخالفین خصوصاً بارک زئی خوانین کے لیے عام معافی اور ان کی جاگیریں بحال کرنے کا اعلان کیا۔ نواب زمان خان بارک زئی اور بہت سے دوسروں نے اس مصالحتی پیشکش کا فائدہ اٹھایا اور اپنے سابق مراتب پر بحال ہو گئے۔

1839ء میں مفتوحہ کابل ایک ترقی یافتہ اور خوشحال شہر تھا۔ پھلوں سے لدے باغات کی کثرت تھی۔ تقریباً ستر ہزار آبادی کا یہ شہر پورے وسط ایشیا کا سب سے بڑا کاروباری اور تجارتی مرکز تھا۔ تجارتی قافلوں کی محفوظ گزرگاہ تھا۔ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ رواداری کی وجہ سے یہ سندھی تاجروں اور ساہوکاروں کا بڑا مرکز بن چکا تھا۔ وہاں جارجیا اور آرمینیا سے تعلق رکھنے والے اور یہودی تاجروں کے متمول خاندان بھی آباد تھے۔ امیر تاجروں، جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کی بڑی بڑی حویلیاں جن کے اندر کئی منزلہ مکانات، لکڑی کے شاندار دروازے، آنگن کے درمیان اُبلتے ہوئے فوارے، پھل دار اور سایہ دار درختوں کے نیچے بچھے قالینوں پر شام کے اوقات میں قہوہ پیتے اور موسیقی اور فارسی شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خوانین معمول کے مناظر تھے۔ ان گھروں کے درمیان اینٹوں سے بنے پُر رونق بازاروں میں تجارتی سامان سے بھری دکانیں دکھائی دیتی تھیں جب کہ شالوں، مسالا جات اور عطر گلاب، بخارا کے ریشمی کپڑوں، روسی چائے، لکھنو کے نیل، تاتاری فر، چینی برتنوں اور مشہور زمانہ اصفہانی خنجروں کی خرید و فروخت کے لیے الگ الگ گلیاں تھیں۔ دکانوں میں اشیائے تجارت فرش سے چھت تک بھری رہتی تھیں۔ گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار کو پُرہجوم گلیوں سے گزرنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ اچانک کسی سردار کا پیادہ ہراول دستہ ہجوم کو ایک طرف دھکیل دیتا تھا۔ اس کے بعد سردار اپنی سواری پر فخریہ انداز میں گزرتا اور اس کے تعاقب میں نیزے اور بندوقیں لہراتا گھڑ سوار دستہ ہوتا۔ آخر میں شاہ کے ہاتھی آہستہ خرامی سے گزرتے۔ گلیوں کی اس بھیڑ میں پانی والے کی آواز بھی سنائی دیتی جو چمڑے کی مشک اور تانبے کے پیالے کے ساتھ "آب، آب" پکارتا۔ اندھے بھکاری قطار میں یک زبان ہو کر بھیک مانگتے۔"

انگریز فوجی کابل کی چمک دمک سے بہت مسحور ہوئے۔ وہ خاص طور پر چھتے ہوئے چھتا بازار کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے جو 1640ء میں شاہ جہان کے گورنر علی مردان خان نے تعمیر کرایا تھا تقریباً اسی وقت جب آگرہ میں تاج محل تعمیر کیا جا رہا تھا۔ انگریز فوجیوں نے پانی کے

غدہ تالابوں اور حوضوں کی تعمیر، جنت نظیر باغات، دارالحکومت کی شایان شان عمارات، سازوسامان سے بھری ہوئی دکانوں کی تعریف کی۔ انھوں نے افغانستان پہنچنے کے لیے راستے کی سختیوں اور صعوبتوں کو برداشت کیا تھا۔ یہاں ان کو کھانے پینے کے لیے گوشت، چاول، کباب اور ہر قسم کے پھل دستیاب تھے۔ سفر کی نیم فاقہ زدہ زندگی کے بعد اب ان کو بھرپور خوراک اور میوہ جات کھانے کو ملے اور وہ جلد ہی موٹے تازے ہو گئے۔

کابل میں ان کی تمام خواہشات کی تکمیل آسانی سے ممکن تھی۔ انھوں نے وہاں کے لوگوں کو گھڑ دوڑوں سے متعارف کرایا اور خود مرغ بازی اور بٹیر بازی جیسے مشاغل پر جوا بازی میں شریک ہونے لگے۔ افغانوں نے کرکٹ کے کھیل میں دلچسپی نہیں لی البتہ انھوں نے مزاحیہ تھیٹر ڈراموں کو بہت پسند کیا۔ موسم سرما میں فوجیوں کو بھیڑ کی کھال کے گرم کپڑے اور دستانے مل گئے۔ انھوں نے یہ موسم شکاری کتوں کی مدد سے گیدڑ کے شکار، اسکیٹنگ اور جھیل پر پکنک مناتے گزارا۔ موسم اکثر صاف اور خوبصورت ہوتا تھا۔

شجاع نے بالا حصار میں اپنے دربار اور محل کی مرمت اور تزئین نو کروائی۔ مغل باغات میں دوبارہ پودے اور پھول کاشت کروائے گئے اور لدھیانہ سے آنے والی سدوزئی خواتین کے لیے نیا حرم سرائے تیار کروایا گیا۔ درباری رسوم و رواج کو جنھیں بارک زئیوں نے ترک کر دیا تھا درانی دربار کی شان و شوکت کے مطابق پورے تکلفات کے ساتھ بحال کر دیا گیا۔ سیکڑوں وردی پوش افسر دربار میں حاضر رہتے۔ شجاع خود بھی کندھوں سے لٹکتے ہوئے لمبے چغے میں ملبوس ہوتا جو جواہرات سے مزین ہوتا۔ وہ سفید سنگ مرمر کے ہشت پہلو تخت پر براجمان سائلوں کی فریادیں سنتا اور صرف انگریز افسروں کے استقبال کے لیے نشست چھوڑ کر کھڑا ہوتا۔ برٹش آرمی کے دستوں کی ہندوستان واپسی شروع ہونے سے پہلے شجاع نے منتخب انگریز افسروں کو سب سے بڑا اعزاز Order of the Durrani Empire) عطا کیا۔ نومبر میں پہلی رجمنٹ واپس شملہ پہنچ گئی۔ ایملی ایڈن کے بقول تمام فوجی جوان اور افسر پہلے سے زیادہ موٹے تازے نظر آ رہے تھے۔

فرار دوست محمد خان اپنے ساتھیوں سمیت پوری رفتار سے شمال کی طرف پا بہ رکاب تھا۔ تیس سال قبل کابل کی لڑائی میں شکست خوردہ شجاع کی طرح، دوست محمد کو بھی متواتر مصائب اور ذلتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کے نتیجے میں وہ تقریباً تباہی اور موت کے منہ میں پہنچ گیا۔ برطانوی فوج کے دو افسر حاجی خان کاکڑ کی راہنمائی میں شجاع کے ایک ہزار گھڑ سواروں کے ساتھ دوست محمد کا سرگرمی سے تعاقب کر رہے تھے۔ دوست محمد کا بیٹا اکبر خان مشتبہ زہر خورانی سے ابھی صحت یاب ہو رہا تھا۔ چونکہ وہ سواری نہیں کر سکتا تھا اس لیے اسے چارپائی پر لے جانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ خواتین، بچوں، بیٹوں، بھائیوں اور ملازموں کا ایک جلوس بھی ہمراہ تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر دوست محمد کا سفر سست روی کا شکار تھا۔ غلام کوہستانی اپنے جنگ نامہ میں رقمطراز ہے۔ (ترجمہ)

ہزار گھڑ سواروں کے ہمراہ بہادر دوست محمد خان
گرد کے طوفان اڑاتا بڑھتا چلا گیا
عقب میں تھے نازنینان حرم اور مال و منال
چاروں طرف تھے سنتری چوکس اور تیار
تعاقب میں تھے خون کے پیاسے اور تیز رفتار
مانند ابر اڑتے تھے دن رات ان کے راہوار

انگریز افسر اپنی تمام تر برق رفتاری کے باوجود امیر دوست محمد تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ حاجی خان کاکڑ تاخیری حربے اور افغان گھڑسواروں کا باغیانہ رویہ بھی اس ناکامی کا سبب بنا۔ بالآخر یہ تعاقب ترک کر دیا گیا۔ امیر دوست محمد ازبک سردار میر ولی کے محفوظ قلعے خامرد پہنچ گئے جہاں امیر نے اگلے دو ماہ ازبکوں کی مہمان نوازی کا لطف اٹھایا۔ میر ولی شاہ شجاع کا دشمن تھا۔ یہاں سے وہ بلخ پہنچا جہاں گورنر نے ایک خوبصورت مہمان خانے میں اس کا استقبال کیا۔ اسی اثنا میں بخارا کے حکمران نصراللہ خان نے امیر کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ دوست محمد نے اپنے بیٹے اکبر خان کے ہمراہ اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکز بخارا کا سفر کیا جہاں اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ اسے اور اس کی رہائش کے لیے ایک محل دیا گیا اور وظیفہ بھی مقرر کر دیا گیا۔ لیکن یہ ہنی مون صرف چند ہفتے قائم رہ سکا۔ سبب واضح نہیں لیکن دوست محمد کا اپنے میزبان کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور تلخ جملوں کے تبادلے کے بعد بارک زئی بخارا سے رخصت ہو گئے۔ تند مزاج اور بے رحم نصراللہ خان نے راستے میں دوست محمد اور اس کے بیٹوں کو دریائے آکسس میں ڈبونے کی سازش کی جو ناکام ہو گئی۔ دوست محمد نے دریا عبور کرنے سے انکار کر دیا اور بخارا کی طرف واپسی کا قصد کر لیا۔ راستے میں برفباری کے شدید طوفان نے آلیا جس نے ان سب کو موت کے کنارے پر پہنچا دیا۔ بڑی مشکلوں سے وہ جان بچا کر بخارا پہنچا۔ امیر بخارا نے ان کا وظیفہ بند کر دیا۔ اس کے نتیجے میں بارک زئی گروہ کے سترہ افراد نے وہاں سے راہ فرار اختیار کر لی۔ امیر بخارا نے ان کے تعاقب میں سات ہزار گھڑسوار روانہ کیے اور انھیں زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ چراغ چی کے مقام پر افغانوں اور بخارا والوں میں تصادم ہو گیا۔ افغانوں نے حتی المقدور مقابلہ کیا اور کافی خون خرابہ ہوا۔ لیکن گولہ بارود ختم ہونے کے بعد افغان مغلوب ہو گئے۔ افضل خان اور اکبر خان لڑائی میں زخمی ہو گئے۔ بہت سے دوسرے مارے گئے یا شدید زخمی ہوئے۔ بخارا والے دوست محمد اور اس کے آدمیوں کو قیدی بنا کر واپس شہر لے گئے جہاں امیر کے حکم پر ان سب کو ایک تاریک تہ خانے میں پھینک دیا۔

نومبر 1839ء میں جب کابل کے بازاروں اور دریائے کابل کے کنارے پودوں پر برف جم گئی تو شاہ شجاع بالا حصار کو چھوڑ کر جلال آباد منتقل ہو گیا جسے اس نے اپنا سرما کا دارالحکومت قرار دیا۔ میک نیکٹن شجاع کے ساتھ جلال آباد چلا گیا۔ ملا شکور کو کابل کا نگران منتظم بنا دیا گیا۔ اس کی مدد کے لیے برنس وہاں موجود تھا۔ سال کی آخری رات برنس نے انگریز اور افغان مہمانوں کے لیے ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا۔ کیپٹن جیمز لین جو ایک ہفتے کے لیے قندھار سے کابل آیا تھا پارٹی کی تعریف کرتا ہے اور برنس کو ایک خوشگوار، شائستہ اور دلچسپ شخصیت قرار دیتا ہے۔ کابل ان دنوں باغات کا شہر ہونے کی وجہ سے جنت سے کم نہیں تھا۔ جی آر گلیگ کی رائے میں کابل کے لوگ انفرادی طور پر برطانوی افسروں کو پسند کرتے تھے۔ وہ افغان سردار کا حوالہ دیتا ہے جس نے کہا "ہماری خواہش ہے کہ آپ لوگ دشمن کے بجائے دوست کے طور پر یہاں آتے کیونکہ انفرادی طور پر تم بہت اچھے لوگ ہو اگرچہ بطور قوم تم لوگوں سے ہم نفرت کرتے ہیں۔"

عرضی

اسکول جانے والے دیہاتی لڑکے کا دردناک قصہ جبرِ معاش نے اس کی معصوم تمناؤں کا خون کر دیا

نیلوفر اقبال

بشیر کے باپ نے اس کی ساری کتابیں پھاڑ دیں۔ اسے خوب مارا۔ پھر کمرے میں بند کر دیا۔ وہ درد سے بڑی دیر تک روتا رہا۔

ماں دروازے کے باہر کھڑی اسے سمجھاتی رہی۔ ماں تھی، اسے مار پڑتی دیکھ کر بے چین ہو گئی۔ اگر وہ باپ کی بات مان لیتا تو مار نہ پڑتی۔ "ضد نہ کر پتر! ابا ٹھیک کہتا ہے۔ میرا بچہ! باپ کا کہنا مان لے۔ پھر میں تجھے باہر نکالوں گی... دیکھ تیرے لیے پراٹھا پکایا ہے۔"

پراٹھے کا نام سن کر گھٹنوں سے بھوکے بشیر کی ضد کمزور پڑ گئی۔ اسے لگا شاید ابا ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ضد کا کیا فائدہ؟ پراٹھا تو کھانے کو ملے گا۔ "اچھا بے بے! کھول دروازہ۔"

ماں نے جلدی سے دروازہ کھول کر اسے پچکارا۔ اپنی چادر سے اس کا منہ اور ناک صاف کیے۔ پیشانی سے بال ہٹا کر چوما اور کہا "پتر! ضد نہیں کرتے باپ کے ساتھ، میرا سوہنا۔"

ماں نے واقعی پراٹھا پکا کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے کٹوری میں گھی گرم کر کے شکر ڈالی اور بشیر کے سامنے رکھ دی۔ "حلوہ بنا دوں ساتھ؟"

بیٹے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماں جلدی جلدی حلوے کے لیے ضروری چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔ وہ شکر کے ساتھ پراٹھا کھاتا رہا لیکن ابا کی بات مان کر بڑا ہی اداس تھا۔

اسے اپنے اسکول سے بڑا پیار تھا۔ وہ صبح سویرے شوق سے اٹھ کر تیار ہوتا۔ بھاگا بھاگا اسکول جاتا۔ وہ شروع سے جماعت میں اول آ رہا تھا۔ ماسٹر سے روز شاباش ملتی۔

تب اسے بڑا مزہ آتا۔ ماسٹر نے اسے مانیٹر بنا دیا تھا۔ اکثر گرمیوں کی دوپہروں میں ماسٹر صاحب کو نیند آنے لگتی تو بشیر کو سبق سمجھا کر کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ بشیر جماعت کے سامنے کھڑا لڑکوں کو پہاڑے یاد کراتا یا کوئی دوسرا سبق یاد کرا دیتا۔ وہ آگے آگے بولتا، لڑکے پیچھے پیچھے زور زور سے دہراتے۔

یہ آوازیں لوری کا کام دیتیں اور ماسٹر صاحب آہستہ آہستہ میٹھی نیند میں کھو جاتے۔ ٹوپی ان کی ناک پر سرک آتی۔ بشیر خاص خیال رکھتا کہ جماعت میں بے ہنگم شور نہ ہو تاکہ ماسٹر صاحب سکون سے محو خواب رہیں۔ بشیر کو ان سب باتوں میں بڑا مزہ آتا۔ اسی لیے وہ پوری شام سبق یاد کرتا۔ اگلے دن باقی بچے اٹک رہے ہوتے بلکہ کئی تو پڑھ بھی نہ پاتے اور بشیر فر فر سبق سنا دیتا۔ پھر آدھی چھٹی کے وقت کھیلوں میں کتنا مزہ آتا تھا۔ وہ کھیلوں میں بھی دوسرے لڑکوں کا نمبر کاٹتا اور سب سے تیز دوڑتا۔

چودھریوں کا لڑکا بھی اسی جماعت میں تھا۔ وہ بشیر کو دوست سمجھتا۔ وہ خاص دوست تو نہیں تھا لیکن ضرورت پڑنے پر بشیر اس کی مدد کر دیتا۔ حساب کا گھنٹا آدھی چھٹی کے فوراً بعد ہوتا تھا جب بشیر اس کی کاپی میں سوال حل کر ڈالتا۔ چودھری کا لڑکا اکثر گھر کا کام کر کے نہیں لاتا تھا۔ بشیر صبح اسکول کی گھنٹی بجنے سے پہلے جلدی جلدی اس کا کام کر دیتا۔ اسی لیے چودھریوں کا لڑکا بشیر کو دوست سمجھتا تھا۔

بشیر کا باپ چودھریوں کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ ان کی گائیں وغیرہ بھی سنبھالتا۔ بدلے میں اسے تھوڑے بہت پیسے اور اناج مل جاتا جس سے بمشکل گھر کا کھانا پینا چلتا۔ اس کی ماں تھوڑی بہت سلائی جانتی تھی۔ چودھرانی نے اس پر مہربانی کر کے اسے سلائی مشین لے دی۔ وہ چودھرانی کی بڑی احسان مند تھی۔ اسے ذرا بھی فارغ وقت ملتا تو وہ اس کی مٹھیاں بھرنے یا سر پر تیل لگانے چلی جاتی۔ اسے وہاں سے چودھرانی کے اترے ہوئے تقریباً نئے جوڑے مل جاتے۔ بچوں کے لیے بھی کپڑے ملتے۔

سلائی کرنے سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی۔ کسی کی شلوار قمیص سی دیتی، کبھی رضائیوں کا استر جوڑنے یا دوپٹوں پر گوٹا کناری کا کام مل جاتا۔ چودھریوں کے گھر سے بھی کام ملتا۔ ویسے تو چودھریوں کے کپڑے شہر سے سل کر آتے تھے، درزی آ کر کپڑے لے جاتا لیکن چھوٹا موٹا کام پھر بھی نکل آتا تھا۔ چودھرانی وہ بشیر کی ماں کو پکڑا دیتی۔ وہ چودھرانی سے اس کام کے پیسے نہ لیتی، اس نے مشین جو لے کر دی تھی۔

جونہی گاؤں میں مڈل اسکول کھلا، بشیر کی ماں نے بڑے لڑکے مجید کو اس میں ڈال دیا۔ خاوند نے کچھ لیت و لعل سے کام لیا لیکن ماں اڑ گئی۔ اس نے کہا ”وہ دن رات محنت کر کے خرچہ پورا کر رہی ہے تو باپ کو کیا اعتراض ہے؟“ ویسے بھی سرکاری اسکول میں فیس برائے نام تھی۔ بیوی کی ضد کے آگے وہ خاموش ہو گیا اور مجید اسکول جانے لگا۔

مجید پڑھائی میں اچھا چل نکلا۔ چھٹی جماعت پاس کر لی تھی کہ چودھری کی اس پر نظر آ گئی۔ اسے گایوں کو چارہ وغیرہ ڈالنے اور دودھ دوہنے کے لیے صحت مند جوان لڑکوں کی ضرورت تھی۔ اس کا پہلا آدمی بیمار رہنے لگا تھا۔ چودھری کو اس کے کام سے تسلی نہیں تھی۔ گائیوں کو سنبھالنا کوئی معمولی کام نہیں، ان کو چرانا، نہلانا، چھپر صاف کرنا، دودھ سنبھالنا، یہ بوڑھے بیمار

آدمیوں کا کام نہیں۔ اس نے نرمی سے کہہ چھوڑا تھا کہ نئے ہنگڑے لڑکوں کو پرانے آدمیوں سے تربیت دلا کر پرانے لوگوں کی چھٹی کر دی جائے۔ اسی سلسلے میں مجید کے باپ کو کہہ دیا گیا کہ اگلے دن سے اپنے بڑے لڑکے کو حویلی بھیج دے۔

اگلے دن سے مجید کا اسکول جانا بند ہوا اور چودھریوں کا نوکر ہو گیا۔ ماں تو چاہتی تھی کہ لڑکا پڑھ لکھ جائے مگر مشین نے اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر ان کی روزی بھی چودھریوں کے کھیتوں سے لگی ہوئی تھی۔ کس منہ سے کہتے کہ لڑکا نہیں آئے گا؟ ان کی اتنی مجال نہیں تھی۔ مجید کا اسکول جانا چھوٹا تو وہ آہستہ آہستہ اسکول کی ساری تعلیم بھول گیا۔ روز نئے ہاتھ دھونا، کھیل سے آ کر نہانا، دھلا ہوا جوڑا پہننا، نیلیا کا یونیفارم جو اس کی ماں نے اپنے ہاتھوں سے سیا تھا، سب کچھ چھٹ گیا۔ اب وہی یونیفارم چھوٹا کر کے ماں نے چھوٹے بھائی بشیر کے ناپ کا کر دیا۔ اس کے کپڑوں کا اب کیا ذکر تھا، اسے ڈنگر سنبھالنے تھے۔ جو بھی ملتا، پہن کر چلا جاتا۔ اب تو وہ خود ڈنگروں جیسا ہو گیا۔ اس کے کپڑوں اور جسم سے ہر وقت گوبر کی بو آتی۔

وہ رات گئے تھکن سے بے حال گھر آتا۔ آنکھیں خالی خالی اور گائیوں کی طرح پھٹی پھٹی ہوتیں۔ انگلیوں اور ناخنوں میں چارا اور گوبر پھنسا ہوتا۔ کپڑوں سے گوبر اور بھینسوں کے جسموں کی اتنی شدید بو آتی کہ بشیر کئی دفعہ اپنا سانس روک لیتا۔ مجید اسے منہ بناتا دیکھ لیتا تو بپھر کر اس پر پل پڑتا۔ "بڑا آیا لاٹ صاحب کا بچہ..... بڑا صاف بنا پھرتا ہے۔"

اس دھینگا مشتی میں ماں پہنچتی۔ گود کا بچہ رونے لگتا۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ مجید کے بسانڈے کپڑوں والا جسم جب بشیر سے ٹکراتا تو مار سے زیادہ کراہت سے اس کا برا حال ہو جاتا۔

"جا پتر مجید ہاتھ دھو لے میرا بچہ..... گندے ہاتھوں سے روٹی نہ کھانا۔" ماں بولتی۔

وہ بڑبڑ کرتا گالیاں بکتا گھڑے پر ہاتھ دھونے چلا جاتا۔ اتنی دیر میں ماں روٹی نکال دیتی۔ وہ روٹی کھانا شروع کرتا تو کچھ سکون ہو جاتا۔ بشیر کن انکھیوں سے اس کی دال میں لتھڑی انگلیوں اور منہ سے باہر نکلتے روٹی کے لقموں کو دیکھتا جنہیں وہ انگلیوں سے دبا دبا کر تیزی سے منہ میں ٹھونس رہا ہوتا۔ گھن سے بشیر کا دل اوب جاتا اور وہ اپنی تمام توجہ اپنے اسکول کے کام میں لگا دیتا۔ اتنے ہنگامے میں بھی بشیر اسکول کے کام کو نہ بھولتا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ اگلے دن کا سبق یاد کرتا تاکہ فرفر سنا سکے۔ اسے تعریفوں اور شاباشی کی ایسی چاٹ پڑ گئی تھی کہ اس کا دل سب سے زیادہ اپنا سبق یاد کرنے میں ہی لگتا۔

ایسے میں چودھریوں کا پیغام ملا کہ گھر کے کاموں اور چھوٹے بچوں کو کھلانے کے لیے دوسرے بچے کو بھیج دیا جائے تو بشیر کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے رو رو کر کہا "میں نہیں جاؤں گا۔ میں نوکر نہیں بننا چاہتا۔ میں اسکول جاؤں گا۔" اس کا امتحان ہونے والا تھا، لیکن اس کے باپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

کچھ دیر کے لیے ماں جوش میں آئی اور کہنے لگی "ایک لڑکا تو دے دیا، ساری اولاد کا ٹھیکا تو نہیں لیا"..... مگر پھر سلائی مشین اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ بشیر کی سسکیوں کے جواب میں باپ کی ایک ہی رٹ تھی۔

"چودھری صاحب نے مجھے خود بلا کر کہا ہے..... جانے گا کیسے نہیں..... میں چودھری کو کیا جواب دوں گا۔"

"ابا میں اسکول میں پڑھوں گا۔"

"اسکول میں پڑھے گا؟ کتنا پڑھے گا اسکول میں؟ پڑھ تو لیا اتنے سال... نوکری ہی کرلی ہے نا آخر۔ اب نوکری مل رہی ہے تو بری لگ رہی ہے؟"

"ابا میرا امتحان ہے، بس چار دن رہ گئے ہیں۔"

"چپ کر امتحان کے بچے! جب میں نے کہہ دیا ہے سویرے چوہدریوں کے جانا ہے تو بس جانا ہے۔"

"میں نے نہیں جانا۔"

"تو نے مار کھانی ہے بشیرے!!"

"میں نہیں جاؤں گا ابا!"

اس پر باپ بالکل پاگل ہو گیا۔ اس نے بشیر کو گردن سے پکڑ کر پٹائی شروع کر دی۔ پھر اسے ایک طرف پھینک سارے فساد کی جڑ اس کا بستہ اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ساری کتابیں اور کاپیاں زمین پر بکھر گئیں۔ سیاہی کی دوات الٹ کر کھل گئی۔ پنسل ربڑ سب زمین پر بکھر گئے...... "سارا فساد اس کا ہے۔" باپ کہتا اور ٹھوکروں سے اس کی کتابوں کے پرخچے اڑاتا جاتا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھا اور بشیر کی ایک ایک کتاب اور کاپی پھاڑ کر کاغذوں کا انبار بنا دیا۔

بشیر کی سسکیاں دبی دبی چیخوں میں بدل گئیں۔ وحشیانہ گشتی اور شور سن کر ساتھ والے گھروں سے عورتیں جھانکنے لگیں۔ اس پر باپ اور آگ بگولہ ہو گیا۔ بشیر کو بازو سے گھسیٹتا کمرے میں لے گیا اور دروازہ بند کر ڈالا۔ پھر بیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ دروازے سے پلٹا اور صحن کے کونے میں بنے چولہے پر سر جھکائے روٹی اتارتی بشیر کی ماں سے بولا "جب تک نہ مانے اسے بند رہنے دے۔ اگر دروازہ کھولا تو پھر...... یاد کرے گی۔"

......☆......

پراٹھا کھاتے ہوئے بشیر کو پھر رونا آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس بار ماں بھی باپ کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بولے جا رہی تھی:

"بیٹا! اب تو گیارہ سال کا ہو چکا۔ ماشاء اللہ بارھواں لگنے والا ہے۔ اتنے بڑے لڑکے تو کمانے لگتے ہیں۔ چوہدرانی نیک عورت ہے۔ تیرا کھانا بھی وہیں لگ جائے گا۔ کپڑے بھی دے گی۔ اپنے بچوں کی طرح رکھے گی۔ تو ان کی خدمت کرنا۔ وہ بہت خوش ہو گی تجھ سے۔ اور رونا کیوں ہے؟ بیٹا لڑکوں نے کمانا ہی ہوتا ہے آخر۔ تیری تو قسمت اچھی ہے، ابھی سے نوکری لگ رہی ہے۔ بس اب بند کر رونا... پڑھ تو لیا پانچ سال۔ کب تک تیرا باپ پڑھائے گا؟ مجید بھی تو پانچ جماعتیں پڑھا ہے۔ کالی بھی پانچ جماعتیں۔ میرا بچہ، پتر تو بات نہیں مانے گا تو تیرے باپ کا کام جائے گا، چوہدری خفا ہو جائے گا۔ بیٹا چوہدرانی نے تیری ماں کو ... پھر اس نے تیری ماں کو بھی ...۔"

وہ اٹھ کر آیا۔ پراٹھا ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ماں کی کوئی بات نہ کی۔ بشیر کا ذہن ... کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے اور گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر سوچنے لگا۔ سوچتا رہا... دیر تک سوچتا رہا۔ آخر تھوڑے سے ذہن نے ایک بڑی تدبیر سوچ لی۔ امید کی ایک لہر پورے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو جا پتر، حلوہ بن گیا ہے" ماں نے حلوہ طشتری میں نکال ٹھنڈا ہونے رکھ دیا تھا۔ وہ آ کر پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ ماں اپنے ہاتھ سے اسے حلوہ کھلانے لگی۔ ساتھ ہی وہ کچھ کہتی جاتی۔ اسے ماں کی آواز مکھیوں کی

جھنجھناہٹ کے مانند لگ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس کا ذہن کچھ جملے ترتیب دے رہا تھا۔۔۔ وہ کسی لفظ کو رد کر دیتا، پھر کوئی نیا جملہ سوچتا، پھر کسی جملے کو رد کرتا۔ جونہی حلوہ ختم ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جلد سے جلد کمرے میں اپنی چھپی ہوئی کتابوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔

اس نے کتابوں کے کاغذ سمیٹ کر واپس بستے میں رکھے۔ انھیں الٹ پلٹ کر اچھی طرح سے دیکھا۔۔۔ کافی محنت لگے گی، ہاں۔ پورا دن لگے گا، لیکن لئی سے جڑ جائیں گی۔ پھر سیاہی کی دوات اٹھا کر دیکھی۔ سیاہی فرش پر گر کر خشک ہو چکی تھی۔ دوات کے پیندے میں تھوڑی سی باقی تھی۔ اس نے دوات کا ڈھکن کس کر بند کیا۔ اسے کاغذ سے اچھی طرح پونچھا اور واپس بستے میں رکھ دیا۔ پرانا زنگ آلود جیومیٹری بکس ہوا سے جو پھر ہولیا کے لڑکے نے دیا تھا، لڑھک کر چارپائی کے نیچے چلا گیا۔ اس نے چارپائی کے نیچے گھس کر اسے نکالا۔ پھر اپنی پنسل، ربڑ، فٹا اور پنسل تراش کمرے کے مختلف کونوں سے اکٹھے کر کے جیومیٹری بکس میں رکھے۔

اب اسے اپنے ہولڈر کی تلاش تھی۔ کافی ڈھونڈنے کے بعد وہ دروازے کے پیچھے پھنسا ہوا ملا لیکن اس کا نب مڑ گیا تھا۔ دبا دبا کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اسے آج اسی نب کی ضرورت تھی۔ اس نے بچی کھچی سیاہی میں ڈبو کر دیکھا لیکن بالکل لکھا نہ گیا۔ اس نے ہولڈر کو بھی بستے میں ڈال دیا۔ پھر جیومیٹری بکس سے پنسل نکالی۔ پنسل تراش سے اسے خوب نوکدار تراشا۔ بستے میں کاغذوں کے انبار میں سے بڑی مشکل سے اسے دو سادے ورق ملے۔ ایک کاپی نکال کر ورق اس کے اوپر رکھے اور چارپائی کے کنارے پر بیٹھ کر لکھنے لگا۔

اسی وقت اسے باہر سے باپ کی آواز آئی۔ اس نے لپک کر کاغذ اور پنسل بستے میں گھسا دیے۔ باپ کی آواز ''کیا کرتا ہے؟''

''ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب اس کو کچھ نہ کہنا۔ اچھا ہوشیار تھا پڑھائی میں..... خیر جو قسمت۔۔۔ مان گیا ہے بے چارہ بچہ ہے۔''

''ہوں!'' باپ نے کہا اور کمرے میں آ گیا۔ وہ اس وقت بستے میں چیزیں رکھ کر اٹھ رہا تھا۔

''کیا کر رہا ہے؟''

''یہ سب سنوار رہا تھا۔''

''روٹی کھائی؟'' ''ہاں!''

باپ باہر نکل گیا۔ چارپائی پر بیٹھنے کی آواز آئی۔ پھر چولھے کے پاس سے برتنوں کی آواز آنے لگی۔ ماں اس کے لیے کھانا نکال رہی تھی۔

اب جب تک باپ گھر میں تھا، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کل زمیندار کے گھر جانا تھا۔ جو کرنا تھا آج ہی کرنا تھا۔ اس کی نظریں باپ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا کہ اسے باپ کی پشت تھوڑی سی نظر آ رہی تھی..... باپ گھر سے باہر جائے تو وہ کچھ کر سکتا تھا۔

روٹی کھا کر باپ وہیں چارپائی پر لیٹ گیا۔ بشیر اپنا بستہ سنبھالنے لگا۔ تھوڑی دیر میں باپ اٹھ بیٹھا۔ اس نے گھڑے سے پانی نکال کر پیا۔ پھر کھیس کندھے پر ڈال باہر نکل گیا۔ اب اسے رات سے پہلے واپس نہیں آنا تھا۔ ماں مشین پر بیٹھ چکی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی باہر احاطے میں کھیل رہے تھے۔

بشیر نے لپک کر بستے سے کاغذ اور پنسل نکالی اور چارپائی کے کنارے ٹک کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک پنسل

کاغذ تھیلا سرہانے میں دبا کر سوچتا رہا۔ پھر لکھنے لگا:

بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب اسلامیہ ماڈل اسکول

جناب عالی!

گزارش ہے کہ میں جماعت پنجم کا طالب علم ہوں۔ میرا امتحان ہونے والا ہے۔ میں جماعت میں ہمیشہ اول آتا ہوں۔ زمیندار نے مجھے کام پہ بلا لیا ہے۔ اس نے میرے بھائی مجید کو بھی بلا لیا تھا۔ مجید چودھریوں کے ڈنگر سنبھالتا اور منشی اس کو ڈنڈوں سے مارتا ہے۔ آپ مجھے وہاں نہ بھیجیں۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں جماعت میں اول آتا ہوں۔ آپ زمیندار سے بات کر لیں۔ ابا بات نہیں مانتا۔ ابا کو مت بتائیں اس نے مجھے مارا ہے۔ آپ مجھے اسکول واپس بلا لیں۔ ابا کو نہ بتائیں۔ مجیدے کو بہت مار پڑتی ہے۔ مجھے وہاں نہ بھیجیں زمیندار آپ کی بات مان لے گا۔ ابا نے میری ساری کتابیں پھاڑ دی ہیں۔ اس کو نہ بتائیں۔ کتابیں جڑ جائیں گی۔ آپ بات کر لیں۔ اس کو بتا دیں کہ یہ بچہ اول آتا ہے۔ اس کو اسکول جانے دیں۔ ابا کو بالکل نہ بتائیں۔ آپ ضرور بات کر لیں۔ میں نوازش ہوگی۔

درخواست گزار

محمد بشیر طالب علم جماعت پنجم

عرضی لکھ کر بشیر کی تسلی ہو گئی۔ اس نے اسے تہہ کر کے قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔ اسکول میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب شہر کے رہنے والے تھے اور روز وہیں سے اسکول آتے جاتے۔ ان کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ اب عرضی کیسے پہنچائے!؟ اگلے دن تک تو زمینداروں کے ہاں چلا جانا تھا۔ اسکول تو اب ابا جانے نہ دیتا۔ وہ سوچتا سوچتا گھر کے دروازے میں کھڑا ہو گیا کہ کیا کرے؟ سامنے چھابڑی والا چاچا دولا آواز لگاتا گزر رہا تھا۔ "اگر چاچا دولا عرضی پکڑ لے اور کل ہیڈ ماسٹر کو دے تو"...... لیکن نہیں، چاچا دولا تو ابا کا یار ہے۔ روز رات کو ابا کے ساتھ بیٹھ کر حقہ پیتا ہے۔ وہ ضرور ابا کو بتا دے گا...... وہ کھڑا سوچتا رہا۔

اتنے میں دور سے خاکی کپڑے پہنے سائیکل پر ڈاکیا دین محمد نظر آیا۔ وہ ایک گھر کے آگے رکا تو بشیر دیکھنے لگا کہ اب اس کی طرف آئے گا۔ لیکن اس نے وہیں سے سائیکل موڑ لی اور گلی سے نکلنے لگا۔ بشیر سمجھ گیا کہ یہی موقع ہے۔ وہ سائیکل کے پیچھے دوڑا۔ "چاچا! چاچا!"

ڈاکیے نے بریک لگا کر سائیکل روکی اور پوچھا

"کیا بات ہے کاکا!"

"چاچا!" بشیر ہانپتا ہوا قریب پہنچا۔

"کیا بات ہے!"

"چاچا یہ میری عرضی ہے۔ کل ضرور ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے دینا۔"

"اس کو لفافے میں تو بند کر دیتا کاکا!"

"لفافہ نہیں ہے۔ چاچا ابا کو نہ بتانا"

"کیا لکھا ہے تو نے اس میں؟"

"کچھ نہیں چاچا! بس ابا کو نہ بتانا۔" بشیر نے بڑی منت سے کہا۔

"اچھا دے دوں گا۔"

چاچا ڈاکیا عرضی تھیلے میں ڈال کر سائیکل پہ سوار ہوا اور آگے بڑھ گیا۔

"ابا کو نہ بتانا۔" بشیر نے پیچھے سے آواز لگائی۔

چھ سات گھر آگے جا کر ڈاکیا دین محمد تھیلے میں سے خط نکالنے لگا۔ بشیر کی عرضی لفافوں کے ساتھ تھیلے سے نکل کر زمین پہ گری پھر ہوا کے ساتھ اڑ کر دور گوبر کے ڈھیر پہ جا گری۔

ڈاکیا گھنٹی بجاتا سائیکل پر سوار ہو کر اگلے گھروں کی طرف نکل گیا۔

◆◆◆

انکشافات

سی آئی اے کے وائرس

ایک انتہائی خفیہ امریکی منصوبے کا چشم کشا تذکرہ

ابوصارم

5 اپریل 2013ء کو وینزویلا کا امریکا مخالف صدر ہیوگو شاویز پراسرار انداز میں سرطان (کینسر) کے باعث چل بسا۔ تب یہ سننے میں آیا کہ امریکی خفیہ ایجنسی، سی آئی اے نے اس کے جسم میں کینسر پیدا کرنے والے حیاتیاتی مادے داخل کیے تھے۔ یوں وہ خطے میں اپنے سب سے بڑے دشمن کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کامیاب رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ وائرسوں اور جراثیم پر مشتمل حیاتیاتی ہتھیاروں کے ذریعے مخالفین کو ختم کرنا امریکی خفیہ اداروں کا قدیم چلن ہے۔ جراثیمی ہتھیار امریکی فوج اور سی آئی اے کے انتہائی خفیہ مشترکہ منصوبے "مکاناٹومی" (Mkanatomi) کی بدولت وجود میں آئے۔ یہ منصوبہ اتنا خفیہ ہے کہ انٹرنیٹ جیسی لامحدود دنیا میں بھی اس کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔

مکناؤری کا مقصد ایسے وائرس اور جراثیم (بیکٹیریا) دریافت کرنا تھا جو انسانوں کو معذور بنائیں یا ہلاک کر ڈالیں۔ نیز ایسے آلات بھی ایجاد کرنا تھا جو ان جراثیمی ہتھیاروں کو باحفاظت اور چوری چھپے ٹارگٹ تک پہنچا سکیں۔ اس انسانیت دشمن منصوبے کے نالقوں میں بدنام زمانہ تعصب پسند امریکی ڈاکٹر، کورنیلس پی روہوڈز بھی شامل تھا۔

ڈاکٹر کورنیلس ایک امریکی تحقیقی طبی ادارے، راک فیلر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل انویسٹی گیشن سے وابستہ تھا۔ 1930ء میں اسے ایسے وائرس و جراثیم ڈھونڈنے کی ذمے داری سونپی گئی جو انسانوں میں سرطان (کینسر) پیدا کر دیں۔ اس امریکی ڈاکٹر نے تجربات کے لیے پورٹوریکو کے تیرہ باشندوں کو بھی شامل تحقیق کر لیا۔

جب ڈاکٹر کورنیلس نے ان تیرہ انسانوں میں کینسر پیدا کرنے والے حیاتیاتی ایجنٹ داخل کیے تو وہ 1931ء میں مر گئے۔ یاد رہے، اس وقت تک پورٹوریکو میں امریکا سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر تحریک چل پڑی تھی۔ تحریک آزادی کا قائد پیڈرو البوئیر تھا۔ (یاد رہے، پورٹوریکو اب بھی امریکا کی نوآبادی ہے، حالانکہ نومبر 2012ء میں اس مجمع الجزائر کے باشندے آزادی کے حق میں ووٹ دے چکے۔)

1931ء کے وسط میں پیڈرو البوئیر کے ہاتھ ڈاکٹر کورنیلس کا چشم کشا خط لگا۔ یہ خط ڈاکٹر نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ اس میں درج تھا:

''میں پورٹوریکنوں (باشندوں) سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ یہ دنیا کے سب سے گندے، سست ترین، نفرت انگیز اور شیطان نما انسان ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دوں۔ اسی لیے میں ان میں سرطان پیدا کرنے والے ''ایجنٹ'' چھوڑ رہا ہوں۔''

اس خط نے پورٹوریکو میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ پیڈرو البوئیر نے اسے امریکی استعمار کی بدترین مثال قرار دیا۔ اس نے خط لیگ آف نیشنز اور انسانی حقوق کے اداروں کو بھجوایا۔ تاہم امریکی حکومت اثرورسوخ کے باعث معاملہ دبانے میں کامیاب رہی۔

ڈاکٹر کورنیلس نے خط کی بابت دعویٰ کیا کہ یہ محض ایک مذاق تھا۔ تاہم آنے والے وقت نے ثابت کیا کہ ڈاکٹر نے وہی لکھا جو اس کے دل میں تھا۔ 1950ء میں امریکی حکومت نے بغاوت کا الزام لگا کر پیڈرو البوئیر کو گرفتار کیا اور امریکا بھجوا دیا۔

1952ء یا 1953ء میں امریکی محکمہ دفاع اور سی آئی اے کے باہمی تعاون سے مکناؤری منصوبے کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر کورنیلس اب دیگر امریکی سائنس دانوں کے ساتھ جراثیمی ہتھیار بنانے میں مصروف ہو گیا۔ تجربات میں امریکی جیلوں میں بند قیدی بھی استعمال ہونے۔ ان قیدیوں میں پیڈرو البوئیر بھی شامل تھا۔

دوران تجربات ڈاکٹر کورنیلس نے پورٹوریکن تحریک آزادی کے رہنما کو حیاتیاتی مادوں اور شعاع ریزی کا نشانہ بنایا اور یوں خط افشا کرنے پر پیڈرو سے بدلہ لیا۔ ان تجربات نے پیڈرو کی صحت خراب کر دی اور جلد لقمہ اجل بنا ڈالی۔ پھر 1956ء میں اس پر فالج کا حملہ ہو گیا اور وہ اذیت ناک حالات برداشت کرتا چل بسا۔ پیڈرو کی داستان یہ عیاں کرتی ہے کہ امریکی حکومت مفادات کی اسیر ہے اور اپنے مفاد کی خاطر آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے اعلیٰ اصولوں کو بھی خیرباد کہہ ڈالتی ہے۔

امریکی شہر فریڈرک میں فورٹ ڈیٹرک نامی

امریکی فوج کا ایک بڑا مرکز واقع ہے۔ ٹکنالوجی اور حیاتیاتی ہتھیار بنانے والے دیگر امریکی منصوبے مثلاً ڈورک (Dork) اور اوفن/چیک وٹ (Often/Chickwit) اسی مرکز میں 1943ء تا 1969ء جاری رہے۔ اس مرکز میں امریکی فوج اور سی آئی اے سے وابستہ چوٹی کے سائنسی ماہرین مصروف کار رہے۔

ان منصوبوں کے ذریعے امریکی ماہرین نے نت نئے جراثیمی، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار ایجاد کیے۔ مثلاً بوٹولینم (Botoulinum) زہر جو انسانی جسم میں پہنچ کر جان لیوا غذائی سمیت (فوڈ پوائزننگ) پیدا کرتے ہیں۔ پھر کینسر پیدا کرنے والے ایسے وائرس پیدا کیے گئے جو بذریعہ ہوا انسان کے جسم میں داخل ہو سکیں اور ایسے جراثیم جو جانوروں سے "چھلانگ لگا کر" انسانوں سے جا چمٹیں۔

1972ء میں امریکی صدر رچرڈ نکسن نے حیاتیاتی ہتھیاروں کی روک تھام والے بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کر دیے۔ یوں امریکیوں کے لیے علی الاعلان جراثیمی ہتھیار بنانا ناممکن ہو گیا۔ لیکن سی آئی اے نے خفیہ مراکز میں اپنی تحقیق جاری رکھی۔

1975ء میں واٹر گیٹ اسکینڈل کے بعد طاقتور امریکی سینٹ نے "چرچ کمیٹی" کے نام سے ایک تفتیشی ادارہ بنایا۔ اس کے ذمے یہ چھان بین کرنا تھا کہ امریکی خفیہ ایجنسیاں کس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ تبھی سی آئی اے افسران نے اپنے خفیہ منصوبوں کے متعلق کچھ اہم تفصیلات بتائیں۔ یہ تفصیل بھی عوام سے پوشیدہ رکھی گئی مگر کچھ باتیں ضرور منظر عام پر آگئیں۔

مثال کے طور پر انکشاف ہوا کہ سی آئی اے ایسا زہر تخلیق کر چکی ہے جو انسان کے اندر پہنچ کر ہارٹ اٹیک (حملۂ قلب) کا باعث بنتا ہے۔ امریکی ماہرین کی جدت دیکھیے کہ انھوں نے زہر کو ننھے سے ذرات یا سوئی کی شکل میں منجمد کر دیا۔ یہ ذرات پھر پستول سے فائر کیا جاتا ہے اور بڑی تیزی سے انسانی جسم میں جا گھستا ہے۔

جب ذرات انسانی جسم میں داخل ہوتا، تو انسان کو یہی لگتا کہ کسی مچھر نے اسے کاٹا ہے۔ ذرات گھسنے کی جگہ بس ننھا منا سا سرخ نشان بن جاتا۔ جسم میں پہنچتے ہی زہریلا ذرات پگھل کر خون میں شامل ہوتا اور فی الفور ہارٹ اٹیک کا سبب بنتا۔ اس زہر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنا کوئی نام و نشان نہیں چھوڑتا، چناں چہ جدید مشینوں سے پوسٹ مارٹم بھی اسے دریافت نہیں کر سکتا۔ یوں کوئی نہیں جان پاتا کہ یہ دراصل قتل ہے۔

خفیہ ہتھیار بنانے والے سی آئی اے کے ماہر، چارلس سینسی نے چرچ کمیٹی کو بتایا کہ عموماً یہ زہریلا ذرات چھتری کی نوک میں نصب پستول سے فائر کیا جاتا۔ چونکہ یہ ذرات آواز پیدا کیے بغیر خارج ہوتا لہٰذا کسی کو اس کی بابت پتا نہ چلتا۔ شکار کو نشانہ بنا کر قاتل اطمینان سے چھتری لپیٹتا اور چلتا بنتا۔

کئی امریکی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ صدر جان کینیڈی کو بتاریخ 22 نومبر 1963ء اسی چھتری گن سے قتل کیا گیا۔ اس ضمن میں وہ دو ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اول قتل کی وڈیو فلموں سے عیاں ہے کہ گولیاں چلنے سے قبل ہی گاڑی میں بیٹھے صدر کینیڈی اچانک بے ہوش سے ہو گئے۔ ان کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور سر کندھے اور بازو سخت ہو گئے۔ دوم بعد ازاں مقتول کی

گردن میں ایک ننھا نشان پایا گیا۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ امریکی اسٹیبلشمنٹ نے اپنے مخالف جان کینیڈی کو پہلے چھتری گن سے نشانہ بنایا اور پھر گولیاں بھی چلوا دیں تاکہ وہ کسی صورت بچ نہ سکے۔

سی آئی اے ماہرین نے انسان میں ہارٹ اٹیک پیدا کرنے کا ایک اور نادر طریق کار دریافت کیا۔ اس کی بنیاد ہمارے عصبی نظام پر ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ دل کی ہر دھڑکن دماغ کے ساتھ تال میل رکھتی ہے۔ اگر کسی انسان کے قلب پر مائکرو ویو شعاع ڈالی جائے تو یہ تال میل بگڑ جاتا ہے اور وہ ہارٹ اٹیک جنم لیتا ہے۔ یہ طریق کار بھی سی آئی اے نے امریکا کے مخالفین کو مارنے کے لیے اپنایا۔

امریکا کے دشمنوں کو راہ سے ہٹانے کا تیسرا طریقہ ان میں سرطان پیدا کرنے والے وائرس چھوڑنا ہے۔ یاد رہے، لیبارٹری تجربات سے ثابت ہو چکا کہ اگر انجکشن صحت مند جانوروں میں سرطان وائرس داخل کیے جائیں تو وہ اس موذی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ بھی عین ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہی یہ وائرس انسانی جسم میں داخل ہوں، اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ انتہائی تجربہ کار ماہر امراض سرطان ہی یہ دریافت کر پاتا ہے کہ یہ کسی انسان میں مرض "درآمد کنندہ" ہے۔

امریکی خفیہ ایجنسی پچھلے 60 برس میں درج بالا طریقوں سے امریکی استعمار اور جنگ جوئی کے مخالفین کو قتل کر چکی ہے۔ سی آئی اے نے سرطان کے وائرس سب سے پہلے جیک روبی کے جسم میں داخل کیے۔ یہ وہی امریکی ہے جس نے صدر کینیڈی کے قاتل، لی ہاروے کو گولی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔

جیک روبی یقیناً صدر کینیڈی کے قاتلوں کو جانتا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ کانگریس (امریکی پارلیمنٹ) میں اہم بیان دے گا۔ لیکن بیان دینے سے قبل ہی سرطان کے باعث چل بسا۔ سرطان نے اچانک اس پر حملہ کیا، بڑی تیزی سے پھیلا اور اسے قبر کے اندر پہنچا دیا۔

غیر ملکی سربراہوں میں سی آئی اے کے ایجنٹوں نے سب سے پہلے صدر انگولا، اگوسٹینو نیٹو پر "وائرس حملہ" کیا۔ صدر نیٹو امریکی استعمار کا سخت مخالف تھا۔ حتیٰ کہ اس نے امریکی جبر و اہانت کا مقابلہ کرنے کے لیے سوویت یونین اور کیوبا سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ 1979ء میں اچانک صدر نیٹو سرطان کا نشانہ بنا اور چند ہی ماہ میں چٹ پٹ ختم ہو گیا۔ اس کی عمر صرف 56 سال تھی۔

چلی کے سابق صدر ایڈورڈو فری کو بھی سرطان کا شکار بنا کر امریکا نے اپنی راہ سے ہٹایا۔ صدر فری سی آئی اے کے متعین کردہ حاکم، جنرل پنوشے کا سخت مخالف تھا۔ امریکیوں نے 1981ء میں اس کے بدن میں خطرناک وائرس داخل کیے اور اگلے ہی سال وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بیماریوں کے وائرس و جراثیم

سی آئی اے نے افراد کو ہی نہیں پورے پورے ملکوں کو نشانہ بنایا۔ 1981ء کے موسم بہار میں اچانک ڈینگی بخار نے کیوبا پر حملہ کر دیا۔ چند ماہ میں چھتر ہزار مریض ہسپتالوں میں پہنچ گئے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ روزانہ دس ہزار مریض ڈینگی بخار میں مبتلا ہونے لگے۔ اس سے قبل کیوبا میں 1944ء میں ڈینگی کے کچھ مریض سامنے آئے تھے۔

بعد ازاں انکشاف ہوا کہ امریکی فوجی طیاروں نے

کیوبا پر حیاتیاتی حملے کے ذریعے ڈینگی بخار پھیلایا۔ اور اس مہم میں کیوبا میں موجود سی آئی اے کے ایجنٹوں نے بھی حصہ لیا۔ امریکیوں نے بعدازاں کیوبا میں سوائن فلو بھی پھیلانے کی کوششیں کیں تاکہ امریکا دشمن ملک کو نقصان پہنچایا جاسکے۔

پچھلے سال یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ پاکستان میں سی آئی اے کے ایک تجربے کی بدولت ڈینگی بخار پھیلا۔ ہوا یہ کہ 1979ء میں امریکا نے لاہور میں ایک تحقیقی مرکز بعنوان "ملیریا اریڈیکیشن سینٹر" کھولا۔ اس کا ناظم مشہور امریکی ڈاکٹر ڈیوڈ نالن کو بنایا گیا۔

یہ سینٹر دراصل سی آئی اے کا خفیہ مرکز تھا۔ وہاں افغانستان میں تعینات سوویت فوج میں ڈینگی اور زرد بخار پھیلانے والے وائرسوں پر تجربات ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ نے بغرض تجربات کرین نالن کے چار غریب باشندوں کی خدمات حاصل کرلیں۔ ان میں پھر ڈینگی بخار کے وائرس بذریعہ انجکشن داخل کیے گئے۔

جون 1980ء میں چاروں نوجوان بیمار ہو کر اسپتال جا پہنچے۔ تب پاکستانی صحافیوں کی تحقیق سے افشا ہوا کہ ملیریا سینٹر میں تو پاکستانیوں کو گنی پگ (Guinea Pig) کی حیثیت سے استعمال کیا جارہا ہے اور تبھی یہ بات بھی سامنے آئی کہ سی آئی اے سوویت فوجیوں میں ڈینگی و زرد بخار کے وائرس و جراثیم پھیلانا چاہتی ہے۔

چنانچہ بعدازاں اقوام متحدہ اور سوویت یونین کے شدید دباؤ پر پاکستانی حکومت نے ملیریا اریڈیکیشن سینٹر بند کردیا۔ لیکن دوران تجربات نہ صرف ڈینگی بخار کے وائرس پاکستانیوں میں داخل ہوئے بلکہ اسے پیدا کرنے والا مچھر بھی پاکستان میں متعارف ہوگیا۔ اس پورے واقعے کی تفصیل انگریزی ہفت روزہ ویو پوائنٹ نے اپنی

قلمی موتی

☆ بڑا قد کیے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے۔ سمجھ کا تعلق عمر نہیں احساس سے ہوتا ہے۔

☆ بہادری کا پتا دن کی روشنی سے زیادہ رات کی تاریکی میں چلتا ہے۔

☆ خوشی زیادہ ہو تو اسے سنبھالنا منہ زور گھوڑے کو سنبھالنے جیسا ہے۔ جو سب سے نہیں سنبھلتا۔

☆ ہمت بھی عجیب پھولے ہوئے غبارے جیسی ہوتی ہے۔ ذرا ناموافق بات کی سوئی چبھی شکل ہی نہیں حالت اور حالات تک بدل دیتی ہے۔

☆ جلدی کھایا ہوا کھانا اور جلد ملا ہوا فائدہ کبھی ہضم نہیں ہوتا۔

شک تو چیز ہی ایسی ہے کہ روشنی بھی ہو جائے تو اسے ڈھانپ کر اندھیرے میں بدل دیتا ہے۔

☆ اچھی روایات اور آداب ہیرے کی انگوٹھی جیسے ہوتے ہیں چاہے دائیں اور بائیں سے پرکھو نہ کھوٹ نظر آتا ہے اور نہ ملتا ہے۔ (مرسلہ: حسن دین، اسلام آباد)

یکم جون 1980ء کی اشاعت میں بیان کی ہے۔

سی آئی اے اپنے ملک میں "وسل بلوئروں" اور حکومت مخالف شخصیات کو بھی ہارٹ اٹیک یا سرطان کے ذریعے قتل کرنے میں ملوث رہی ہے۔ مثلاً منرو کو سرطان کے ذریعے مارا گیا جو صدر کینیڈی کے قتل میں ملوث تھا۔ مارلین منرو بھی قتل ہوئی جو شاید کسی راز سے واقف ہوچکی تھی۔ صحافی مارک پٹ مین ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔ یہ صحافی امریکی حکومت پر سخت تنقید کرتا تھا۔

سی آئی اے کے کرتوت

پچھلے دو عشروں میں یکے بعد دیگرے لاطینی امریکا

کے بعض ممالک میں امریکا مخالف حکمران برسرِاقتدار آگئے۔ انھوں نے پھر جنوبی امریکا میں امریکی حکومت کی پالیسیوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور اس کے خلاف محاذ بنالیا۔ تب سی آئی اے نے ان امریکا مخالف حکمرانوں کو ہارٹ اٹیک یا سرطان میں مبتلا کر کے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔

امریکیوں کا پہلا شکار ارجنٹائن کا سابق صدر، نیسٹور کرچنر بنا۔ کرچنر 2003ء تا 2007ء اپنی مملکت کا سربراہ رہا۔ اسی دوران کرچنر نے ارجنٹائن میں غربت کا خاتمہ کیا اور اسے خوشحال ملک بنا دیا۔ 2007ء میں سی آئی اے نے اس کے جسم میں خطرناک وائرس داخل کر دیا، لہٰذا کرچنر کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اسی سال اس کی بیگم، کرسٹینا کرچنر ارجنٹائن کی نئی صدر منتخب ہوئی۔ بیچارہ کرچنر بیماری کی تکالیف اٹھاتا ہوا 2011ء میں چل بسا۔

دسمبر 2011ء ارجنٹائنی حکومت نے اعلان کیا کہ صدر کرسٹینا کرچنر گلے کے سرطان میں مبتلا ہیں۔ تاہم بعدازاں حکومت نے تردید کر دی، شاید اس لیے کہ کہیں ملک میں بے چینی اور افراتفری نہ پھیل جائے۔ صدر کرسٹینا بھی شوہر کی طرح امریکی و برطانوی استعمار کی سخت مخالف ہیں۔

اکتوبر میں ایک اور امریکا مخالف راہنما، برازیلی صدر، لولا ڈا سلوا گلے کے سرطان میں مبتلا پائے گئے۔ صدر لولا 2002ء تا 2011ء صدر رہے۔ نو سال کے دوران انھوں نے برازیل کو دنیا کی نمایاں معاشی طاقت بنا دیا۔ خوش قسمتی سے صدر لولا کا علاج کامیاب رہا اور اب وہ 2015ء کے صدارتی انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں۔

2011ء میں صدر لولا کی جگہ ڈیلما روسیف برازیل کی پہلی خاتون صدر منتخب ہوئیں۔ یہ بھی امریکی پالیسیوں کی شدید مخالف ہیں۔ سی آئی اے نے انھیں بھی نہ بخشا اور 2009ء میں ان کے جسم میں سرطان کا وائرس چھوڑنے میں کامیاب رہی۔ تاہم ڈیلما روسیف نے بھی بروقت علاج کرا لیا اور اب صحت مند ہو گئیں۔ انھیں سینے کا سرطان تھا۔

اکتوبر 2012ء میں کولمبیا کا صدر، جوان سانتوس پروسٹیٹ سرطان میں مبتلا پایا گیا۔ صدر جوان کو لمبین باغیوں سے امن مذاکرات کرنا چاہتا تھا، جبکہ امریکی حکومت اس امر کی مخالف تھی۔ جب صدر جوان نے امریکا کی کٹھ پتلی بننے سے انکار کیا تو اس پر بھی وائرس کا حملہ کر دیا گیا۔ وہ اب علاج کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

لاطینی امریکا کے حکمرانوں میں وینزویلا کا صدر ہی سب سے بدقسمت رہا۔ جون 2011ء میں دنیا والوں پر منکشف ہوا کہ وہ سرطان کا نشانہ بن چکا۔ پھر اس کا کیوبا میں کئی ماہ علاج ہوا مگر وہ جانبر نہیں ہو سکا۔ یوں سی آئی اے دنیا میں شاید اپنے سب سے سخت نقاد کو بذریعہ سرطان ہٹانے میں کامیاب رہی۔

سابق کیوبن صدر فیدل کاسترو نے ہیوگو شاویز کو امریکیوں سے خبردار رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ موصوف خود بھی سی آئی اے کے کئی حملوں سے بال بال بچا اور اب تک زندہ ہے۔ اسی نے صدر شاویز کو کہا تھا:

''شاویز ہوشیار اور محتاط رہو۔ یہ (امریکی) جدید ترین ٹیکنالوجی بنا چکے۔ تم بہت بے پروا ہو۔ دھیان رکھو کہ تم کیا کھاتے ہو... اور وہ (امریکی) کیا کھلاتے ہیں... بس ایک ننھی سی سوئی درکار ہے، وہ نجانے تمھارے اندر کیا چھوڑ دیں۔''

◆◆◆

روسی کہانی

عیار بوڑھے کے ہاتھوں الو بن جانے والے
ایک سادہ لوح نوجوان کا قصۂ غم

انطون چیخوف

ابھی صبح کے سات بھی نہیں بجے تھے کہ ماکر کیزنچ نے اپنی دکان کھول لی۔ یہ تئیس سالہ نوجوان بوسیدہ سے لباس میں ملبوس تھا۔ وہ حسب معمول اشیا کی جھاڑ پونچھ کرنے لگا۔ ماکر ایک نائی اور چھوٹی سی دکان کا مالک تھا۔ دکان ہمیشہ گندی مندی رہتی، گو اس کی سعی رہتی کہ وہ صاف نظر آئے۔

ماکر نے پہلے پرانا آئینہ صاف کیا جس پر کئی دھاریاں پڑ چکی تھیں۔ ان دھاریوں کے باعث دیکھنے والوں کو دکان کا منظر لکیروں کی صورت نظر آتا۔ آئینے کے سامنے چھوٹی سی میز تھی جس پر قینچیاں، کنگھیاں، بلیڈ، پاؤڈر وغیرہ سجے ہوتے۔ سارا سامان معمولی تھا۔ حقیقتاً دکان کے پورے سامان کی مالیت پندرہ کوپک سے زیادہ نہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا دکان میں داخل ہوا۔ اس نے بھیڑ کی کھال سے بنا لبادہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کے جوتے تھے۔ سر اور گردن میں نسوانی شال لپٹی تھی۔

یہ ارست آئیون وچ تھا۔ رشتے میں ماکر کیزنچ کا چچا جو اس کا گاڈ فادر (سرپرست) بھی تھا۔ کسی زمانے میں وہ ایک سرکاری محکمے میں چوکیدار رہا۔ اب وہ گھڑیاں مرمت کرتا اور خاصی دور رہتا تھا۔

"ماکرا صبح بخیر کیسے ہو لڑکے؟"

ارست اپنے بھتیجے سے بولا جو فرش صاف کرنے میں محو تھا۔ اس کی آواز سن کر

نوجوان اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔ ارسٹ نے سر سے لپٹی شال اتاری اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔
کچھ دیر بعد گویا ہوا "اف! بڑا لمبا راستہ ہے۔" اس نے پھر ٹھنڈی سانس بھری، کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "ریڈ پونڈ سے یہاں تک پیدل چل کر آنا مذاق نہیں۔"
"آپ کیسے ہیں؟"
"پوچھو مت، بڑا برا حال ہے۔ ابھی بخار سے اٹھا ہوں۔"
"بخار! یہ آفت کب ٹوٹی؟ پچھلے ہفتے تو آپ بھلے چنگے تھے۔"
"ابھی جب سے تم گئے، میں بستر پر پڑا تھا۔ مجھے تو یہی لگا کہ قبر میں جانے کا وقت آ پہنچا۔ نجانے کیسے بچ گیا۔ کل شام ہی کو طبیعت بہتر ہوئی۔ صبح آئینے میں دیکھا کہ سر کے بال خاصے لمبے ہو چکے۔ سوچا کسی کے پاس جا کر کٹوانے چاہئیں۔ اجنبی کی نسبت عزیز زیادہ خیال رکھتا ہے۔ پھر مجھ سے رقم بھی نہیں لے گا۔ اسی لیے یہاں آ پہنچا، ورنہ تمہاری دکان تو بڑی دور ہے۔ چلو اسی بہانے ورزش ہو گئی۔"
مارکر مسکراتے ہوئے کہنے لگا "بالکل! میں عمدگی سے بال کاٹوں گا۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھ جائیے۔"
جب بوڑھا اطمینان سے بیٹھ چکا، تو مارکر نے اسے مخصوص سفید لبادہ پہنایا اور پھر قینچی پکڑ کر بال کاٹنے لگا۔ بوڑھے کی خواہش تھی کہ بال زیادہ سے زیادہ چھوٹے کر دیے جائیں تاکہ اسے کئی ماہ تک بال کٹوانے کے جھنجھٹ سے نجات مل جائے۔
"چچی کیسی ہیں؟"
"بس گاڑی چل رہی ہے۔ پچھلے دنوں وہ دائی کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ محنت کر کے اس نے ایک روبل کما ہی لیا۔"
"واہ بھئی! چچی تو بہت تیز دار نکلیں۔ ایک روبل کمانا بچوں کا کھیل نہیں۔"
"ارے ارے! قینچی آرام سے چلاؤ، میرے بال کھنچ رہے ہیں۔"
اوہ! معاف کیجیے گا۔ ہاتھ کچھ تیز ہو گیا۔ اچھا یہ بتائیے اینا ملوڈا کا کیا حال ہے؟"
"میری بیٹی! وہ بھی ٹھیک ہے۔ پچھلے ہفتے ہم نے اس کی منگنی کر دی۔ شاید تمہیں اس امر کی خبر نہیں ملی۔"
اچانک قینچی چلنا بند ہو گئی۔ مارکر نے ہاتھ سیدھے کیے اور پریشان کن آواز میں پوچھا "کس کی منگنی ہو گئی؟"
"اینا!"
"یہ کیسے ممکن ہے؟ کس کے ساتھ؟"
"شیکسن پیٹروویچ کے ساتھ۔ وہ ہمارے ایک جاننے والے کا بیٹا ہے۔ اس کا خاندان ہمارا دیکھا بھالا ہے، قدرتاً ہم بہت خوش ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ ایک ماہ بعد شادی ہے۔ یاد رہے اس میں شرکت کرنا، اچھا وقت کٹے گا۔"
"لیکن یہ کیسے ہو گیا؟" مارکر مری ہوئی آواز میں بولا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ وہ حیران پریشان نظر آتا تھا۔ کندھے اچکا کر کہنے لگا "مجھے..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ اینا اور میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا..... میں تو اسے اپنانا چاہتا تھا..... مگر اب سب کچھ تباہ ہو گیا۔"
"ارے بھئی! جو ہونا تھا، سو ہوا۔ وہ اچھا لڑکا ہے، اینا کو خوش رکھے گا۔"
مارکر کے سر کے ماتھے پر پسینا نمودار ہو گیا۔ اس نے قینچی میز پر رکھی اور اپنے لرزتے اعصاب پہ قابو پانے

کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ لرزتی آواز میں گویا ہوا ''چچا ایسا ہو نہیں سکتا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ چچی بھی جانتی ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ میں اسی لیے آپ کے بال مفت کاٹتا اور شیو بھی مفت ہی بناتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ سعی کی کہ آپ کا خیال رکھوں۔ جب ابا چل بسے، تو آپ ہمارا صوفہ بیٹ لے گئے اور اب تک واپس نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہے نا؟''

''ہاں! ہاں! مجھے یاد ہے۔ لیکن ماکر، یہ بھی تو سوچو کہ تمھاری حیثیت کیا ہے؟ تمھارے پاس دولت ہے نہ اچھی ملازمت! ایک نائی سے کوئی غریب و جاہل لڑکی ہی شادی کرنا چاہے گی۔''

''تو کیا جیکسن امیر ہے؟''

''وہ بلدیہ میں کلرک ہے۔ ذاتی مکان رکھتا ہے۔ پھر اس کا بینک بیلنس بھی خاصا ہے۔ سو میرے لڑکے، اب یہ موضوع چھوڑ دو۔ تم کوئی اور دلہن دیکھ لو۔ دنیا اتنی چھوٹی نہیں، تمھیں کوئی اور لڑکی مل جائے گی۔ چلو آؤ، میرے بال کاٹو۔ تم رک کیوں گئے؟''

ماکر خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے پھر جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگا۔

''ارے کیا ہوا، ہمت باندھو بیٹے۔ ارسٹ آئیون وچ نے نوجوان کو تسلی دی۔ تم تو عورتوں کی طرح رونے لگے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اب قینچی پکڑو اور میری بال کٹائی تو ختم کر ڈالو۔''

ماکر نے میز سے قینچی اٹھائی، اسے چند لمحے گھورا پھر واپس رکھ دی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا ''اب میں کام نہیں کر سکتا۔ میرا دل ٹوٹ چکا۔ میں جانتا ہوں وہ بھی برے حال میں ہوگی۔ ہم ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ لیکن ظالم سماج نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ ارسٹ آئیون وچ برادرکرم آپ یہاں سے چلے جائیے۔ میں اب مزید آپ کو برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اچھا! اچھا ابھی تم صدمے میں ہو۔ میں کل آ جاؤں گا۔ کل میرے سارے بال ضرور کاٹ دینا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اب تم آرام کرو۔ میں کل صبح سویرے آ جاؤں گا۔''

ارسٹ آئیون وچ کے سر پہ ابھی آدھے بال ہی کٹے تھے۔ آدھے کٹے بالوں کے ساتھ وہ کوئی مجرم نظر آتا تھا۔ سر کو یوں چھوڑنا اسے بڑا عجیب معلوم ہوا، لیکن وہ کیا کرتا؟ اس نے سر پہ دوبارہ شال اوڑھی اور باہر نکل آیا۔ ماکر جب تنہا ہوا، تو کرسی پہ بیٹھا اور اپنے عشق کو یاد کر کے آنسو بہانے لگا۔

اگلی صبح ارسٹ پھر آ پہنچا۔ ماکر نے سرد لہجے میں دریافت کیا ''آپ کو کیا کرانا ہے؟''

''مجھے نا میرے بال کاٹ دو اور کیا! ابھی آدھے سر کے بال کٹنے ہیں۔''

''برادرکرم، تم پیشگی دے دیجیے۔ میں اب بال مفت نہیں کاٹ سکتا۔''

ایک لفظ کہے بغیر ارسٹ آئیون وچ دکان سے باہر نکل آیا۔ تب سے اس کے سر پہ ایک طرف بال لمبے ہیں، دوسری سمت چھوٹے! دراصل وہ آدھے سر کی بال کٹائی کے پورے پیسے دینے کو فضول خرچی سمجھتا ہے۔ لہٰذا ارسٹ اس انتظار میں ہے کہ دوسری سمت کے بال بھی بڑے ہو جائیں تاکہ وہ کسی نائی کے پاس جائے۔ وہ شادی کی تقریب میں بھی اسی حالت میں شریک ہوا اور ناچ گانے میں مگن رہا۔

◆◆◆

کرکٹ کے مشہور کپتانوں کی نظر میں

قیادت کا فن

لیڈرشپ کے اعلیٰ و آفاقی اصولوں کا بیان جو ممتاز کھلاڑیوں نے تجربات زندگی سے پائے

محمد بن قاسم

چند دہائی قبل برطانیہ کے مشہور کرکٹ گراؤنڈ لارڈز کی انتظامیہ نے تین درجن سابق کپتانوں کو دعوت شیرینی پر بلایا۔ یوں وہ ان کی خدمات پر انھیں خراج تحسین پیش کرنا چاہتی تھی۔ برطانوی کرکٹ رسالے "کرکٹر" نے اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ یوں کہ سات کپتانوں کو جمع کر کے لیڈرشپ کے آرٹ پر فکر انگیز گفتگو کی گئی۔ اس مکالمے کے دلچسپ حصے قارئین اردو ڈائجسٹ کی نذر ہیں۔

کرکٹ کے ان کپتانوں سے سوال جواب کیے گئے۔ ان میں ٹیڈ ڈیکسٹر، کلائیو لائیڈ، آئن چیپل، مشتاق محمد، علی باچر، ویوین رچرڈز اور عمران خان بھی شامل ہیں۔ یہ سبھی پاکستانیوں کے جانے پہچانے نام ہیں۔

سوال: دیکھا گیا ہے کہ بعض کرکٹ مقابلے بور ثابت ہوتے ہیں، گو کوئی ایک ٹیم ضرور جیتتی ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ آپ کی نظر میں جیتنا اہم ہے یا شائقین کو لطف اندوز کرنا؟

کلائیو لائیڈ: میرے نزدیک جیتنا سب سے اہم ہے۔ ویسٹ انڈیز میں پچاس لاکھ لوگ بستے ہیں۔ جب کہ کرکٹ کھیلنے والے دیگر کئی ممالک کی آبادی زیادہ ہے۔ سو وہاں کھلاڑیوں کا چناؤ آسان ہے اور

اسٹیڈیم بھی بڑے ہیں۔ جب مجھے ویسٹ انڈین ٹیم کی کپتانی ملی، تو مقامی کرکٹ شکست و ریخت کا شکار تھی۔ لیکن ہم نے بورڈ سے معقول فیس کا مطالبہ کیا۔ چناں چہ ہمارے لیے یوں بھی جیتنا ضروری تھا کہ زیادہ معاوضہ برحق ثابت ہو۔ پھر جیت سے کھلاڑیوں اور عوام کا جوش و ولولہ بھی بڑھ جاتا۔

آئن چیپل: میرے خیال میں اہم بات یہ ہے کہ کھلاڑی کھیل میں دلچسپی لیں۔ اس طرح وہ مقابلہ جیتنے کی سعی کرتے ہوئے عمدہ کارکردگی دکھاتے ہیں۔ یوں تماشائی بھی ان کے کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چناں چہ میں کہتا ہوں کہ پہلی گیند سے جیتنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

مشتاق محمد: جب میں نے کھیلنا شروع کیا، تو پاکستان حال ہی میں آزاد ہوا تھا۔ ہم صرف جیت کو ذہن میں رکھ کر کھیلتے۔ گو ہار بھی ہمارا مقدر بنی، مگر ہمارے لیے فتح ہی اہم ترین تھی۔

سوال: آپ نے کھلاڑیوں میں جیت کی ذہنیت کیونکر پیدا کی؟

ٹیڈ ڈیکسٹر: اس سوال کا جواب دینا خاصا مشکل ہے۔ بہرحال سب سے پہلے کھلاڑیوں کو بااعتماد اور باحوصلہ بنانا ضروری ہے۔ اگر وہ آپ پر اور آپ ان پر اعتماد کرتے ہیں، تو جیتنا ممکن ہے۔ لیکن اعتماد موجود نہیں، تو پھر چھوٹی سی غلطی بھی شکست کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

کلائیو لائیڈ: سب سے پہلے اپنے آپ پر بھروسا کرنا سکھایا اور پھر عزت و احترام کرنا۔ پھر کھلاڑی میں جوش و جذبے کو مہمیز دی۔ میری ٹیم میں نوجوان کھلاڑیوں کی کثرت تھی۔ تاہم وہ مختلف جزائر سے آتے ہیں۔ سو پہلے انھیں یہ یقین دلانا ضروری تھا کہ میں صرف میرٹ کی بنیاد پر کھلاڑی منتخب کروں گا۔ اعتماد حاصل ہوتا ہے، دیا نہیں جاتا۔ مگر جب اس نے جنم لیا، تو کھلاڑی ملک کی خاطر دیواریں توڑنے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔

وِلیئن رچرڈز: جب میں کپتان بنا، تو ٹیم کو ریلے (Relay) دوڑ کے مانند برتا۔ کلائیو کی محنت کے باعث ہم فتح کا خاکہ (بلیو پرنٹ) پا چکے تھے۔ سو میرا کام یہ تھا کہ بھاگتے ہوئے ڈنڈا سنبھال کر رکھوں اور منزل تک پہنچ کر ہی دم لوں۔ قیادت کے اصول طے ہو چکے تھے، میں نے انھیں معیار کے مطابق رکھا۔

سوال: اکثر کہا جاتا ہے کہ ٹیم فتح کے بجائے شکست سے زیادہ سیکھتی ہے۔ آپ اس بات سے متفق ہیں؟

علی باچر: حال ہی میں رگبی کے مشہور کیوی کھلاڑی سین فٹز پیٹرک سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ہارنے کا خوف وہ سب سے بڑی وجہ تھی جو اس کے کھلاڑیوں میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کا سبب بنا۔ میں نے کہا کہ تمھاری بات سمجھ نہیں آئی۔ سین بولا ”نیوزی لینڈ میں جب کوئی ٹیم ہار جائے، تو ہر کوئی جیسے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ تب کھلاڑیوں کو لگتا ہے کہ انھوں نے قوم کو شرمندگی سے دوچار کر دیا۔ اس احساس سے بچنے کی خاطر آئندہ وہ جیت کی خاطر جان لڑا دیتے ہیں۔ میں نے اس جذبے کو غیرمعمولی پایا۔“

وِلیئن رچرڈز: یقیناً ہار سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب کوئی بہت جلد فتوحات پانے لگے، تو اس پر بے پناہ دباؤ پڑ جاتا ہے۔ گویا وہ اسے سہار نہیں پاتا۔ شکست کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی خامیوں سے روشناس کراتی ہے۔ یوں اسے موقع ملتا ہے کہ وہ

خامیاں دور کر کے اپنی ترقی و کامیابی یقینی بنا سکے۔

کلائیو لائیڈ: 76-1975ء میں ہمیں بدترین شکست کا تجربہ ہوا جب ہم آسٹریلیا سے ٹیسٹ سیریز 1-5 سے ہار گئے۔ تاہم پرتھ میں ہم نے صرف تین دن میں ٹیسٹ جیتا۔ مسلسل ہار نے ہمیں توڑ کر رکھا۔ تاہم ایک جیت سے ہمیں ہمت ملی اور یہ احساس بھی کہ ہماری ٹیم خامیاں دور کر لے، تو بہترین کارکردگی دکھانا ممکن ہے۔

سوال: ناکامی پر افسردہ اور شکست خوردہ نظر آنا آپ کے نزدیک درست رویہ ہے؟

ویون رچرڈز: ہر کھیل میں یہ روایت موجود ہے کہ شائقین اپنی ٹیم کی ہار سے افسردہ بلکہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ سو ہر کھلاڑی کو ان کے غم و غصے سے ڈر لگتا ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ میدان میں کھلاڑی غم و غصے کا مظاہرہ نہ کرے۔ اگر وہ خوفزدہ بھی ہے، تو اسے چھپا کر رکھے۔

علی باچر: اس سلسلے میں متوفی جنوبی افریقی کرکٹر ایرک رووان (Rowan) میرا آئیڈیل ہے۔ وہ ایک باغی کھلاڑی تھا۔ ایک بار وہ لنکا شائر میں فرسٹ کلاس میچ کھیل رہا تھا۔ جب سست رفتار کھیل دکھایا، تو انگریز اس پر آوازے کسنے لگے۔ اس پر ایرک اتنا بگڑا کہ احتجاجاً آدھے گھنٹے تک لیٹا رہا۔

مگر اسی ایرک کا ایک جملہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب ہم ایک میچ ہار گئے، تو میرا افسردہ چہرہ دیکھ کر وہ بولا: ''ارے یار، مسکراؤ اور ہمت سے شکست سہو... اگرچہ میرے جذبات آنسو بہا رہے ہیں۔''

ٹیڈ ڈیکسٹر: آج خصوصاً کپتان کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ میدان میں سپاٹ چہرہ رکھے اور کسی قسم کے جذبات نہ دکھائے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی کھلاڑی کیچ چھوڑ دے، تو کیمرا سیدھا اس پر جاتا ہے۔ اگر وہ سر پکڑے ہوئے ہو یا چہرے سے غصہ ٹپکے، تو یہ اچھی بات نہیں کیونکہ ایسا رویہ ساتھیوں پر منفی اثرات ڈالتا ہے۔

کلائیو لائیڈ: مجھے اپنے زمانے میں مختلف صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ویسٹ انڈین ٹیم دنیا میں بہترین بن گئی، تو ہم یہ نہیں سوچتے تھے ''اگر ہار گئے، تو کیا ہوگا؟'' بلکہ ہماری سوچ کا محور یہ سوال ہوتا ''ہم مدمقابل کو کیسے شکست دیں؟'' اس مثبت ذہنی رویے نے ہمیں بہت فائدہ پہنچایا۔

سوال: ایک کپتان کے لیے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ صف اول میں رہ کر مقابلہ کرے؟

علی باچر: مردانہ وار اور مشکلات کا مقابلہ کرنے والے کپتان یقیناً کامیابی و عزت پاتے ہیں۔ ایسے کپتانوں کی دو بنیادی اقسام ہیں۔ اول وہ جو دوسروں کو تحریک دیتے و مہمیز کرتے ہیں تاکہ کھلاڑی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کریں۔ دوم وہ کپتان جو خود اچھی بلے بازی یا بالنگ کے ذریعے ٹیم کو کامیابی دلاتے ہیں۔ سو ایک کامیاب کپتان وہی ہے جو درج بالا کسی ایک قسم سے تعلق رکھے۔

مشتاق محمد: پاکستانی کرکٹ ٹیم کی تاریخ میں کئی کھلاڑی کپتان بن چکے۔ مگر حقیقی کپتان وہی ہے جو میدان میں ٹیم کی بہترین قیادت کرے۔ عمران خان پہلے پاکستانی کپتان ہیں جو خود عمدہ کارکردگی دکھا کر دوسروں کے لیے رول ماڈل بنے۔ ان کی متحرک شخصیت اور جوش و جذبے نے دوسروں کو بھی ابھارا کہ میدان میں اچھا کھیل دکھائیں۔ ان کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے ورلڈ کپ جیتا اور پاکستان کرکٹ کی کایا پلٹ ڈالی۔

آئن چیپل: ایک کپتان کو جب احساس ہو جائے کہ شکستیں اس کے دامن پر دھبا ہوں گی، تب وہ خودبخود بہترین صلاحیتوں کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ آمر بن جائے، مگر اسے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ جیت کی خاطر کیا لائحہ عمل اختیار کرنا اور کس سے مشورہ لینا ہے۔

مثال کے طور پر نائب کپتان، وکٹ کیپر اور کھیل کی ماہیت جاننے والے سینئر کھلاڑی میرے مشیر تھے۔ وہ جب بھی مشورہ دیتے تو میں دھیان سے سنتا۔ وجہ یہ کہ کھیل ختم ہونے کے بعد بہترین مشورہ بھی کسی کام کا نہیں رہتا۔

سوال: دورِ جدید میں کیا کرکٹ میں کپتانی کرتے ہوئے کیسی مشکلات پیش آتی ہیں؟

آئن چیپل: یہ حقیقت ہے کہ اب کپتانی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ایک ٹیم سے اب کئی لوگ ٹیم سے وابستہ ہو چکے۔ میں جس زمانے میں کپتان تھا، صرف منیجر ہی سے رابطہ رہتا تھا۔ جب کبھی وہ معاملات کرکٹ میں دخل اندازی کرتا، میں صاف کہہ دیتا "دوست! تم تقریبات کے اوقات سے باخبر رکھو، بتاؤ کہ بس کب آئے گی تاکہ لڑکے بروقت ہر تقریب میں پہنچ جائیں۔ مگر کرکٹ کے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔"

شان پولاک: کپتان کی پہلی ذمے داری یہ ہے کہ میدان میں ایسی حکمت عملی اپنائے جس سے فتح حاصل ہو سکے۔ پہلے وہ کھلاڑیوں سے مشورہ کر کے منصوبہ بندی کرتا تھا۔ اب انتظامیہ تقریباً ہر بات میں دخیل ہو چکی ہے۔

نیل وکیلٹر: ماضی کی نسبت حالات واقعی بہت تبدیل ہو چکے۔ خصوصاً اب نوجوان کھلاڑی خاصے دباؤ میں رہتا ہے۔ جب میں نے کھیلنا شروع کیا، تو صرف کپتان ہی سے میرا واسطہ رہتا تھا۔ اب تو بیٹنگ کوچ، بالنگ کوچ، منیجر، فیلڈنگ کوچ اور نجانے کون کون آ دیکا ہے۔ سو کھلاڑی ایک بری شاٹ کھیلے، تو اسے فکر لگ جاتی ہے کہ اس کو بھی لوگوں سے نمٹنا ہوگا۔

ٹلی باچر: میرے خیال میں کپتان اب بھی کرکٹ ٹیم میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ دیگر کھیلوں کی طرف دیکھیے، ان کا کنٹرول منیجروں کے ہاتھوں میں ہے۔ مگر کرکٹ میچ میں کپتان ہی ہدایات دیتا اور دیگر معاملات طے کرتا ہے۔

سوال: ایک کپتان کی قیادت کے راز کیا ہیں؟

ویوین رچرڈز: اسے جزئیات پر بھی بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ مثلاً میں اپنے دورِ کپتانی میں وقت کی پابندی پر بہت زور دیتا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کھلاڑی کو آنے میں دیر ہو جائے، تو بس میں بیٹھے دیگر لڑکے دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سو میچ کا آغاز اچھا نہیں ہوتا۔ ایک اور بات یہ بھی کہ جس کپتان کو عزت و احترام حاصل ہو، تمام کھلاڑی اُس کی بات سنتے ہیں۔

مشتاق محمد: اسے چاہیے کہ اپنے تمام کھلاڑیوں کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرے اور وقت لگائے۔ ٹیم گیارہ لڑکوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر ایک کسی بات پر مختلف ردِعمل دکھاتا ہے۔ چنانچہ باصلاحیت کپتان وہ ہے جو اپنے ہر کھلاڑی کی خوبیوں و خامیوں سے واقف ہو۔

شان پولاک: ایک کامیاب کپتان سیدھی اور صاف گفتگو کرتا ہے۔ وہ کنفیوز کرنے والے پیغام نہیں دیتا اور نہ ہی تھوپتا ہے۔ مزید برآں اس کی قیادت میں

ہر کھلاڑی اپنے فرائض سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ چناں چہ بھی لڑکے سعی کرتے ہیں کہ ذمہ داری سے اپنا فرض نبھائیں۔ اس نظام کی خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکا بری کارکردگی دکھائے، تو دیگر کھلاڑیوں کا عمدہ کھیل جیت کی ضمانت بن جاتا ہے۔

ٹیڈ ڈیکسٹر: میری نظر میں بہترین کپتان وہ ہے جو اپنے بالروں کو قابو میں رکھے۔ وجہ یہ ہے کہ جوں ہی بالر وائڈ گیند کرائے، چوکا کھاتا ہے۔ جیسے ہی شارٹ گیند کرانے والے چوکا یا چھکا پڑتا ہے۔ اگر وہ درست لینتھ پر گیندیں کرانے لگے تو [illegible] ہیں۔

آئن چیپل: اچھے کپتان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ سبھی معاملات سادہ اور قابل فہم رکھے۔ [illegible] یا پیچیدہ گفتگو خرابیاں پیدا کرتی ہے۔

سوال: ماضی میں یہ رواج تھا کہ صرف سینئر کھلاڑی ہی کپتان بنائے جاتے تھے۔ تب تک وہ کپتانی کا تجربہ پا چکے ہوتے تھے۔ اب اکثر اوقات نوجوان کھلاڑی بھی یہ ذمے داری سنبھال لیتا ہے۔ تب وہ کیونکر تجربہ پاتا ہے؟

علی باچر: گو اولین میچوں میں نوخیز کپتانوں کی ناتجربے کاری عیاں ہوتی ہے۔ تاہم نوجوان کپتان کی بھی کھلاڑی عزت کرتے ہیں، تو وہ رفتہ رفتہ فتوحات پانے لگتا ہے۔ دراصل کوئی بھی کپتانی کر سکتا ہے۔ مگر عمدہ کپتانی کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ مایوس و پژمردہ کھلاڑیوں میں حوصلہ پیدا کرتا اور انھیں مقابلہ کرنے پر ابھارتا ہے۔

شان پولاک: ماضی میں عموماً بلے باز ہی کپتان بنتے تھے۔ دور جدید کی خوبی ہے کہ بالر بھی کپتان بننے لگے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ کپتان میچ کی ماہیت کو جانے دیکھنے لگا ہے۔ دراصل جب تک کپتان چند بالیں خود نہ کرائے، میچ سے بخوبی واقف نہیں ہو سکتا۔

سوال: آپ مختلف الخیال کھلاڑیوں کو کیسے کنٹرول کرتے تھے؟

کلائیو لائیڈ: بیشتر کھلاڑی کپتان کی ہدایات پر عمل کرتے۔ لیکن سرپھرے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ اچھا کپتان حکمت عملی سے انھیں قابو کرتا ہے۔ اگر بھی کھلاڑی اس پر اعتماد کرتے ہیں، تو یہ مشکل کام نہیں۔ مثلاً چیخنا چلانا میرا وتیرہ نہیں تھا۔ اگر کوئی ٹیم کے اصول توڑتا، تو میں اس سے باز پرس ضرور کرتا۔ تاہم دیگر کھلاڑی پہلے ہی اس کی خبر لے لیتے۔

مشتاق محمد: یہ میری خوش قسمتی ہے کہ پچاس سال قبل جب پاکستانی کرکٹ ٹیم نشوونما پا رہی تھی، تو میں اس کا حصہ بن گیا۔ چناں چہ مجھے فضل محمود، حنیف محمد، امتیاز احمد جیسے سینئر کھلاڑیوں کے ساتھ تربیت پانے کا [illegible] مزید برآں اس وقت اسکولوں اور کالجوں میں کرکٹ [illegible] منظم انداز میں کھیلی جاتی تھی۔ سو کلائیو لائیڈ جس [illegible] و ضبط اور عزت و احترام کی بات کر رہے ہیں، وہ پاکستانی کرکٹ میں موجود تھا۔

آئن چیپل: مجھے دو خطرناک بالروں، جیف تھامسن اور ڈینس للی کو سنبھالنا پڑا۔ للی تو زیادہ تنگ نہ کرتا، تھامسن من موجی کھلاڑی تھا۔ حتیٰ کہ 1974ء میں ایشز (سیریز) سے قبل اس نے اعلان کر دیا: ''مجھے وکٹ لینے سے زیادہ پچ پر پھیلا خون دیکھنا پسند ہے۔'' چناں چہ اگلے دو برس تک بلے باز یہی سمجھتے رہے کہ وہ انھیں قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس تاثر سے اگرچہ تھامسن کو فائدہ بھی ہوا کہ مخالف بلے باز اس سے ڈرنے لگے۔

ٹیڈ ڈیکسٹر

78 سالہ ٹیڈ ڈیکسٹر نے 62 ٹیسٹ کھیلے اور 1961ء تا 1964ء برطانوی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہے۔ بحیثیت کپتان 30 ٹیسٹ کھیلے۔ نو جیتے، سات ہارے۔ اپنے زمانے میں چوکے چھکے مارنے والے کھلاڑی تھے۔

مشتاق محمد

70 سالہ مشہور پاکستانی کھلاڑی نے 57 ٹیسٹ کھیلے۔ 1976ء تا 1979ء پاکستانی ٹیم کے کپتان رہے۔ 19 ٹیسٹ میچوں میں کپتانی کی۔ آٹھ جیتے، چار ہارے اور سات برابر رہے۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے بہترین آل راؤنڈروں میں ہوتا ہے۔

آئن چیپل

70 سالہ ممتاز آسٹریلوی کھلاڑی 75 ٹیسٹوں میں شریک ہوئے۔ 1971ء سے 1975ء کے درمیان 30 میچوں میں کپتانی کی۔ 15 جیتے، 5 ہارے اور 10 برابر رہے۔ اس دور کے بہترین کپتان ہونے کا اعزاز پایا۔ آج بھی آسٹریلوی عوام آپ کا زمانہ کپتانی یاد کرتے ہیں۔

کلائیو لائیڈ

69 سالہ اس ویسٹ انڈین کھلاڑی کا شمار کرکٹ تاریخ کے بہترین کپتانوں میں ہوتا ہے۔ 30 سال کے تھے کہ 1974ء میں کپتان بنائے گئے۔ اگلے گیارہ سال تک یہ عہدہ آپ ہی کے پاس رہا۔ اسی دوران ویسٹ انڈین ٹیم دنیائے کرکٹ پر حکمرانی کرتی رہی۔ کل 110 ٹیسٹ کھیلے۔ 74 میچوں میں کپتانی کی۔ 36 جیتے، 12 ہارے اور 26 برابر رہے۔

علی باچر

یہ 60 سالہ جنوبی افریقن کھلاڑی عالمی پابندی کے باعث زیادہ ٹیسٹ نہیں کھیل سکے۔ یوں ان کا جوہر قابل ضائع ہو گیا۔ 12 ٹیسٹ کھیلے۔ 1969ء میں آسٹریلیا کے خلاف بحیثیت کپتان چار ٹیسٹ کھیلے اور سبھی جیتے۔

ویوین رچرڈز

یہ 62 سالہ ویسٹ انڈین کھلاڑی اپنے زمانے میں بہترین بلے باز رہے۔ کلائیو لائیڈ کی سبکدوشی کے بعد 1985ء تا 1991ء اپنی ٹیم کے کپتان رہے۔ 49 میچوں میں کپتانی کی۔ 27 جیتے اور صرف 7 ہارے۔ 15 برابر رہے۔ لیجنڈری پاکستانی کرکٹر عمران خان کی رائے میں ویوین رچرڈز ہی اعلیٰ ترین مہارت کے ساتھ فاسٹ باؤلروں کو کھیلتے تھے۔

شان پولاک

40 سالہ جنوبی افریقن شان پولاک نے 108 ٹیسٹ کھیلے۔ 2002ء تا 2003ء قومی ٹیم کے کپتان رہے۔ 26 میچوں میں کپتانی کی۔ چودہ جیتے اور پانچ ہارے۔ سات برابر رہے۔ اپنے زمانے کے بہترین آل راؤنڈر رہے۔

◆◆◆

طنز و مزاح

عاقل را اشارہ کافی است

سب ٹھیک ہو جائے گا

”ڈنگ ٹپاؤ“ پالیسی پہ یقین رکھنے والے

ستم پروروں کا آزمودہ نسخہ

ہیر نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ناپسندیدہ مرد سے شادی نہیں کرے گی... مگر مولوی صاحب نے اس کا انکار اقرار میں بدل کر نکاح پڑھا دیا۔ تب ممتا کی ماری ماں نے سینے پہ دوہتڑ مارتے ہوئے مولوی صاحب سے کہا تھا کہ انھوں نے یہ کیا ظلم کر دیا!

وہ اپنی اونی ریش پر دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے

”محترمہ! آپ فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

سبھی جانتے ہیں کہ اس کے بعد واقعی سب ٹھیک

ہو گیا۔ ہیر نے اپنے چچا کیدو لنگ کے ہاتھوں قتل ہو کے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ جبکہ دھیدو عرف رانجھا نے کپڑے پھاڑے اور بدحواس ہو کر جنگل کی طرف نکل گیا...... یوں ختم کہانی ہوئی۔

٭٭٭

آپ نے یہ جملہ اکثر سنا ہوگا کہ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس جملے کی اہمیت اور افادیت سے یقیناً انکار نہیں کیونکہ اکثر و بیشتر نہ صرف سب ٹھیک ہوتا بلکہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے۔ اور اگر سب ٹھیک نہ ہو سکے تو یہ مان لینے میں کیا حرج ہے کہ مختارِ کل کی یہی مرضی تھی۔

یادش بخیر! ہم نے یہ جملہ پہلی بار اس وقت سنا جب ایک روز سبق یاد نہ کرنے کی پاداش میں ہمارے استادِ محترم نے ہماری اچھی خاصی پٹائی کر ڈالی۔ انھوں نے لاتوں، ڈنڈوں اور گھونسوں کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے نہ صرف ہمارا جوڑ جوڑ ہلا ڈالا بلکہ تھپڑوں سے ہمارا روئے مبارک بھی لال کر دیا۔ اس بے رحمانہ مار پیٹ اور تشدد کے خلاف جب والدِ محترم نے ان سے شکایت کی اور ہماری حالتِ زار کا نقشہ پیش کیا تو انھوں نے پیار سے ہمارے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"محترم! آپ بالکل فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس روز کے بعد حیرت انگیز طور پر واقعی سب ٹھیک ہو گیا۔ ہم نے کتابوں کو طاق پر رکھا اور اسکول سے "کٹی" کرنے لگے۔ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئیں۔ اس موقع پر یارانِ غار نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا اور ہماری دیکھا دیکھی اسکول سے بھاگنے لگے۔ اس بھاگ دوڑ کا جو نتیجہ نکلنا تھا، وہ نکلا۔ ہم نہ صرف امتحان میں امتیازی نمبروں سے فیل ہوئے بلکہ اسکول ہٰذا میں مزید پڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ بڑھاپا وہ اسپتال ہے جہاں ہر بیماری کو داخلہ مل جاتا ہے۔ بلڈ پریشر کے پریشر میں تو ہم بہت پہلے سے تھے کہ حالات کی ستم ظریفی نے شوگر کا بھی خوگر بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں امراض کے مشترکہ مریض بن گئے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے (باپ کا آج تک پتا نہیں چلا) اب آئے دن ہمارا واسطہ "گولڈ میڈلسٹ" حکیموں اور ماہر ڈاکٹروں سے پڑنے لگا۔ یہ سلسلہ تاحال جاری و ساری ہے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں کہ ہر پیشی پر یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں "آپ بالکل فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

جب ہم ان سے ٹھیک ہو جانے کی تاریخ مانگیں تو وہ ہمیں سمجھانے لگتے ہیں۔ عاقل را اشارہ کافی است' ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہنوز دلی دور است۔ البتہ ان کے پُراثر اور شیریں جملوں سے ہماری ڈھارس ضرور بندھتی ہے۔

ہمارے وکیل صاحب کا حال بھی ان سے مختلف نہیں۔ گزشتہ دو سال سے بسلسلہ مکان کرائے دار سے ہمارا تنازع چل رہا ہے۔ مقامی عدالت میں ایک مقدمہ زیرِ سماعت ہے۔ ہر پیشی پر ہمارے فاضل وکیل یہ کہہ کر ہمیں اطمینان دلاتے ہیں "آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" دلچسپ امر یہ ہے کہ انھوں نے کبھی یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ کیسے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ادھر ہم ہیں کہ اس مقدمے بازی سے تنگ آ

چکے۔ چاہتے ہیں کہ مقدمے کا فیصلہ جلد از جلد ہمارے حق میں ہو جائے تاکہ روز روز کی بک بک جھک جھک سے ہماری جان چھوٹے۔ لیکن کوئی امید بر نہیں آتی' کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ادھر ناہنجار کرایہ دار ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کب اس رگڑے جھگڑے سے ہماری جان چھوٹے گی۔ مگر آفرین ہے خواجہ صاحب پر کہ وہ اب بھی اپنی اس بات پر قائم و دائم ہیں کہ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہمارے سسر نامدار سال خوردہ اور باراں دیدہ شخص ہیں۔ اونچی پیشانی سے ان کی ذہانت کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے جب اپنی سیدھی سادی اور منتقل کی پوری لڑکی کو ہماری زوجیت میں دے کر اپنے سر کا بوجھ ہلکا کیا تو بہت خوش دکھائی دیے کہ انھیں ان کے نخرے اٹھانے پر ناز کرتا ہوا داماد میسر آ گیا تھا۔

ابھی ہمارے سہرے کے پھول بھی نہیں مرجھائے تھے کہ انھوں نے اپنے اندر ۱۰ الڑکے کو ہل میں نوکری دلانے کی فرمائش کر ڈالی۔ انھیں بھرتی کرانا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر ہم یہ سائنسی تجربہ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ صاحبزادے پرلے درجے کے کام چور اور نالائق تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کے لچھن بھی کچھ اچھے نہ تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ہم صاف طور پر انکار بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مبادا وہ ناراض ہو جائیں۔ ادھر نئی نویلی بیگم کا بھی اصرار بڑھتا گیا۔ جب باپ بیٹی کا اصرار حد سے بڑھا تو تہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق ہمیں ہی کڑوا کر کے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔

ابھی انھیں اپنی ڈیوٹی پر آئے دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ موصوف پر پرزے نکالنے لگے۔ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا' کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے ہمارے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک روز قدم بڑھاتے ایک محنت کش کو پیٹ ڈالا اور دوسرے کا سر پھاڑ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر مزدور یونین والے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ انھوں نے نہ صرف ہڑتال کی کال دی بلکہ بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی۔ پولیس نے فوری کارروائی کرتے ہوئے سالار جنگ کو گرفتار کیا اور لاک اپ میں بند کر دیا۔

ہم بھاگم بھاگ اپنے کونسلر دوست ایم ڈی شوکت (محمد دین شوکت) کے گھر پہنچے جو اتفاق سے فوجداری اور تھانے کچہری میں اچھا خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا تو وہ ہنس کر یوں گویا ہوئے:

"آپ پریشان نہ ہوں' ان شا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر کیسے؟" ہم نے وضاحت چاہی۔

"تھانیدار میرا ہم جماعت رہا ہے۔ میں شام سے پہلے پہلے برخوردار کو چھڑا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔" انھوں نے خود اعتمادی سے کہا۔

یہ سن کر ہمارے چہرے پر تازگی آ گئی۔ چونکہ ان کی دلیل میں کافی وزن تھا' اس لیے ہم مطمئن ہو کر گھر لوٹ آئے۔

شام آئی اور گزر گئی۔ مگر جانے والا لوٹ کر نہیں آیا۔

ادھر بیگم صاحبہ کی بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بار بار اس خدشے کا اظہار فرما رہی تھیں کہ کہیں پولیس والے روایتی ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیں۔

ہم نے جلدی جلدی کھانا زہر مار کیا اور ایک بار پھر "شوکت منزل" جا پہنچے۔ دست بستہ ہو کر اپنی عرضداشت پیش کی اور جلد کارروائی کرنے کی درخواست کی۔

انھوں نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا:

"آج راناصاحب چھٹی پر تھے اس لیے وہ تھانے نہیں آئے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس اونیز بن میں ایک ہفتہ بیت گیا۔ ابر رحمت نمودار ہوتے مگر کچھ ہی دیر بعد آسمان یوں صاف ہو جاتا جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ انھی صاحب کے اختلاجی دورے بھی زوروں پر تھے۔ عجیب عجیب خبریں لاتے اور فسانے تراشنے والے سب کچھ اڑاتے۔

ایک روز اڑتی ہوئی خبر ملی کہ پولیس نے سائے صاحب کا چالان کر دیا ہے۔ انھیں جلد عدالت پیش کیا جائے گا۔ ہمارا چہرہ آنے والے خطرے کے خیال سے سفید پڑ گیا۔

ایک بار پھر ہانپتے کانپتے شوکت جی کے پاس پہنچے اور انھیں بتایا کہ اب تو بات کورٹ کچہری تک جا پہنچی ہے۔ ہم نے کچہری کو ذرا کھینچ کر کہا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں' اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" انھوں نے کمال اطمینان کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "کوششیں جاری ہیں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ان کا گھسا پٹا اور مایوس کن جواب سن کر طبیعت کچھ جھنجھلا گئی مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ

راجا وہ تھے گا' اپنی نگری لے گا

دوسرا ہفتہ بھی یونہی گزر گیا۔ وکیل صاحب نے اپنی بساط کے مطابق جو کچھ ہو سکتا تھا' کر دکھایا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ الٹا انھوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ کہیں جج صاحب دہشت گردی کی دفعہ نہ لگا دیں۔ مزدور یونین کی طرف سے یہ مطالبہ شدت پکڑتا جا رہا تھا کہ یہ مقدمہ انسداد دہشت گردی کی عدالت میں چلایا جائے۔

ہمیں اپنے قدم زمین میں دھنستے ہوئے دکھائی دیے۔ آخر کار وہ یوم سیاہ آ گیا کہ جس کا شدت سے انتظار تھا۔ عدالت نے انھیں ایک ماہ قید بامشقت کی سزا سنا دی۔

ہم دوڑے دوڑے شوکت صاحب کے دفتر جا پہنچے اور انھیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ "محترم! اب تو انھیں ایک ماہ کی سزا ہو گئی ہے۔"

وہ چھوٹتے ہی بولے "آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا ابھی سب ٹھیک ہونے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟" ہم نے تڑپ کر کہا۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ چھوٹتے ہی بولے "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب اس سے زیادہ اور کیا ٹھیک ہو گا کہ انھیں جیل بھجوا دیا گیا ہے۔" ہم نے اظہار مایوسی کرتے ہوئے کہا۔

اس پر وہ فوراً بولے:

"آپ خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ بچے کو اتنی کم سزا ہوئی۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں' جیلر میرا دوست ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ بچے کا خاص خیال رکھے اور اس سے ہرگز مشقت نہ لے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

◆◆◆

موذی بیماری سے بچنے کا نسخہ

سر درد کو دردِ سر نہ سمجھیے

دن میں تارے دکھلا دینے والی تکلیف سے نجات دلانے والے کارآمد مشورے

ڈاکٹر نبیل اختر

فیصل صاحب شام کو گھر پہنچے تو مارے درد کے ان کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ جب تھوڑی دیر آرام کیا، اسپرین کی گولی کھائی اور بچوں سے سر دبوایا تبھی کچھ افاقہ ہوا۔ فیصل صاحب ہی نہیں تقریباً ہر انسان کو آئے دن سر درد سے واسطہ پڑتا ہے۔ بعض اوقات تو سر میں اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ انسان زندہ ہوتے بھی موت کا مزا چکھ لیتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ درد ہمارے دماغ میں جنم نہیں لیتا... کیونکہ وہ تکلیف محسوس کرنے والے آخذے (Receptor) ہی نہیں رکھتا۔ یہ درد دراصل دماغ کی نسوں، خون کی نالیوں یا عضلات میں جنم لیتا ہے۔

ماضی کی نسبت آج کل سر درد پیدا کرنے والے عوامل زیادہ ہیں... مثلاً کام کا دباؤ، ٹریفک جام، بڑھتے اخراجات، بیوی سے بحث مباحثہ وغیرہ۔ چناں چہ انسان جب بھی جسمانی یا نفسیاتی طور پر دباؤ میں آئے تو یہ سر یا

گردن کی نسوں، خون کی نالیوں یا عضلات میں بھی کھچاؤ پیدا کر کے درد کو جنم دیتا ہے۔

سر درد کی اقسام

دماغ کے کسی بھی حصے میں جنم لینے والی ایسی کوئی بھی تکلیف جس میں خون نہ بہے، طبی اصطلاح میں "سر درد" (Headache) کہلاتی ہے۔ سر درد کی کئی اقسام ہیں۔ بعض اوقات یہ دماغ کے ایک حصے میں جنم لیتا ہے اور کبھی دونوں حصوں میں۔ کبھی درد لہروں کے مانند اوپر نیچے ہوتا، کبھی مسلسل شدت اختیار کر لیتا ہے۔ کچھ سر درد عارضی ہوتے، باقی طویل عرصہ چمٹے رہتے ہیں۔ ماہرین طب نے بہرحال سر درد کی اقسام کو تین بڑے گروہوں میں جمع کر دیا ہے۔ ان کا تعارف درج ذیل ہے۔

(1) دباؤ والے سر درد

جب سر یا گردن کے عضلات میں کھچاؤ جنم لے، تو دباؤ والے سر درد جنم لیتے ہیں۔ بیشتر مرد و زن کو اسی گروہ کے سر درد چمٹتے ہیں۔ ان میں تکلیف کم مگر مسلسل ہوتی ہے۔ اکثر مریض شکایت کرتے ہیں کہ گویا ان کے سر پر کس کر بینڈ باندھ دیا گیا ہے۔ یہ سر درد تیس منٹ تا ایک ہفتہ چمٹے رہتے ہیں۔

(2) درد شقیقہ

اسے آدھے سر کا درد بھی کہتے ہیں۔ یہ کئی گھنٹوں بلکہ دنوں تک چمٹ جانے والا درد ہے۔ عموماً مریض تکلیف کی شدت سے بے حال ہو جاتا ہے۔ درد وقفہ وقفہ بڑھتا اور گھٹتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے تارے سے چمکتے ہیں۔ شور، روشنی اور بو سے جان جاتی ہے۔ درد شقیقہ شدید ہو تو انسان متلی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ انگریزی میں مائگرین (Migraine) کہلاتا ہے۔

(3) جھنڈ سر درد (Cluster)

یہ درد کی شدید ترین قسم ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ درد وقفے وقفے سے جھنڈ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ درد اچانک جنم لیتا اور عموماً ماتھے و آنکھوں کو نشانہ بناتا ہے۔

بازگشت سر درد

جو مرد و زن سر درد دور کرنے والی ادویہ بکثرت استعمال کریں، وہ اکثر بازگشت (Rebound) سر درد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جب کئی دن تک ادویہ کھائی جائیں۔ بازگشت سر درد سے بچنے کا طریق یہی ہے کہ ادویہ کا استعمال روک دیا جائے۔ درد ختم نہ ہو تو ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔

علاج

خوش قسمتی سے بیشتر سر درد عارضی ہوتے اور گھریلو ٹوٹکوں سے کافور ہو جاتے ہیں۔ صرف طویل عرصہ رہنے والے سر درد تقاضا کرتے ہیں کہ طبیب سے رجوع کیا جائے۔ ذیل میں سر درد کے ہر گروہ سے متعلق علاج کے ایسے طریقے درج ہیں جنھیں گھر میں با آسانی برتا جا سکتا ہے۔

دباؤ والے سر درد کا علاج

☆ گردن و سر کی مالش کیجیے۔ سر پر ٹھنڈے یا گرم پانی کی پٹیاں رکھیے۔ نیم گرم پانی سے غسل کیجیے۔ نیز آرام بہم پہنچانے کے دیگر طریقے اپنائیے۔

☆ اسپرین، آئبو پروفین اور دیگر درد دور کرنے والے کیمیائی مادوں سے بنی کم طاقت والی ادویہ کھائیے۔

☆ اعتدال میں ورزش کرنے سے بھی عموماً سر درد جاتا رہتا ہے۔

☆ دفتر یا دکان پر بیٹھنے کا غلط انداز کی مہرہ و زن میں دباؤ والا سر درد پیدا کرتا ہے۔ بیٹھنے کا درست طریقہ ہے کہ سر کو بہت زیادہ جھکا کر نہ رکھیے۔ جب کھڑے ہوں تب بھی کاندھے اور سر بلند رکھیے۔

☆ ماتھے اور کنپٹی پر پودینے کا تیل ملیے۔ یہ تیل سکون آور مادہ مینتھول رکھتا ہے جو سر درد میں افاقہ پہنچا سکتا ہے۔

دردِ شقیقہ کا علاج

☆ جیسے ہی دردِ شقیقہ کا حملہ محسوس ہو ادویہ استعمال کرنے لگیں۔ اسپرین اور آئبوپروفین کی مقررہ مقدار کھایئے۔

☆ تاریک کمرے میں تو استراحت ہوں یا کیفین کے حامل مشروب (کافی، کولا) نوش کیجیے۔ بعض اوقات یہ عمل دردِ شقیقہ بھگا ڈالتا ہے۔

☆ اعصاب و عضلات کو سکون پہنچانے والی ورزشیں کیجیے۔ نماز پڑھنے سے بھی یہ درد کافور ہو سکتا ہے۔ مزید برآں دن میں ایک گھنٹا اپنے پسندیدہ مشغلے پر ضرور صرف کیجیے۔ مثلاً مطالعہ کرنا، تلاوت سننا یا باغبانی وغیرہ۔

جھنڈ سر درد کا علاج

نیند کا ایک وقت مقرر کیجیے اور روزانہ اسی وقت سو جایئے۔ جب نیند کا نظام الٹ پلٹ جائے تو عموماً جھنڈ سر درد حملہ آور ہوتا ہے۔

☆ سگریٹ اور شراب نوشی سے پرہیز کیجیے۔

☆ ایسی اشیا سے اجتناب کیجیے جو جلد آگ پکڑ لیتی ہیں۔ مثلاً پٹرول، اسپرٹ، جھڑ (مٹی) کا تیل اور روغنی پینٹ وغیرہ۔ ان کی بو اکثر انسان کو سر درد میں مبتلا کر دیتی ہے۔

☆ زیادہ بلند علاقوں میں اپنی صحت کا خیال رکھیے۔ وہاں آکسیجن کی کمی دردِ شقیقہ کو جنم دے سکتی ہے۔

جڑی بوٹیاں، معدن اور حیاتین

اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر جڑی بوٹی میں کسی نہ کسی مرض کی شفا رکھی ہے۔ سو ہر قسم کے سر درد کا علاج بھی جڑی

امن کے داعی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں جب اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو علاقہ زیادہ سے زیادہ سو مربع میل ہوگا۔ لیکن آٹھ نو سال کے قلیل عرصے میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے بعد حضور اکرمؐ کا وصال ہوا تو اس وقت یہ ریاست پھیل کر بارہ لاکھ مربع میل تک وسیع ہو چکی تھی۔

ان 10 برسوں میں مسلمانوں کی چھوٹی بڑی 81 جنگیں ہوئیں۔ 27 غزوات میں حضور ﷺ خود شریک ہوئے۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ ان تمام جنگوں میں مسلمان مقتولین 259 اور غیر مسلم مقتولین 759 تھے یعنی مقتولین کی کل تعداد 1018 تھی۔ جبکہ اسلامی انقلاب سے قبل رومی فاتحین کا یہ حال تھا کہ وہ ایک ہی یلغار میں ایک دو لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے تھے۔ یہی طرزِ عمل ان کی وارث مغربی طاقتوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ پھر مسلمانوں نے بنیادی طور پر دفاع میں تلوار اٹھائی جبکہ مغربی طاقتیں ہوسِ زر و ملک میں مبتلا ہیں۔ (حبیب اشرف صبوحی، لاہور)

بوٹیوں سے کرنا ممکن ہے۔ ان میں ادرک سرفہرست ہے۔ ادرک کا ایک انچ ٹکڑا اُبلتے پانی میں ڈالیے۔ پانی آدھا گھنٹا کھولنے دیجیے۔ پھر تھوڑی سی چینی ڈال کر یہ چائے نوش کیجیے۔ یہ مشروب دردِ شقیقہ دور کرتا نیز انسان کو قے و متلی کی کیفیت سے نجات دلاتا ہے۔

سر درد میں لیموں بھی بڑا کارآمد ہے۔ قہوے میں لیموں ڈال کر نوش کیجیے، افاقہ ہوگا۔ مزید برآں لیموں کے چھلکوں کا ملیدہ بنائیے۔ پھر اسے بطور پلاسٹر ماتھے پر لگائیے۔

بابونہ (Chamomile) سے بنی چائے سر درد دور کر کے آرام پہنچاتی ہے۔ بڑے جنرل اسٹوروں میں بابونہ ''ٹی بیگ'' کی صورت میں دستیاب ہے۔ یہ چائے شہد ملا کر نوش کیجیے۔

کئی مرد و زن کو میگنیشیم کی کمی سر درد میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس معدن کی عدم دستیابی سے دماغ متاثر ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس صورت میں میگنیشیم والی گولیاں لیجیے۔ یا پھر اس معدن سے بھرپور غذائیں کھائیے۔ ان میں انجیر، گہرے رنگ والی چاکلیٹ اور حلوہ کدو کے بیج شامل ہیں۔

جسم انسانی میں وٹامن بی ٹو (ربوفلاوین) کی کمی بھی سر درد کا باعث بن سکتی ہے۔ سو اس حیاتین کی بھی بدن میں کمی نہ ہونے دیجیے۔

غیر غذائی علاج

غذا کے علاوہ سر درد دور کرنے والے دیگر ٹوٹکے بھی موجود ہیں۔ چونکہ اس عارضے کی کئی اقسام ہیں لہٰذا کوئی نہ کوئی ٹوٹکا کام آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پانی سے علاج کا ٹوٹکا آزمائیے۔

اس طریق علاج میں مریض گرم پانی میں کم از کم دو منٹ تک کھڑا ہوتا ہے۔ (پانی اتنا گرم ہو کہ برداشت ہو سکے)۔ اس طریقے سے جلد میں خون کی روانی بڑھتی ہے۔ بعدازاں مریض اتنے سرد پانی میں دو منٹ تک استادہ ہوتا ہے جتنا برداشت کر لے۔ یوں خون پورے جسم میں پھیل جاتا ہے۔

پانی سے علاج کے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ اگر بیس منٹ تک گرم و سرد پانی میں باری باری کھڑا ہوا جائے تو جسم میں خون کی روانی تیز ہو جاتی ہے۔ یوں تمام اعضا تک آکسیجن و غذائیت پہنچتی ہے اور وہاں جمع زہریلے مادے صاف ہو جاتے ہیں۔

ماتھے اور گردن کو بھی اس گرم و سرد علاج سے گزارا جاتا ہے۔ طریق کار یہ ہے کہ ماتھے پر پہلے کپڑے میں بندھی برف رکھی جاتی ہے۔ (برہنہ برف ماتھے پر نہ رکھیے) اس کے بعد گرم پانی میں تولیہ ڈبو کر نچوڑیں اور اس سے گردن کو سینکیے۔ اس علاج کا فائدہ یہ ہے کہ گرماہٹ اور ٹھنڈک سر درد کے باعث اکڑے یا تنے ہوئے اعصاب اور پٹھوں کو ڈھیلا کرتی اور یوں انھیں تناؤ سے نجات دلاتی ہیں۔

☆ کمپیوٹر پر کام کرنے والے مرد و زن اکثر سر درد کی شکایت کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسکرین پر طویل عرصہ تک نظریں جما کر بیٹھا جائے تو آنکھوں، ماتھے اور سر کے عضلات اینٹھ جاتے ہیں۔ اس خرابی سے بچنے کی خاطر ہر پندرہ منٹ بعد اسکرین سے نظریں ہٹائیے اور بیس تیس فٹ دور کسی شے پر چند سیکنڈ تک جمائیے۔

ممکن ہو تو کھڑے ہو جائیے اور کچھ چہل قدمی کیجیے۔ مزید برآں مانیٹر کو زیادہ روشن نہ رکھیے ورنہ تیز روشنی آنکھوں پر دباؤ بڑھائے گی۔ نیز مانیٹر کو آنکھوں

کے متوازی اور قریباً ڈیڑھ فٹ دور رکھیے۔ یہ تدابیر اختیار کرنے سے سردرد میں نمایاں کمی آتی ہے۔

☆ جدید تحقیق افشا کر چکی کہ جو افراد کم نیند لیں وہ عموماً سردرد کا شکار رہتے ہیں۔ سو ہر رات کم از کم سات گھنٹے سویئے۔ یوں نہ صرف آپ سردرد سے نجات پائیں گے بلکہ صبح تازہ دم اٹھیں گے۔

☆ کئی اقسام کے سردرد میں ایسی ہلکی پھلکی ورزش مفید ثابت ہوتی ہے جو باغ میں کی جائے۔ یوں نہ صرف بدن میں خون کی روانی بڑھتی بلکہ تازہ ہوا بھی سردرد ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ دوران ورزش گہرے سانس لیجیے تاکہ تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہو جائیں۔

☆ سردرد دور کرنے میں خوشبو سے علاج کا طریقہ بھی زمانہ قدیم سے مستعمل ہے۔ اس طریق کار میں پودینے، اسطوخودس، یوکلپٹس، صندل، نیازبو یا اکلیل کوہستانی (Rosemary) کے پتے یا چوبی برادہ ایک لیٹر پانی میں ابالا جاتا ہے۔

جب پانی ابل جائے تو مریض سر پہ تولیہ اوڑھ کر برتن سے نکلنے والی بھاپ سونگھ کر اندر لے جاتا ہے۔ کئی مرد و زن اس "خوشبویاتی علاج" سے فائدہ پاتے اور سر درد سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔

☆ انسانی بدن میں پانی کی کمی بھی سردرد جنم لینے کا اہم سبب ہے۔ ایسی صورت میں یہ درد انسان کو خبردار کرتا ہے کہ حالات خراب ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کئی مرد و زن مناسب مقدار میں پانی نوش نہیں کرتے۔ لہٰذا دن میں چار تا آٹھ گلاس پانی ضرور پیجیے تاکہ سردرد سے بچ سکیں۔

احتیاطی تدابیر

پرہیز اور احتیاط کے عوامل بھی سردرد سے بچاؤ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کئی مرد و زن اگر مخصوص غذاؤں، مشروبات، سرگرمیوں اور آلودہ ماحول سے دور رہیں تو سردرد ان پہ حملہ آور نہیں ہوتا۔ چند احتیاطی تدابیر درج ذیل ہیں:

☆ غذا میں کم سے کم نمک استعمال کیجیے۔
☆ کیفین کم سے کم استعمال کیجیے۔
☆ سگریٹ نوشی سے بچیے۔
☆ جسم کو تھکن کا نشانہ مت بننے دیجیے۔
☆ درست انداز میں بیٹھیے اور کھڑے ہوں۔
☆ زیادہ شور والی جگہ سے دور رہیے۔

کیفین اور سر درد

بعض مرد و زن کی عادت ہوتی ہے کہ وہ روزانہ تین چار بوتلیں پیتے یا کافی کے تین چار کپ پی جاتے ہیں۔ کیفین کی یہ زیادتی بھی انھیں سردرد میں مبتلا کر سکتی ہے۔ معتدل مقدار میں کافی پیجیے تاکہ کیفین کے فوائد حاصل ہو سکیں۔

ڈاکٹر سے رجوع کیجیے

یاد رکھیے، اگر گھریلو علاج سے ایک دو دن میں سر درد ٹھیک نہ ہو تو ڈاکٹر کے پاس جائیے۔ وہ تجربہ اپنے تجربے اور ٹیسٹوں کی مدد سے جانے گا کہ سر درد نے کیوں جنم لیا؟! اگر درد کے ساتھ بے ہوشی، کمزوری اور چکر آنا بھی وابستہ ہیں، تو فوراً ایمرجنسی سے رجوع کیجیے۔ بعض اوقات یہ حالت کسی موذی بیماری کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتی ہے۔

◆◆◆

قبول اسلام

کرن کرن روشنی

مغربی پروپیگنڈے کا شکار ایک امریکی نوجوان کی کہانی جو نور ایمان پہچاننے میں کامیاب رہا

میمونہ صدف

وہ لندن میں سفر کر رہے تھے۔ مریخ وحید احمد تیزی سے زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ ولیم اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ولیم کو لگا کہ وہ کٹر قسم کا عیسائی ہے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا "تم کیا پڑھ رہے ہو؟"

"قرآنی آیات!" احمد نے مختصر جواب دیا۔

"تم مسلمان ہو؟" ولیم ایک طرح سے چیخا۔

"ہاں"..... احمد نے پھر مختصر جواب دیا۔

"تم لوگ... تم انتہا پسند، قاتل، شدت پسند ہو۔ عورت پر ظلم کرنے والے۔ پسماندگی اور گندگی کا شکار قوم۔ کیا ہے تمہارا مذہب؟ جنگ سے پھیلنے والا؟" ولیم کی آواز میں نفرت تھی۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" کمال صبر سے احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری بھی آنکھیں ہیں۔ افغانستان، پاکستان، ایران، مصر میں تم لوگ اپنے ہی لوگوں کو مارتے ہو۔ تم قاتل اور دہشت گرد ہو۔ تمہارا مذہب قاتلوں کا مذہب ہے۔" ولیم لاوا اگل رہا تھا۔ لیکن یہ امریکی نوجوان وہی کہہ رہا تھا جو مغربی میڈیا اسے دکھاتا ہے۔

"اگر شدت پسند برے ہیں، تو وہ شدت پسند ہیں۔ کوئی مسلمان جرم کرتا ہے تو وہ مسلمان ہے۔ لیکن اس طرح اسلام کیسے برا ہو گیا؟ یہ تو امن اور محبت کا دین ہے۔" احمد دھیرے سے بولا۔

"تم یہ بات ثابت کر سکتے ہو؟" ولیم چیلنج کرنے کے انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے تم شام کو میرے اپارٹمنٹ آ جانا۔ میں تمہیں ایک دستاویزی فلم دکھاؤں گا۔" احمد نے اپنے بزنس کارڈ کے پیچھے گھر کا پتا لکھ کر اسے دے دیا۔

"اوکے۔ میں ضرور آؤں گا۔" ولیم نے کارڈ پکڑ لیا۔ دونوں کی منزل آ چکی تھی۔ احمد نے مصافحہ کیا۔ ولیم بھی طنزاً مسکرایا۔

حسب وعدہ ولیم شام 5 بجے احمد کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ احمد ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے اس کو اندر لے آیا۔

"یہ اسلام کے متعلق دستاویزی فلم ہے۔ مسلمانوں نے نہیں بنائی نہ ہی کسی مسلمان ملک میں بنی۔" ایک انگریزی فلم (اسلام ایمان کی سلطنت) "Islam :The empire of faith" کی ڈی وی ڈی

ڈی لگاتے ہوئے احمد نے کہا۔

''تم فلم دیکھو میں چائے لے کر آتا ہوں۔'' ولیم کی بات سنے بغیر وہ باورچی خانے چلا گیا۔

پردہ سکرین پر کچھ منظر ابھر رہے تھے۔ ولیم خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ کسی کو اس کے مذہب سے روکا نہیں گیا۔ کوئی عبادت گاہ تباہ نہیں کی گئی۔ غیر مسلموں کو شہر مدینہ میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ کسی کو قتل نہیں کیا گیا، کسی کی بہن بیٹی کو نہیں چھیڑا گیا۔ مدینہ میں پرامن معاشرے کی بنیاد پڑی۔ پھر مکہ فتح ہوا۔ تب بھی کسی کو کچھ نہیں کہا گیا کوئی مذہبی کتاب نہیں جلائی گئی۔ کسی کے کھیت کو آگ نہیں لگی۔ کسی بزرگ کو مارا گیا بلکہ عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔

''ولیم چائے!'' احمد نے چائے اور بسکٹ اس کے سامنے رکھ دیے۔ لیکن وہ تو کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی اور منظر میں گم تھیں۔ ولیم نے احمد کی آواز سنی اور نہ ہی مڑ کر دیکھا۔ احمد بھی خاموشی سے قریب ہی بیٹھ گیا۔

معافی' عام معافی' سب کے لیے معافی۔ وہ جو دشمن تھے ان کے لیے امن ہی امن۔ جنھوں نے ہمیشہ اسلام کو نابود کرنے کی کوشش کی تھی انھیں معاف کر دیا گیا۔

فلم ختم ہوگئی۔ ولیم تب بھی کسی خیال میں گم رہا۔ احمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''مسٹر! یہ کون سا اسلام ہے؟ اور وہ کون سا ہے جو ہم دیکھتے ہیں اور جسے دنیا جانتی ہے۔'' ولیم کسی طاقت کے زیر اثر بول رہا تھا۔

''یہ وہ اسلام نہیں جو دنیا والوں کو دکھایا جاتا ہے۔ یہ اسلام کی غلط تشریح ہے دوست۔'' احمد نے کہا۔

''او کے۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں اسلام کو' تمھارے نبیؐ کی زندگی کو!'' ولیم یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

''ولیم چائے.....'' احمد نے کہا۔

''چائے چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اسلام کے بارے میں مواد کہاں سے ملے گا؟ کیا کچھ ہے تمھارے پاس؟'' ولیم نے تیزی سے کہا۔

''میرے پاس تو صرف ایک قرآن ہے انگریزی ترجمے والا! وہ میں دے سکتا ہوں۔'' احمد نے شرمندگی سے کہا۔

''دینے کی ضرورت نہیں' میں روزانہ تمھارے گھر اسی وقت آیا کروں گا۔ آدھا گھنٹا تم مجھے پڑھاؤ۔ میں اسلامک سنٹر بھی جاؤں گا۔ میں اصل اسلام کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا۔

پھر ولیم اسلام سے متعلق کتابیں پڑھنے لگا۔ اس نے جیسے جیسے اس مذہب کو پڑھا اس پر نئے در کھلتے گئے۔ اس کے چاروں روشنی پھیل رہی تھی۔ آنکھوں پہ پڑے سب پردے ہٹتے رہے تھے۔ جھوٹ کی دھند چھٹ رہی تھی۔ اصل چہرہ تو یہ تھی جو دکھائی نہیں جاتی۔ سال 2008ء میں ولیم نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا اسلامی نام احمد رکھا گیا کیونکہ یہ اسی کی خواہش تھی۔

''میں ایک بنجر زمین کے مانند تھا اسلام نے اس پر ہرے بھرے پودے کھلا دیے۔ اب میں داڑھی بھی رکھوں گا اور اللہ کا ہر حکم مانوں گا۔ اسلام امن کا مذہب ہے اس نے مجھے بھی امن ہی دیا۔ اسلام نے مجھے مطمئن کر دیا۔'' مسلمان ہوتے ہی احمد دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ لیکن درحقیقت یہ ایک ایسی خوشی تھی جو کرن کرن روشنی کی صورت اس کے وجود میں پھیل گئی۔ ♦♦♦

WWW.PAKSOCIETY.COM
مقبول انگریزی ناول
تیسری قسط
چناروں کی قطار
جان ایم گریشم
پروفیسر محمد فاروق
اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ سیتھ ہوبرڈ نے خودکشی کیوں کی؟ اس کی زندگی میں خون، نسل اور رنگ کے رشتوں کی کیا اہمیت تھی؟ اس نے وکیل جیک بری گینس کے نام اپنے خط اور وصیت میں کیا لکھا؟ کون ہوا اہمیت سے خارج اور کون ہوا داخل؟
تو سانس روک لیجیے اور پڑھیے یہ سنسنی خیز کہانی
اردو ڈائجسٹ 161 جولائی 2014
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

گزشتہ اقساط کی تلخیص

اکہتر سالہ سیتھ ہیوبرڈ نے چنار کے ایک درخت سے لٹک کر گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیا۔ اس نے نہایت عمدہ سیاہ ڈنر سوٹ پہن رکھا تھا۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔ وہ خوش مزاج شخص تھا اور اکثر چرچ بھی جاتا تھا۔ اس کی دو سابق بیویاں تھیں جنھوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ سیتھ کے دو بچے تھے جو کہیں اور رہتے اور باپ سے بہت کم ملتے تھے۔ سیتھ ہیوبرڈ ایک فارم ہاؤس اور اس کے اردگرد درختوں سے پُر قطعہ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کامیاب کاروبار کرتا تھا۔ خودکشی سے پہلے سیتھ نے اپنے ایک ملازم کیلون کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اسے فلاں جگہ ملے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو مسٹر سیتھ کی گاڑی کھڑی تھی اور ان کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس افسروں نے آ کر سیتھ کی تصویریں لیں اور لاش درخت سے اتار کر ایمبولینس میں رکھی۔ فورڈ کاؤنٹی کا شیرف اوزی والز بھی وہاں آ پہنچا۔ وہ سیتھ ہیوبرڈ کو جانتا تھا۔ ایک افسر کیلون کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ جہاں اسے باورچی خانے کی میز پر سیتھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی جان خود لی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے اور اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں کچھ ہدایات بھی لکھی تھیں۔

فورڈ کاؤنٹی میں جیک بریگنس ایک مشہور اور نیک نام وکیل تھا۔ کارل ہیلی کا مشہور مقدمہ جیتنے کے باعث وہ شہرت اور عظمت کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد مقدمے کے مخالف دہشت گردوں نے اس کے مکان کو جلا دیا۔ اب وہ کرائے کے معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کی انشورنس کا معاملہ ابھی تصفیہ طلب تھا۔ چار دہشت گرد اب قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ [illegible] رہا ہو چکے تھے۔ اس لیے جیک ہمیشہ پستول ہمراہ رکھتا تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھتا اور تیار ہو کر دفتر چلا جاتا۔ اس کی بیوی کارلا اسکول ٹیچر تھی۔ وہ بعد میں تیار ہو کر اپنی بیٹی حنا کو ساتھ لے کر اسکول چلی جاتی تھی۔ جب جیک گھر سے باہر نکلا تو اس نے پولیس افسر [illegible] کو دیکھا جسے اوزی والز نے بریگنس فیملی کی حفاظت کے لیے وہاں متعین کر رکھا تھا۔ وہ [illegible] امریکی گاڑی میں اپنے دفتر کے قریب کلینٹن چوک میں کافی شاپ پر پہنچ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے [illegible] سیتھ ہیوبرڈ کی خودکشی پر گفتگو کی۔ اس نے سیتھ کی جائداد اور ممکنہ وصیت میں دلچسپی لی کیونکہ اس کے [illegible] وکیل کے لیے اچھی خاصی فیس ہوتی ہے۔ جیک حسب معمول کلینٹن چوک میں روزانہ کی چہل قدمی کے بعد اپنے [illegible] دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس کی سیکرٹری راکسی نچلی منزل پر استقبالیہ کمرے میں بیٹھتی اور وہ خود بالائی منزل پر بیٹھتا تھا۔ اس روز کی ڈاک میں جیک کو اپنے نام ایک لفافہ ملا جس پر بھیجنے والے کا نام سیتھ ہیوبرڈ تحریر تھا۔ اس نے لفافہ احتیاط سے کھولا۔ اس میں سیتھ ہیوبرڈ کا ایک خط برآمد ہوا جس میں اس نے اپنی خودکشی کی اطلاع دی تھی اور اپنی وصیت کے معاملے میں اس کو اپنا وکیل نامزد کیا تھا۔ خط کے ساتھ سیتھ کی لکھی وصیت بھی تھی جس میں اس نے اپنے دونوں بچوں اور دونوں سابق بیویوں کو جائداد سے یکسر محروم کر دیا تھا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ اپنی ملازمہ اور دوست لیٹی لینگ کے نام کر دیا تھا جس نے بیماری کے زمانے میں اس کی خدمت کی تھی۔ جیک نے خط اور وصیت کی ایک نقل راکسی کو دی، دو نقول اپنے ڈیسک میں رکھیں اور ایک نقل بینک کے لاکر میں رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کاؤنٹی شیرف اوزی والز کو ملنے اس کے دفتر گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر سیتھ ہیوبرڈ کی خودکشی، اس کی وصیت اور سیاہ فام لیٹی لینگ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

"میں اس کو جانتا ہوں" اس نے ہمیشہ کی طرح محتاط لہجے میں کہا۔ "وہ ایک چھوٹے سے علاقے لٹل زلاٹا میں رہتی ہے۔"

جیک نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں اس علاقے سے گزر رہا ہوں۔"

"ان دیہات میں سب کے سب سیاہ فام ہیں۔ اس کی شادی سائمن لینگ نامی شخص سے ہوئی ہے جو کافی حد تک نکھٹو اور آوارہ ہے۔ کبھی کبھی شراب نوشی بھی کرتا ہے۔"

"میں کبھی لینگ خاندان کے کسی فرد سے نہیں ملا۔"

"آپ کبھی کسی لینگ سے ملنا پسند نہیں کریں گے۔ جب وہ نشے میں نہیں ہوتا تو میرا خیال ہے وہ ٹرک یا بلڈوزر چلاتا ہے۔ میں جانتا ہوں اس نے ایک دو مرتبہ سنار ملوں میں بھی کام کیا۔ [illegible] چار یا پانچ بچے ہیں۔ ایک لڑکا قید خانے میں ہے۔ میرا خیال ہے ایک لڑکی فوج میں ہے۔ میرا اندازہ ہے لیٹی پینتالیس سال کی ہے۔ اس کا تعلق ہیم نیلی سے ہے۔ اس خاندان کے زیادہ لوگ ابھر نہیں ہیں۔ آدمی لینگ ہے اور بدقسمتی سے حالات ان سے بکھرے پڑے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سیٹھ ہیوبرڈ کو جانتے تھے؟"

"کیا آپ سیٹھ ہیوبرڈ کو جانتے تھے؟"

"کسی حد تک۔ اس نے مجھے دونوں انتخابی مہمات کے لیے خفیہ طور پر پچیس پچیس ہزار ڈالر نقد دیے تھے۔ بدلے میں وہ مجھ سے کچھ بھی نہیں چاہتا تھا۔ درحقیقت اس نے میری فرم کے پہلے چار سال مجھ سے ملنے سے اجتناب کیا۔ میں اس سے گزشتہ موسم گرما میں ملا جب میں دوبارہ الیکشن لڑ رہا تھا اور اس نے مجھے ایک اور لفافہ دیا تھا۔"

"آپ نے نقد رقم لے لی؟"

"مجھے تمہارا لہجہ اچھا نہیں لگا جیک" اوزی نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہاں میں نے نقد رقم لی تھی کیونکہ میں جیتنا چاہتا تھا۔ نیز میرے مخالفین نقد رقوم لے رہے تھے۔ یہاں سیاست ایک مشکل کام ہے۔"

"میرے لیے یہ سب ٹھیک ہے۔ بوڑھے کے پاس کتنا روپیہ تھا؟"

"وہ کہتا تھا کافی زیادہ ہے۔ ذاتی طور پر مجھے معلوم نہیں۔ یہ ہمیشہ ایک راز رہا ہے۔ [illegible] کی ایک ناخوشگوار طلاق میں وہ سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔ بیری رکس نے اس کا قانونی صفایا کر دیا تھا۔ اس وجہ سے اس نے اپنے کاروبار کو مکمل طور پر چھپا کر رکھا۔"

"ذہین آدمی تھا۔"

"وہ کچھ زمین کا مالک تھا اور ہمیشہ عمارتی لکڑی کے کاروبار میں مشغول رہا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"اس کے دو بالغ بچوں کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"میں نے ہرشل ہیوبرڈ سے کل پانچ بجے سہ پہر کے قریب بات کی اور اس کو یہ بری خبر سنائی۔ وہ اٹلانٹا میں رہتا ہے لیکن مجھے اس کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات نہیں ملیں۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی بہن رمونا کو فون کرے گا اور وہ دونوں جلد وہاں پہنچ جائیں گے۔ سیٹھ نے ایک ورق پر کچھ ہدایات لکھ چھوڑی ہیں کہ اس کی تجہیز و تکفین کس طرح کی جائے۔ کل سہ پہر چار بجے چرچ میں دعائیہ تقریب ہوگی اس کے بعد تدفین کی جائے گی۔" اوزی رکا اور اس نے خط دوبارہ پڑھا۔ "یہ

ایک طرح کا ظلم لگتا ہے۔ ہے نا جیک!" سیتھ بتا رہا تھا کہ اس کے اہل خاندان باقاعدہ اس کی تدفینی رسومات میں شامل ہوں اس سے پہلے کہ انھیں پتا چلے کہ اس نے اپنی وصیت میں ان کو جائداد سے محروم کیا ہے۔"

جیک ہنسا اور کہنے لگا "او! میرا خیال ہے یہ بہت عمدہ ترکیب ہے۔ آپ تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے جانا چاہتے ہیں؟"

"صرف اس صورت میں اگر آپ جائیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے وہ خاموش بیٹھے رہے۔ باہر کی آوازیں اور فون کی گھنٹیاں بجتے ہوئے سنتے رہے اور دونوں جانتے تھے کہ انھوں نے کئی کام کرنے ہیں۔ لیکن اتنے زیادہ سوالات اور ایک بہت بڑا لالچ بالکل قریب تھا۔

"میں حیران ہوں کہ ان لڑکوں نے کیا دیکھا تھا" جیک نے کہا۔ "سیتھ اور اس کے بھائی نے۔"

اوزی نے سر انکار میں ہلایا۔ "کچھ پتا نہیں۔" اس نے وصیت پر نظر ڈالی اور کہا "ہرشل ایف ہیوبرڈ۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں کوشش کر کے اسے تلاش کر سکتا ہوں۔ اس کا نام کمپیوٹر میں ڈال دوں گا اور دیکھوں گا اگر اس کا کہیں کوئی ریکارڈ موجود ہے۔"

"یہ کام ضرور کیجیے گا۔ شکریہ۔"

ایک وقفے کے بعد اوزی نے کہا "جیک۔ آج صبح میں نے بہت سے کام کرنے ہیں۔"

جیک اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا "مجھے بھی بہت کام ہیں۔ شکریہ۔ میں بعد میں فون کروں گا۔"

ممفس کے مرکز سے فورڈ کاؤنٹی تک بذریعہ کار صرف ایک گھنٹے کا سفر تھا لیکن ہرشل ہیوبرڈ کے لیے یہ تنہا سفر پورا ایک دن لے لیتا تھا۔ یہ اس کا اپنے ماضی کی طرف ایک ناخوشگوار سفر ہوتا تھا اور وہ متعدد وجوہات کی بنا پر یہ سفر صرف ضرورت کے وقت کرتا اور یہ اکثر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے جوتوں سے کیچڑ جھاڑتے ہوئے گھر چھوڑ دیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ وہ جہاں تک ممکن ہوا یہاں آنے سے گریز کرے گا۔ وہ معصومانہ طور پر اپنے والدین کے اختلافات کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور جب بالآخر ان کے درمیان علیحدگی ہوئی تو اس نے اپنی والدہ کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے باپ اور کاؤنٹی کو چھوڑ دیا۔ اٹھائیس سال بعد اس کو مشکل سے یقین آ رہا تھا کہ اس کا بوڑھا باپ آخر کار مر چکا تھا۔

ہرشل کے اصرار پر مصالحت کی کوششیں ہوئی تھیں اور سیتھ نے کچھ عرصے تک بیٹے اور اس کے بچوں کو برداشت کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری بیوی اور دوسری ناخوشگوار شادی نے معاملات کو پیچیدہ بنا دیا۔ پچھلے ایک عشرے سے سیتھ نے صرف اپنے کام سے غرض رکھی تھی۔ اگر سالگرہوں پر وہ فون کرتا تھا اور کبھی کبھار کارڈ بھی بھیج دیتا تھا لیکن باپ ہونے کے ناتے اس کی کوششیں کبھی حد سے نہیں بڑھیں۔ وہ جتنا زیادہ کام کرتا تھا اتنا ہی اپنے بیٹے سے نفرت کرتا تھا اور یہ ان کے درمیان جھگڑے کا ایک بڑا سبب تھا۔

ہرشل ممفس کے کیمپس کے قریب ایک شراب خانہ چلاتا تھا۔ اس کا شراب خانہ بہت مقبول اور مصروف تھا۔ وہ اپنے بل ادا کرتا تھا اور کچھ نقدی بچا کر رکھ لیتا تھا۔ باپ کی طرح بیٹا بھی اپنی ناخوشگوار طلاق کے تکلیف دہ اثرات سے باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ طلاق کا مقدمہ اس کی سابق بیوی نے جیتا اور وہ دو بچے اور سارا روپیہ لے گئی۔ اب چار سال سے وہ ممفس کے مرکزی

علاقے میں ایک پرانے خستہ حال گھر میں اپنی والدہ کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ ان کے ساتھ کچھ بلیاں بھی رہتی تھیں اور کبھی کبھار کوئی بے گھر فرد بھی جسے اس کی والدہ گھر لے آتی تھی۔ اس کی والدہ بھی سیتھ کے ساتھ ناخوشگوار زندگی سے گھائل اور نیم پاگل ہو چکی تھی۔

اس نے فورڈ کاؤنٹی کی حد بندی عبور کی تو مزید افسردہ ہوگیا۔ وہ ایک چھوٹی سی پرانی ڈاٹسن اسپورٹس کار چلا رہا تھا جو اس نے اس لیے خریدی تھی کہ اس کا باپ تمام جاپانی کاروں اور تمام جاپانی چیزوں سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا ایک چھازاد بھائی جنگ عظیم دوم میں جاپانی فوجیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس لیے وہ جاپانیوں کے خلاف شدید تعصب کا شکار تھا۔

ہرشل کو کلینٹن سے پہلے ایک دیہاتی ٹیکسی اسٹیشن ملا۔ وہ ایک اور دنیا میں داخل ہو چکا تھا جسے وہ طویل عرصہ پہلے چھوڑ چکا تھا اور اسے ہمیشہ کے لیے بھول جانا چاہتا تھا۔ اس کو ان تمام دوستوں پر ترس آیا جو ابھی تک فورڈ کاؤنٹی میں رہتے تھے اور کبھی اسے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ کلینٹن ہائی اسکول میں اس کے دو تہائی سینئر ساتھی ابھی تک اسی علاقے میں تھے اور فیکٹریوں میں کام کر رہے تھے، کچھ ٹرک چلاتے اور کچھ لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ دس سال بعد اپنے دوستوں سے ملاقات نے اس کو اتنا افسردہ کر دیا کہ اس کے بعد بیس سال تک اس نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔

سیتھ کی پہلی طلاق کے بعد ہرشل کی والدہ فورڈ کاؤنٹی چھوڑ کر میمفس میں آباد ہوگئی۔ دوسری طلاق کے بعد ہرشل کی سوتیلی والدہ اس جگہ کو چھوڑ کر بھاگی اور جیکسن میں جا بسی۔ سیتھ اپنے گھر اور اس کے اردگرد اراضی کے ساتھ چمٹا رہا۔ اس وجہ سے اسے مجبوراً بچپن کا ڈراؤنا خواب دیکھنا پڑتا جب وہ سیتھ سے ملنے جاتا تھا۔ یہ گھر جو سیتھ کے کینسر میں مبتلا ہونے تک سال میں ایک مرتبہ آتا تھا، گھر سرخ اینٹوں سے بنا ایک منزلہ فارم ہاؤس جیسا تھا۔ یہ مین کاؤنٹی روڈ کے عقب میں بلوط اور دیودار کے گھنے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک لمبا، کھلا لان تھا جہاں ہرشل بچپن میں کھیلا کرتا تھا لیکن وہ اپنے باپ کے ساتھ کبھی نہیں کھیلا تھا۔ وہ کبھی بھی بیس بال یا فٹ بال کے ساتھ وہاں نہیں کھیلے تھے۔ جب وہ گیراج کی طرف مڑا تو اس نے اس وسیع لان کو دیکھا۔ وہ حیران ہوا کہ اب وہ کتنا چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے گاڑی ایک اور کار کے پیچھے کھڑی کر دی۔ وہ اس کار کو نہیں پہچانتا تھا۔

انسان کی تخلیق کیوں ہوئی

قرآن مجید کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ اللہ کو عبادت، رسول اللہ ﷺ کو اطاعت اور مخلوق کو خدمت سے راضی کرو۔ الخلق عیال اللہ..... مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج مخلوق کی خدمت کا بہترین ذریعہ ہے۔ جبکہ رسول اکرم کی اطاعت بھی خدمت خلق کا بہترین مظہر ہے۔ اللہ کو عبادت کے لیے ہماری احتیاج نہیں تھا بے شمار مخلوق فرشتوں سمیت اس کی عبادت گزار ہے۔ لیکن اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات اور مسجود ملائک بنایا اور علم کا تاج اس کے سر پہ سجایا تاکہ وہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کو رہبر و راہنما بنا سکے۔ تاکہ ہم وہ کام کریں جن سے اللہ راضی ہوتا ہے۔

(پروفیسر ڈاکٹر محمد مزمل احسن شیخ، لاہور)

اس پر فورڈ کار کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نمبر کو بغور دیکھا۔

اس کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ اسے اس کے باپ کی موت کی اطلاع نہیں دی جائے گی اگرچہ اس کے دوستوں نے اس کو اس کے برعکس خبردار کیا تھا۔ آپ بڑے ہو کر بالغ فرد بن جاتے ہیں۔ آپ اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھ لیتے ہیں۔ آپ اپنے باپ سے بغلگیر نہیں ہوتے کیونکہ وہ اس مزاج کا آدمی نہیں۔ آپ تحائف یا خطوط نہیں بھیجتے اور وہ مر جاتا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ آپ اس کے بغیر آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ تدفین پر تھوڑی سی افسردگی، ایک یا دو آنسو لیکن دنوں کے اندر یہ آزمائش گزر جاتی ہے اور آپ بغیر کسی نقصان کے اپنی زندگی میں واپس آ جاتے ہیں اور ان دوستوں کے پاس اپنے باپوں کے بارے میں کہنے کے لیے شفقت بھری باتیں تھیں۔ انھوں نے اپنے باپوں کو بعد از مرگ مسائل پر پریشان ہونے بغیر اپنے سامنے بوڑھا ہوتے اور مرتے دیکھا تھا اور ان میں سے ہر ایک غم و اندوہ کا شکار ہوا تھا۔

ہرشل کو کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ نہ احساسِ زیاں، نہ زندگی کے خاتمے پر افسردگی، نہ ہی اس مصیبت زدہ آدمی کے لیے کوئی رحم جس نے اپنی جان خود لے لی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی میں بیٹھے مکان کی طرف دیکھا اور تسلیم کیا کہ وہ اپنے باپ کے لیے کوئی جذبات محسوس نہیں کر رہا۔ شاید تھوڑا سا سکون کا احساس کہ اس کی موت ہرشل کی زندگی کی ایک الجھن کم کر دے گی۔ شاید۔

وہ دروازے تک گیا جو عین اس وقت کھل گیا۔ سامنے لیلیٰ لینگ کھڑی ٹشو سے آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ "ہیلو، مسٹر [illegible]" اس نے جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہیلو لیلیٰ" اس نے پورچ کے فرش پر پڑے رگ کے ذریعے پیر رگڑتے ہوئے کہا۔ اگر وہ اسے بہتر طور پر جانتا ہوتا تو وہ اس سے بغلگیر ہوتے یا مشترکہ ہمدردی کے اظہار کے لیے جلدی سے آگے بڑھتا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اس سے صرف تین چار بار ملا تھا اور وہ بھی اچھے طریقے سے نہیں۔ وہ ایک سیاہ فام [illegible] تھی اور توقع کی جاتی تھی کہ جب خاندان کے افراد اکٹھے ہوں تو وہ ذرا فاصلے پر رہے۔

"مجھے بہت افسوس ہے" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی افسوس ہے" ہرشل نے کہا۔ وہ اس کے پیچھے ٹی وی روم میں سے گزر کر باورچی خانے تک گیا جہاں اس نے کافی کے جگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میں نے ابھی بنائی ہے۔"

"باہر تمھاری کار کھڑی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں جناب۔"

"تم نے کار راستے میں کیوں کھڑی کی؟ میرا خیال تھا کہ تمھاری کار کی جگہ [illegible] پک اپ کے ساتھ جگہ مخصوص ہے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں نے بے خیالی میں وہاں کھڑی کر دی۔ میں کار ابھی ہٹا دوں گی۔"

"نہیں، کوئی بات نہیں۔ مجھے کپ میں تھوڑی کافی ڈال دو۔ چینی کے دو ٹکڑے۔"

"ہاں جناب۔"

"زیڈی کی کیڈلک کار کہاں ہے؟"

لیلیٰ نے احتیاط سے کپ میں کافی ڈالی۔ "شیرف اسے لے گیا تھا۔ آج رات واپس لے آئے گا۔"

"وہ کار کہاں لے گئے؟"

"آپ کو ان سے وہ بات کرنا پڑے گا۔"

ہرشل نے میز کے پیچھے سے کرسی کھینچی، اس پر بیٹھ گیا اور کپ ہاتھوں میں لے لیا۔ اس نے ایک گھونٹ لیا، تیوری چڑھائی اور بولا "تمھیں ڈیڈ کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

لیٹی بازو سینے پر باندھے ایک کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ ہرشل نے جلدی سے سر سے پاؤں تک اس پر نگاہ ڈالی۔ وہ ہمیشہ کی طرح سفید سوتی ڈریس پہنے ہوئے تھی، گھٹنوں تک لمبا، کمر پر تھوڑا سا تنگ جہاں وہ کچھ ڈالی تھی اور اس کی بھرپور چھاتی پر بہت تنا ہوا۔

اس نے اس کی نگاہ کو اپنی طرف کھینچا، وہ نگاہوں کو کھینچتی تھی۔ پینتالیس سال کی عمر میں پانچ بچوں کی پیدائش کے بعد بھی لیٹی ٹینگ کچھ نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی لیکن سفید فام مردوں کی نہیں۔ اس نے کہا "کیلون نے کل رات مجھے فون کیا اور بتایا کہ یہ سانحہ پیش آچکا ہے۔ پھر کہا کہ آج صبح میں گھر کھول دوں اور آپ سب کا انتظار کروں۔"

"کیا تمھارے پاس چابی ہے؟"

"نہیں جناب۔ میرے پاس کبھی بھی چابی نہیں تھی۔ مکان مقفل نہیں تھا۔"

"کیلون کون ہے؟"

"سفید فام آدمی جو یہاں فارم پر کام کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ مسٹر سیتھ نے اسے کل صبح فون کر کے دو بجے پل پر ملاقات کرنے کے لیے کہا۔ یقیناً وہ وہاں تھا۔" اس نے اپنی آنکھیں ٹشو سے خشک کرنے کے لیے گفتگو روک دی۔

ہرشل نے ایک اور گھونٹ لیا۔ "شیرف نے مجھے بتایا کہ ڈیڈ نے ایک تحریر اور کچھ ہدایات چھوڑی ہیں۔"

"میں نے اس طرح کی کوئی چیز نہیں دیکھی لیکن کیلون نے اسے دیکھا۔ اس نے بتایا کہ مسٹر سیتھ نے لکھا تھا کہ وہ اپنی جان خود لے رہے ہیں۔" اس نے رونا شروع کر دیا۔

ہرشل نے کچھ دیر سنا اور جب وہ خاموش ہوئی تو اس نے پوچھا "تم نے یہاں کتنا عرصہ کام کیا ہے لیٹی؟"

اس نے گہرا سانس لیا اور اپنے رخسار صاف کیے۔ "مجھے معلوم نہیں، تقریباً تین سال۔ میں نے ہفتے میں دو دن سوموار اور بدھ چند گھنٹے صفائی کا کام شروع کیا۔ زیادہ وقت نہیں لگتا تھا کیونکہ مسٹر سیتھ تنہا تھے۔ وہ کافی صاف ستھرے اور نفیس آدمی تھے۔ پھر انھوں نے مجھے کھانا پکانے کا کہا اور مجھے یہ کام کر کے خوشی ہوئی۔ کچھ اور گھنٹے کام۔ میں کچھ کھانا پکاتی اور اسے چولھے پر یا فرج میں رکھ دیتی تھی۔ پھر جب وہ بیمار ہوئے تو انھوں نے مجھے ہر روز صبح آنے اور اپنی ضروریات کا خیال رکھنے کو کہا۔ جب کیموتھراپی بہت تکلیف دہ ہوگئی تو وہ بیمار اور زیادہ تر وقت بستر ہی پر پڑے رہتے تھے۔"

"میرا خیال تھا کہ انھوں نے ایک نرس کو ملازم رکھا ہوا تھا۔"

لیٹی جانتی تھی کہ مسٹر ہرشل اور مسز ڈوفیو نے اپنے باپ کو اس کی بیماری کے دوران بہت کم دیکھا تھا۔ لیٹی کو سب کچھ معلوم تھا۔ ان کو تقریباً کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ تاہم وہ ہمیشہ کی طرح مؤدب تھی۔

"ہاں جناب، انھوں نے کچھ دیر کے لیے نرس کو رکھا تھا۔ پھر ان کی حالت ایسی ہوگئی کہ وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ نرس بدل دیتے تھے اور آپ

کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کون آئے گی۔“

”تو تم یہاں سارا وقت کب سے کام کر رہی ہو؟“

”تقریباً ایک سال سے۔“

”اور تمھیں کیا معاوضہ ادا کرتے تھے؟“

”پانچ ڈالر فی گھنٹا۔“

”پانچ ایک گھریلو کام کے لیے زیادہ معلوم ہوتا ہے، ہے نا؟ میرا مطلب ہے کہ میں ہنگس میں رہتا ہوں جو ایک بڑا شہر ہے اور میری والدہ اپنی خادمہ کو ساڑھے چار ڈالر فی گھنٹا ادا کرتی ہیں۔“ لیلی نے سر ہلا دیا کیونکہ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ مسٹر سیتھ اس کو نقد ادائی کرتے تھے اور اکثر اس میں تھوڑا سا اضافہ کر دیتے تھے اور پچھلے دنوں انھوں نے اس کو پانچ ہزار ڈالر ادھار بھی دیے تھے جب اس کا بیٹا مصیبت میں پھنس گیا اور جیل چلا گیا تھا۔ وہ قرض صرف چار دن پہلے معاف کر دیا گیا تھا۔ ان چیزوں کی کوئی تحریر موجود نہیں تھی۔

ہرشل بیزاری سے کافی پیتا رہا۔ لیلی فرش کو گھورتی رہی۔ باہر دو کاروں کے دروازے زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔

ریمونا بیرونی دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی رو رہی تھی۔ وہ پورچ میں اپنے بڑے بھائی سے بغلگیر ہو گئی اور وہ بھی بند آنکھوں، کھلے ہونٹوں اور شکن آلود پیشانی کے ساتھ جذباتی دکھائی دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ریمونا غم سے مغلوب حقیقتاً آہ و زاری کر رہی تھی جبکہ ہرشل اس کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ریمونا آگے بڑھی اور جلدی سے لیلی سے لپٹ گئی جیسے وہ دونوں ایک ہی مہربان باپ کے فطری بیٹے ہوں۔ اس دوران ہرشل ابھی تک پورچ میں ریمونا کے شوہر آیان ڈافو کا استقبال کر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ آیان ڈافو ریاست مسسی پی کے دارالحکومت اور سب سے بڑے شہر جیکسن میں مقیم ایک بینکار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اگرچہ ان کے بینک کافی عرصہ پہلے ناکام ہو چکے تھے لیکن آیان ہمیشہ اپنے احساس برتری کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ اس نے شادی ایک کمتر خاندان میں کی تھی اور اب وہ بھی دوسروں کی طرح کچھ دولت حاصل کرنے کے چکر میں تھا۔

جب دونوں نے شائستگی سے ہاتھ ملایا تو ہرشل نے اس کی گاڑی کی طرف نظر دوڑائی۔ کوئی نئی چیز نہیں۔ ایک چمکتی ہوئی بظاہر نئی سفید سیڈان مرسیڈیز۔ بس تازہ ماڈل۔ ریمونا کی بے فوقی اور بے تکلف گفتگو کے باعث ہرشل جانتا تھا کہ آیان اپنی گاڑیاں پٹے پر لیتا تھا... انھیں جلدی ہی بیچ دیتا تھا۔ ماہوار ادائی ان کی مالی استطاعت پر بوجھ ہوتا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مسٹر اور مسز ڈافو کا شمالی جیکسن میں ایک اچھی گاڑی میں دکھائی دینا کہیں زیادہ اہم تھا۔

اور کار والے... ڈی لاؤنج میں اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔ لیلی نے کافی اور کولا... پیش کیے۔ پھر فرض شناسی کے طور پر دو روٹی اور ہال کے سرے پر ایک خواب گاہ کے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔ یہاں سے وہ اکثر مسٹر سیتھ کو ٹی وی لاؤنج میں فون کرتے سنتی تھی۔ یہاں سے وہ سب کچھ سن سکتی تھی۔ ریمونا چیخی اور روئی بھی اور کہنے لگی کہ یہ سب کچھ کتنا ناقابل یقین ہے۔ دونوں آدمی سنتے رہے بس کبھی کبھار ایک آدھ لفظ کہہ دیتے تھے۔ جلد ہی دروازے کی گھنٹی ان کی گفتگو میں مخل ہوئی۔ چرچ سے دو خواتین ایک کیک اور گوشت

کی ڈش لے کر آئی تھیں۔ کھانا قبول کرنے سے انکار نہیں کیا گیا۔ لیٹی جلدی سے آگے آئی اور کھانا باورچی خانے میں لے گئی۔ خواتین بغیر دعوت کے ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں اور گپ شپ میں شریک ہو گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کل سیتھ بھائی سے چرچ میں ملی تھیں اور وہ واقعی اچھے لگ رہے تھے۔ وہ ان کے پھیپھڑے کے سرطان کے بارے میں جانتی تھیں لیکن ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے اس پر قابو پا لیا تھا۔

ہرشل اور ڈیفو نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیٹی دور سے سنتی رہی۔ چرچ سے آنے والی خواتین ہر قسم کے سوالات پوچھنے کے لیے بے قرار تھیں: ''انھوں نے یہ کام کیسے کیا؟''

اور ''کیا انھوں نے کوئی تحریر چھوڑی؟'' اور ''روپیہ کس کو ملے گا؟'' اور ''کیا کسی دھوکے کا امکان ہے؟'' لیکن ان پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس قسم کی دخل اندازی کو پسند نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے بیس منٹ کی نیم خاموشی کے بعد ان کی دلچسپی ختم ہوئی اور وہ خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔

ان کی روانگی کے پانچ منٹ بعد گھنٹی دوبارہ بجی۔ اندر آنے والے راستے پر تین کاریں ان کی توجہ حاصل کر رہی تھیں۔

''لیٹی دروازہ کھولو'' ہرشل نے ٹی وی لاؤنج سے چلا کر کہا۔ ہم باورچی خانے میں چھپنے کے لیے جا رہے تھے۔

یہ سڑک پار والی ہمسائی تھی جو لیمن کیک ساتھ لائی تھی۔ لیٹی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وضاحت کی کہ مسٹر سیتھ کے بچے واقعی یہاں ہیں لیکن وہ ابھی کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔ ہمسائی نے تھوڑی دیر پورچ میں چہل قدمی کی۔ وہ اندر جانے اور خاندان کے مسئلے میں ٹانگ اڑانے کے لیے بے چین تھی لیکن لیٹی نے شائستگی سے اسے اندر آنے سے روک دیا۔ آخرکار جب وہ چلی گئی تو لیٹی کیک باورچی خانے میں لے گئی اور بغیر چھیڑے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

باورچی خانے کی میز پر ان کو مطلب کی بات شروع کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ''کیا آپ نے وصیت دیکھی ہے؟'' رمونا نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں اب بالکل صاف، دلچسپی اور شک سے چمک رہی تھیں۔

''نہیں'' ہرشل نے کہا۔ ''کیا تم نے دیکھی ہے؟''

''نہیں۔ میں یہاں کوئی دو ماہ پہلے آئی تھی۔''

''یہ جولائی کا مہینا تھا'' آیان نے مداخلت کی۔

''ٹھیک ہے جولائی تھا۔ اور میں نے ڈیڈی سے ان کی وصیت کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ٹیوپیلو میں کچھ وکلا نے اسے لکھا تھا اور یہ کہ ہمارا خیال رکھا جائے گا۔ بس یہ بات ہوئی تھی۔ کیا آپ نے کبھی اس سلسلے میں ان سے بات کی؟''

''نہیں'' ہرشل نے اعتراف کیا۔ ''مجھے یہ ٹھیک نہیں لگا۔ بوڑھا کینسر سے مر رہا تھا اور میں اس سے وصیت کے بارے میں پوچھوں؟ میں یہ نہیں کر سکتا تھا۔''

لیٹی ہال کے دروازے کے پیچھے چھپی ہر بات سن رہی تھی۔

''اس کے اثاثوں کے بارے میں کیا خبر ہے؟'' آیان نے سرد لہجے میں پوچھا۔ اس کے تجسس کی معقول وجہ تھی کیونکہ اس کے اپنے اثاثے بھاری رقوم کے عوض رہن محدود تھے۔ اس کی کمپنی قرضہ لے کر سستے شاپنگ

سینٹر اور دکانیں تعمیر کرتی تھی۔ وہ قرض خواہوں کے مطالبے سے بچنے کے لیے تیز رفتاری سے کام کرتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ادائی کے لیے چلاتے رہتے تھے۔

ہرشل نے اپنے برادرِ نسبتی کو خاموشی سے گھور کر دیکھا جو ایک خون چوسنے والی جونک کی طرح تھا۔ تینوں کو شبہ تھا کہ سمتھ کی اراضی میں کوئی گڑبڑ ہو گی اس لیے جلد بازی کا کوئی جواز نہ تھا لیکن جلد ہی وہ آپس میں الجھ رہے ہوں گے۔

ہرشل نے کندھے سکیڑے اور کہا "میں نہیں جانتا۔ تم نے دیکھا ہے وہ اپنے معاملات خفیہ رکھتا تھا۔ یہ گھر، اس کے اردگرد وسیع زمین، مزرک پر فیکٹری کا گودام، لیکن مجھے اس کے قرضوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ تم نے کبھی کاروباری باتیں نہیں کیں۔"

"آپ نے کبھی کسی چیز کے بارے میں بات نہیں کی؟" ریحونا نے میز کے دوسری طرف سے چوٹ لگائی، پھر فوراً اپنے الفاظ واپس لے لیے "مجھے افسوس ہے ہرشل پلیز۔"

لیکن بہن کی طرف سے اس گھٹیا جملے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہرشل نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا "مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ تم اور بڈھا ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے۔"

ایان نے جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے کہا "کیا یہاں ان کا کوئی دفتر یا ایسی جگہ نہیں جہاں وہ اپنے ذاتی کاغذات رکھتے ہوں۔ ہم یہاں تلاش کیوں نہیں کر سکتے؟ یہاں ضرور بینک سٹیٹمنٹس، زمین کی قانونی دستاویزات اور معاہدات موجود ہوں گے۔ میں شرط لگاتا ہوں یہاں گھر میں وصیت کی کوئی نقل بھی ضرور ہو گی۔"

"لیلی کو معلوم ہونا چاہیے" ریحونا نے کہا۔

"بہتر ہے ہم اس کو ملوث نہ کریں" ہرشل نے کہا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ ڈیڈ اس کو پورے وقت کے لیے پانچ ڈالر فی گھنٹہ ادا کر رہے تھے؟"

"پانچ ڈالر" آیان نے دہرایا۔ "ہم نرس کو کیا ادا کر رہے ہیں؟"

"تین ڈالر پچاس سینٹ" ریحونا نے کہا "تین گھنٹوں کے لیے۔"

"ہم نیمفس میں ساڑھے چار ڈالر ادا کر رہے ہیں" ہرشل نے فخر سے بتایا جیسے کہ اس کی والدہ کے بجائے وہ خود چیک لکھتا ہو۔

"سمتھ جیسا کنجوس بڈھا ایک ہاؤس کیپر کو اتنا زیادہ معاوضہ کیوں ادا کرتا تھا؟" ریحونا نے سوچتے ہوئے کہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔

"بہتر ہے وہ اس سے لطف اٹھا لے" ہرشل نے کہا "اس کے دن گنے جا چکے ہیں۔"

"کیا تم اسے کام سے فارغ کر رہے ہیں؟" ریحونا نے پوچھا۔

"فوراً۔ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ تم چاہتی ہو کہ ہم اتنا روپیہ خرچ کرتے رہیں؟ دیکھو بہن، ہمارا منصوبہ یہ ہے۔ ہم تجہیز و تکفین سے فارغ ہوں گے۔ لیلی سے کہیں گے کہ چیزوں کو ترتیب سے اپنی اپنی جگہ رکھ دے۔ پھر ہم اس کو فارغ کر دیں گے اور گھر مقفل کر دیں گے۔ اگلے ہفتے اسے مارکیٹ میں فروخت کے لیے رکھ دیں گے اور اچھے نتائج کی امید رکھیں گے۔ اس کا کوئی جواز نہیں کہ وہ پانچ ڈالر گھنٹہ پر یہاں گھومتی پھرے۔"

دور فاصلے پر، لیتھی کا سر مایوسی سے لٹک گیا۔

"اتنی جلدی نہ کی جائے۔" آیان نے شائستگی سے کہا۔ "ہم جلدی ہی وصیت دیکھ لیں گے۔ اس سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ جائداد فروخت کرنے کے لیے مختار خاص کون ہوگا۔ غالباً تم دونوں میں کوئی ایک۔ یہ عموماً زندہ شریک حیات یا کوئی ایک بچہ ہوتا ہے۔ مختار خاص وصیت کی شرائط کے مطابق جائداد کا بندوبست کرے گا۔"

"میں یہ سب جانتا ہوں" ہرشل نے کہا۔ اگرچہ اسے حقیقت میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ چونکہ آیان وکالت سے روزانہ معاملات طے کرتا تھا اس لیے وہ اکثر خاندان میں قانونی ماہر کا کردار ادا کرتا تھا۔ ہرشل کے اس سے نفرت کرنے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک یہ بھی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ ڈیڈی مر چکے ہیں" ریکونا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

ہرشل نے گھور کر اسے دیکھا اور ہاتھ سے اسے تھپتھپایا۔ اس کے علم میں تھا کہ وہ سال میں ایک مرتبہ بابا کیلی فورڈ کا دورہ کرنے جاتی تھی کیونکہ آیان اس جگہ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اور سیتھ آیان کو۔ وہ صبح نو بجے جیکسن سے روانہ ہوتی اور کلیفٹن سے دس میل شمال میں بوب سٹرک بار بی کیو ریستوران پر سیتھ سے ملاقات پر اصرار کرتی، پھر اس کے ساتھ گھر جاتی جہاں دو بجے تک قیام کرکے وہ اذیت کا شکار ہو جاتی اور چار بجے واپسی کا سفر اختیار کر لیتی تھی۔ اس کے پرائیویٹ مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے دونوں بچے سالوں سے اپنے نانا کو نہیں ملے تھے۔ یقینی طور پر ہرشل دعویٰ کر سکتا تھا کہ وہ اپنے ڈیڈ کے اتنا قریب ہرگز نہ تھی

بلا نہیں ٹلی

ایک صاحب کسی کے ہاں مہمان بن کے آئے تو ٹلنے کا نام نہ لیا۔ ایک دن میزبان یہی سوچتے ہوئے گھر آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح چھٹکارا پایا جائے۔ آخرکار اسے ایک ترکیب سوجھی۔ گھر داخل ہوتے ہی کسی بہانے بیوی پر برسنا شروع کر دیا۔ بیوی چلا کر بولی "میرا تو خود تمہارے ساتھ گزارا نہیں۔ میں اپنے میکے جاتی ہوں۔"

"مہمان نے جب بیوی کی تکرار سنی تو خاموشی سے اپنا سامان سمیٹا اور باہر نکل گیا۔ مہمان کے جاتے ہی شوہر نے بیوی سے کہا "میں سچ مچ تھوڑی ڈانٹ رہا تھا۔

بیوی بولی اور میں کون سا سچ مچ جا رہی تھی۔

پیچھے سے مہمان بولا "تو بھلا میں کب سچ مچ جا رہا تھا۔

(مراسلہ: حسنین شبیر۔ قصور)

ہیلن کم از کم وہاں بیٹھا بوڑھے کو یاد کرتے ہوئے جھوٹے آنسو بہانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

باورچی خانے کے دروازے کو کھٹکھٹانے کی آواز سے وہ ہڑبڑا گئے۔ دو وردی پوش پولیس افسر وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہرشل نے دروازہ کھول کر انھیں اندر آنے کی دعوت دی۔ ریفریجریٹر کے پاس کھڑے ہرشل اور دوسروں نے اپنا اپنا تعارف کروایا۔ پولیس افسروں نے اپنے ہیٹ اتارے اور سب سے ہاتھ ملایا۔ مارشل پریتھر نے کہا "ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی گفتگو میں مخل ہوئے لیکن مجھے اور مسٹر پارل کو شیرف والز نے یہاں بھیجا ہے۔ انھوں نے آپ کے لیے تعزیت کے

جذبات تجھتے ہیں۔ ہم مسٹر ہیورڈ کی کار واپس لائے ہیں۔" اس نے چابیاں ہرشل کے ہاتھ میں دے دیں جس پر اس نے شکریہ ادا کیا۔

پولیس افسر پرکل نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور کہا "یہ وہ تحریر ہے جو مسٹر ہیورڈ نے باورچی خانے کی میز پر چھوڑی۔ ہمیں کل مسٹر ہیورڈ کو تلاش کرنے کے بعد یہ تحریر ملی۔ شیرف والز نے اس کی نقول بنا لی ہیں لیکن اس کے خیال میں اصل تحریر کو خاندان کے پاس رہنا چاہیے۔ اس نے لفافہ رہمونا کو پکڑا دیا جو دوبارہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہر ایک نے شکریے کے الفاظ کہے اور سب کے ساتھ ہاتھ ملانے کے بعد پولیس والے چلے گئے۔ رہمونا نے لفافہ کھولا اور وہ ورق باہر نکالے۔ پہلا ورق بیان کے لیے تھا جس میں سیتھ نے باقاعدہ طور پر اپنی موت کی تصدیق کی تھی۔

تجہیز و تکفین کی ہدایات

میں چاہتا ہوں کہ منگل 14 اکتوبر کو 4 بجے سہ پہر محترم پادری ڈان میک ایلوین کی راہنمائی میں آئرش روڈ کرسچین چرچ میں ایک سادہ دعائیہ تقریب منعقد کی جائے۔ میں پسند کروں گا کہ مسز نورا تھیر یہ حمد پڑھے The Old Rugged Cross۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے لیے توصیفی کلمات کہے جائیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی چاہے گا بھی۔ سوائے اس کے کہ محترم پادری میک ایلوین جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ تقریب زیادہ سے زیادہ تیس منٹ کی ہو۔

اگر کوئی سیاہ فام افراد میری تجہیز و تکفین میں شرکت کرنا چاہیں تو ان کو شامل کیا جائے۔ اگر ان کو شامل نہیں کیا جاتا تو پھر تقریب ہرگز منعقد نہ کی جائے اور مجھے بس دفن کر دیا جائے۔

میرے تابوت کو اٹھانے والے افراد کے نام ہیں: بارووی ماس، ڈوواین تھامس، سیٹو بالینڈ، ملی بولز، مائیک مونرو اور والز رالنسن۔

ہدایات برائے تدفین:

میں نے آئرش روڈ قبرستان میں چرچ کے عقب میں ایک پلاٹ خریدا ہے۔ میں نے میت خانے کے منتظم مسٹر میگارگل سے طے کر لیا ہے اور ان کو تابوت کی قیمت بھی ادا کر دی گئی ہے۔ قبر کے اوپر چھت کی ضرورت نہیں۔ چرچ میں دعائیہ تقریب کے بعد مجھے پانچ منٹ کے اندر دفن کر دیا جائے۔

خدا حافظ۔ آپ سے دوسری دنیا میں ملاقات ہوگی۔

سیتھ ہیورڈ

باورچی خانے کی میز کے گرد بیٹھے سب نے باری باری اسے پڑھا اور ایک لمحے کے لیے خاموشی اختیار کی۔ پھر انھوں نے مزید کافی اپنے کپوں میں انڈیلی۔ ہرشل نے فریج سے کیک کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا اور اعلان کیا کہ یہ لذیذ ہے۔ البتہ ان سب نے ایک لینے سے انکار کر دیا۔

"لگتا ہے تمھارے والد نے بہت اچھی منصوبہ بندی کی۔" آیان نے تبصرہ کیا جب اس نے ہدایات کو دوبارہ پڑھا۔ "سادہ اور تیز رفتار۔"

رہمونا نے جلدی سے کہا "ہمیں مجرمانہ کارروائی کے بارے میں بات کرنا چاہیے، ہے نا؟ ابھی تک کسی نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ کیا ہم اس پر بحث کر سکتے ہیں؟ اگر یہ خودکشی نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے کسی اور نے یہ کام کیا ہو اور اسے خودکشی کا رنگ

دینے کی کوشش کی ہو۔ کیا آپ کو واقعی یقین ہے کہ
ڈیڈی اپنے آپ کو ختم کر سکتے ہیں؟"

ہرشل اور آیان نے اس کو گھور کر دیکھا جیسے اس
کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ وہ دونوں اس کی
حماقت پر اس کو طنز یا لعنت ملامت کرنا چاہتے تھے لیکن
ایک طویل وقفے میں کسی نے کچھ نہ کہا۔ ہرشل نے
آہستگی سے کیک کا ایک اور ٹکڑا کھایا۔ آیان نے آرام
سے دونوں کاغذ اٹھائے اور کہا "ڈیئر! اس کو کوئی جعلی
کیسے قرار دے سکتا ہے۔ آپ سیتھ کی لکھائی کو دور
دور سے پہچان سکتے ہیں۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے رو رہی تھی۔ ہرشل نے کہا
"رونا! میں نے شیرف سے اس بارے میں پوچھا تھا
اور اس کو یقین تھا کہ یہ خودکشی تھی۔"

"میں جانتی ہوں، جانتی ہوں" اس نے سسکیاں
لیتے ہوئے بمشکل کہا۔

آیان نے کہا "تمھارے والد کینسر کے مریض
تھے اور بہت زیادہ درد اور تکلیف میں تھے اور انھوں
نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لگتا ہے وہ سب
کچھ اچھی طرح جانتے تھے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا" اس نے کہا "انھوں نے
ہمارے ساتھ بات کیوں نہ کی؟"

کیونکہ تم لوگوں نے ایک دوسرے سے کبھی بات
کی ہی نہیں، لیلی نے اپنے آپ سے کہا۔

ایسے معاملات کے ماہر آیان نے کہا "خودکشی میں
یہ بات خلاف معمول نہیں۔ لوگ کبھی کسی سے بات نہیں
کرتے اور منصوبہ بندی کرتے ہوئے کسی بھی انتہا تک
جاسکتے ہیں۔ میرے انکل نے دو سال پہلے اپنے آپ کو
گولی مار کر ختم کر لیا اور۔۔۔"

"تمھارے انکل شرابی تھے" رونا نے آنکھیں
خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ تھے اور جس وقت انھوں نے اپنے آپ
کو گولی ماری وہ نشے میں دھت تھے لیکن پھر بھی انھوں
نے اس کی اچھی طرح منصوبہ بندی کی۔"

"آؤ، ہم کوئی اور بات کریں" ہرشل نے کہا۔
"نہیں رونا! کوئی مجرمانہ کارروائی نہیں ہوئی۔ سیتھ نے
یہ کام خود کیا اور اپنی تحریریں پیچھے چھوڑیں۔ میں کہتا
ہوں کہ ہم گھر میں ایسے کاغذات، بینک اسٹیٹمنٹ اور
وصیت کو تلاش کریں جن کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔
ہم خاندان کے افراد ہیں اور اب ہم وارث ہیں۔ اس
لیے اب اس میں کوئی غلط بات نہیں۔ ٹھیک ہے نا۔"

آیان اور رونا نے اثبات میں سر ہلایا۔

لیلی حقیقت میں مسکرا رہی تھی۔ مسٹر سیتھ نے اپنے
تمام کاغذات دفتر لے جا کر ایک الماری میں مقفل کر
دیے تھے۔ گزشتہ ماہ کے دوران اس نے اپنی میز اور
درازوں کو بالکل خالی کر دیا اور اس نے کہا تھا "لیلی،
اگر مجھے کچھ ہوا تو میرے تمام اہم کاغذات میرے دفتر
میں اچھی طرح مقفل پڑے ہیں۔ میرے بچوں کے
بجائے وکلا ان کو دیکھیں گے۔"

اس نے یہ بھی کہا تھا "اور میں تمھارے لیے بھی
کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

☆...☆

سوموار کی دوپہر تک فورڈ کاؤنٹی کی بار ایسوسی
ایشن میں خودکشی کی خبر گونج رہی تھی جس میں یہ تجسس
بھی شامل تھا کہ وصیت کو قانونی ثابت کرنے کا کام کس
فرم کو ملے گا۔ اکثر اموات ایک جیسا مدوجزر پیدا کرتی
ہیں جیسے کہ مہلک کار حادثے۔ تاہم باغ میں کیے جانے

والے قتل ان سے مختلف نتائج کا سبب بنتے ہیں۔ بیشتر قاتل کمتر طبقات سے تعلق رکھتے ہیں اور مقتول فیس ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

جیک ایش سٹریٹ کے پار عدالت خانے میں کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ لیتا تھا۔ دستاویزوں کا ریکارڈ دوسری منزل پر ایک طویل کشادہ کمرے میں تھا جہاں دو سو سال پرانے ریکارڈ والی ضخیم کتابیں ترتیب سے شیلفوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ سال میں ایک مرتبہ دوسرے وکلا کی طرح جیک کو گھنٹا بھر کے لیے کاغذی ریکارڈ میں گم ہونا پڑتا تھا۔ کمرا وکلا سے بھرا ہوا تھا۔ جو کتابوں کو آگے پیچھے گھسیٹ رہے تھے اور کاغذات پر جھکے ہوئے [illegible] تھے۔ جیک نے دستاویزوں کی [illegible] گزشتہ بیس سال میں کسی بیوپاری نے [illegible] یا سرمایہ منتقل نہیں کیا تھا۔ وہ بالائی کورٹ [illegible] دفتر گیا تاکہ طلاقوں کی پرانی فائلوں پر نظر ڈال سکے لیکن وہاں بہت سے وکلا گھوم رہے تھے۔ وہ کسی اور ذریعے کی تلاش میں عدالت خانے سے نکل آیا۔

یہ کوئی حیران کن بات نہ تھی کہ سینٹ ہیوبرز کمیونٹی میں وکلا سے نفرت کرتا تھا۔ اکثر مقدمہ باز، طلاق کے ہا کوئی اور جنھوں نے وکیل ہیری رکس وغیرہ کے ساتھ معاملہ کیا، ان کی باقی ماندہ زندگی برباد ہو گئی اور وہ قانون کے پیشے کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگے۔ نتیجتاً خودکشی کرنے والوں میں سے بیشتر یہاں سے نہیں تھا۔

ہیری رکس موکل کا روپیہ، زمین اور خون تک نچوڑ لیتا تھا۔ وہ طلاق کے مقدمات کا ماہر تھا اور جتنا کوئی مقدمہ پیچیدہ ہوتا اس کے لیے بہتر ہوتا تھا۔ وہ بدنام اسکینڈلز، گھٹیا بازاری لڑائیوں، دست بدست لڑائیوں، خفیہ فون سننے اور ڈبوں کی گاڑی میں حیران کن تصاویر جیسی چیزوں سے لطف اٹھاتا تھا۔ اس کے مقدمات خندقوں میں جم کر لڑی جانے والی جنگوں کی طرح ہوتے تھے۔ اس کے نان نفقے کے مدائی لفظے نئے ریکارڈ بن جاتے تھے۔ وہ کمزور طرف طاقتوں کو بھی کھینچ کر دو سالہ موت کی اذیت میں تبدیل کر دیتا تھا۔ اگر اس کے تیار کردہ ہتھکنڈے ناکام ہو جاتے تو وہ کوئی نیا ایجاد کر لیتا تھا۔ طلاق کے مقدمات میں اجارہ داری کی وجہ سے وہ عدالتی کلرکوں کو بھی دھمکی لگا دیتا تھا۔ نوجوان وکلا اس سے دور بھاگتے تھے۔ پرانے وکلا اس کے ہاتھوں پہلے ہی زخم خوردہ تھے اور مناسب فاصلے پر رہتے تھے۔ اس کے دوست بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔

وکلا میں ہیری صرف جیک پر اعتماد کرتا تھا اور یہ اعتماد باہمی تھا۔ ہیلی کے مقدمے کے دوران جب جیک نیند اور غذا کی کمی کا شکار تھا، گولیوں اور موت کی دھمکیوں سے بچنے کی جدوجہد میں مصروف تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقدمہ ہار رہا ہے تو ہیری رکس خاموشی سے اس کے دفتر میں داخل ہوا تھا [illegible] رہتے ہوئے کسی فیس کے بغیر گھنٹوں مقدمے پر صرف کیے۔ اس نے جیک کو مفت تحقیقی مشورے دیے اور اس کی [illegible] رکھا۔

ہمیشہ کی طرح، سوموار کے دن ہیری رکس اپنی میز پر بیٹھا ایک برگر سے نبرد آزما تھا۔ طلاق کے وکلا کے لیے سوموار کا دن مشکل ترین ہوتا ہے کیونکہ اس دن اختتام ہفتہ پر ٹوٹنے والی شادیوں کے متحارب فریقین قانونی کارروائیوں کا آغاز کرتے ہیں۔ جیک پچھلے دروازے سے عمارت میں داخل ہوا اور تیز طرار سیکرٹریوں اور تمباکو نوشی کے دھوئیں سے بھری ہوئی انتظار گاہ سے بچتے ہوئے ہیری رکس کے دفتر کے

کمرے تک پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ کوئی آواز نہ پا کر اس نے دروازے کو دھکا دے کر کھول دیا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" ہیری رکس نوالہ چباتے ہوئے غرایا۔ اس کے سامنے برگر اور آلو کے چپس کا ڈھیر پڑا تھا اور وہ انھیں بیئر کی بوتل کے ساتھ حلق سے نیچے اتار رہا تھا۔

"سہ پہر کا سلام، ہیری رکس۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمھارے لنچ میں مخل ہوا۔" اس نے اپنے ہاتھ سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا "نہیں کوئی بات نہیں۔ کوئی نئی خبر؟"

"تم پہلے ہی شراب نوشی کر رہے ہو؟" جیک نے بڑی سی آرام کرسی میں دھنستے ہوئے کہا۔

"اگر تمھارے پاس میرے جتنی دولت ہو تو تم ناشتے ہی پر پینا شروع کر دو گے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم نے ناشتے پر بھی پی۔"

"سوموار کو بھی نہیں۔ مس کارلا کیسی ہیں؟"

"اچھی ہے۔ شکریہ اور مس کیسی ہیں کیا نام ہے ان کا؟"

"جینی، تیز چھری، جینی اٹلین والز، اور وہ نہ صرف میرے ساتھ زندگی گزار رہی ہے بلکہ اس سے لطف اٹھا رہی ہے۔ اور اپنی خوش قسمتی پر شکر گزار ہے۔ آخر کار مجھے وہ عورت مل گئی جو مجھے سمجھتی ہے۔" اس نے سرخ چپس کا ایک بڑا تنکا منہ میں ڈالا۔

"مبارک ہو! میں اس سے کب مل سکتا ہوں؟"

"ہماری شادی کو دو سال ہو چکے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میں پانچ سال انتظار کو ترجیح دیتا ہوں۔ جلدی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان عورتوں کی کشش اور دلکشی بہت مختصر ہوتی ہے۔"

"تم یہاں میری بے عزتی کرنے آئے ہو؟"

"بے شک نہیں۔" اور جیک دیانتداری سے بات کر رہا تھا۔ ہیری رکس کے ساتھ توہین آمیز جملوں کا تبادلہ احمقوں کا کام تھا۔ اس کا وزن تین سو پچاس پاؤنڈ سے زائد تھا اور وہ قصبے میں اونٹ کی طرح جھومتا پھرتا تھا لیکن اس کی زبان حیرت انگیز طور پر تیز اور معاندانہ تھی۔

جیک نے کہا "مجھے سیتھ ہوبرڈ کے بارے میں بتاؤ۔"

ہیری رکس نے قہقہہ لگایا "یہ واقعہ اس سے بڑے احمق کے ساتھ پیش نہیں آ سکتا تھا تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"اوزی نے کہا کہ تم نے اس کی ایک طلاق کا مقدمہ لڑا تھا۔"

"میں نے لڑا تھا۔ اس کی دوسری بیوی کا شاید دس سال پہلے۔ تقریباً وہ وقت تھا جب تم یہاں آئے تھے۔ میں نو وارد تھے اور اپنے آپ کو وکیل کہنا شروع کیا تھا۔ تمھارا اس کے ساتھ کیا تعلق؟"

اس نے اپنی جان لینے سے پہلے مجھے ایک خط لکھا اور ایک دو صفحے کی وصیت بھی لکھی۔ دونوں چیزیں آج صبح ڈاک میں آئیں۔

ہیری رکس نے بیئر کا ایک گھونٹ لیا، اپنی آنکھیں سکیڑیں اور اس کے بارے میں سوچا "کیا تم کبھی اس سے ملے تھے؟"

"کبھی نہیں۔"

"خوش قسمت ہو۔ تم کسی چیز سے محروم نہیں رہے۔"

"میرے موکل کے بارے میں ایسی باتیں مت

کرے۔"

"وصیت کیا کہتی ہے؟"

"تمھیں نہیں بتا سکتا اور میں تدفین سے پہلے وصیت عدالت میں پیش نہیں کر سکتا۔"

"ساری جائداد کس کو ملے گی؟"

"نہیں بتا سکتا۔ میں تمھیں بدھ کے دن بتاؤں گا۔"

"خودکشی سے ایک دن پہلے دستخط کی ہاتھ سے لکھی وصیت مجھے تو پانچ سالہ مقدمے کا نسخہ معلوم ہوتی ہے۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے۔"

"یہ تمھیں کچھ عرصے کے لیے مصروف رکھے گی۔"

"مجھے کام کی ضرورت ہے۔ بوڑھے کے پاس کتنی دولت ہے؟"

ہیری ریکس نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں جانتا۔" اس نے کہا۔ پھر اس نے برگر کا ایک لقمہ لیا۔ جیک کے دوستوں اور واقف کاروں کی اکثریت کھانا کھاتے ہوئے بات کرنے سے احتراز کرتی تھی لیکن اس قسم کے معاشرتی آداب نے ہیری ریکس کی گفتار و رفتار کو سست نہیں کیا تھا۔ "جہاں تک مجھے یاد ہے اور یہ دس سال پہلے کی بات ہے وہ جیکسن روڈ پر ایک گھر اور اس کے اردگرد چند ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ اس کا سب سے بڑا سرمایہ ایک آرا مل اور پالمیرا کے قریب ہائی وے 42 پر لکڑیوں کا ایک گودام تھا۔ میری موکلہ اس کی دوسری بیوی سائبل ہوا کرتی تھی اور میرا خیال ہے کہ یہ اس کی دوسری یا تیسری شادی تھی۔"

دس سال بعد اور بے شمار مقدمات نمٹانے کے بعد ہیری ریکس اب بھی لوگوں کو اپنی یادداشت سے حیران کر دیتا تھا۔ تفصیلات جتنی مزیدار ہوتی تھیں اتنا ہی وہ ان کو زیادہ دیر تک یاد رکھتا تھا۔

اس نے جلدی سے بیئر کا بڑا سا گھونٹ لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ ایک خوش شکل اور بہت ذہین عورت تھی۔ وہ لکڑی کے گودام میں کام کرتی تھی اور اس کا کاروبار چلاتی تھی۔ یہ کاروبار کافی منافع بخش تھا جب سیتھ نے اس میں توسیع کا فیصلہ کیا۔ وہ الاباما میں ایک لکڑی کا گودام خریدنا چاہتا تھا اور اس نے اپنا وقت وہاں صرف کرنا شروع کر دیا۔ پتا چلا کہ وہاں استقبالیہ دفتر میں ایک سیکرٹری تھی جو اس کی توجہ کا مرکز تھی۔ پھر دھماکا ہو گیا۔ سیتھ قابلِ اعتراض حالت میں پکڑا گیا اور سائبل نے اس کو مزا چکھانے کے لیے مجھے اپنا وکیل مقرر کر لیا۔ مزا میں نے اس کو دلوائی۔ میں نے عدالت کو قائل کر لیا کہ وہ آرا مل اور گودام کی فروخت کا حکم جاری کرے۔ اس کی فروخت سے دو لاکھ ڈالر حاصل ہوئے جو سب کے سب میری موکلہ کو ملے۔ [illegible] کے بعد ان کی ایک کئی منزلہ رہائشی عمارت بچ گئی۔ وہ بھی سائبل کو مل گئی۔ یہ مختصر کہانی ہے لیکن اس کی فائل ایک فٹ موٹی ہے۔ اگر تم چاہو تو فائل دیکھ سکتے ہو۔"

"ہو سکتا ہے میں بعد میں دیکھوں۔ کیا آپ کو اس کے موجودہ بینک بیلنس کا کوئی اندازہ ہے؟"

"نہیں! میرا اس کے ساتھ رابطہ ختم ہو گیا۔ طلاق کے بعد اس نے خاموشی اور پسماندگی اختیار کر لی۔ آخری مرتبہ میری سائبل سے بات ہوئی تو اس کے بقول وہ ایک اور نسبتاً جوان شوہر کے ساتھ ساحل پر موج مستی کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ افواہیں ہیں کہ سیتھ نے دوبارہ لکڑی کا کاروبار شروع کر دیا ہے

لیکن اسے اس بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔" اس نے برگر کا لقمہ بمشکل نگلا اور بیئر کی مدد سے حلق سے نیچے اتار لیا۔ اس نے کسی ہچکچاہٹ یا ندامت کے بغیر زور سے ڈکار لی اور بات جاری رکھی "تم نے اس کے بچوں سے بات کی؟"

"ابھی نہیں۔ تم انھیں جانتے ہو؟"

"ایک وقت میں ان کو جانتا تھا۔ وہ تمھاری زندگی کو دلچسپ بنا دیں گے۔ مرشل واقعی بدھو ہے۔ اس کی بہن کیا نام ہے اس کا....؟"

"ریکونا یو برڈ لیفو۔"

"وہی ہے۔ وہ مرشل سے چند سال چھوٹی ہے اور نارتھ جیکسن میں رہتی ہے۔ دونوں میں سے کسی کے بھی سیتھ کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں تھے۔ مجھے ہمیشہ یہ تاثر ملا کہ وہ ایک اچھا باپ نہیں تھا۔ وہ اپنی دوسری والدہ سائل کو پسند کرتے تھے اور جب یہ واضح ہو گیا کہ سائل طلاق کا مقدمہ جیت جائے گی اور کافی روپیہ بھی حاصل کر لے گی تو وہ اس کے کیمپ میں شامل ہو گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ بوڑھے نے ان کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔"

جیک نے سر ہلایا لیکن کچھ نہ کہا۔

"پھر تو وہ خبطی ضرور مقدمہ بازی کریں گے۔ جیک ایک اچھا مقدمہ تمھارے ہاتھ لگنے والا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس مقدمے میں شامل ہو کر کچھ فیس حاصل نہیں کر سکتا۔"

"اگر تمھیں صرف معلوم ہوتا۔"

اس نے برگر کا آخری لقمہ لیا پھر آخری چپس منہ میں ٹھونسے۔ ہیری نے کاغذ، لفافہ، رومال، بیئر کی خالی بوتل سمیت میز کے نیچے کوڑے میں پھینک دیے۔ اس نے ایک دراز کھولا، ایک لمبا سیاہ سگار نکالا اور اسے سلگائے بغیر دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس نے سگار پینا ترک کر دیا تھا لیکن اب بھی روزانہ دس پی لیتا تھا۔ "میں نے سنا ہے اس نے پھانسی لے لی، کیا یہ سچ ہے؟"

"سچ ہے۔ اس نے بڑی اچھی منصوبہ بندی کی۔"

"کیا تم جانتے ہو اس نے کیوں پھانسی لی؟"

"تم نے افواہیں سنی ہیں۔ وہ کینسر سے مر رہا تھا۔ ہم بس اتنا ہی جانتے ہیں۔ طلاق میں اس کا وکیل کون تھا؟"

"اس نے سٹیلے وینڈ کو وکیل کیا تھا جو ایک غلطی تھی۔"

"وینڈ؟ وہ کب سے طلاق کے مقدمات لیتا ہے؟"

"اب بالکل نہیں۔" ہیری ریکس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اس نے دونوں دراز کھولا اور سنجیدہ ہو گیا۔ "دیکھو جیک، میں یہ بتانا پسند نہیں کرتا لیکن دس سال پہلے جو کچھ ہوا اس کی اس معاملے میں کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے سیتھ ہوبرڈ کا سارا روپیہ لے لیا۔ اس کا کافی حصہ اپنے لیے رکھا اور باقی اپنی موکلہ کو دے دیا۔ جو ہوا سے دل بس اتنا ہی۔ اگر تم بعد میں میرے ساتھ وہاں شراب پینا چاہو گے تو ٹھیک ہے لیکن ابھی اس وقت میں بالکل فارغ ہو چکا ہوں۔"

ہیری ریکس کے ساتھ بعد میں شراب پینے کا مطلب تھا شام نو بجے کے بعد۔ "یقیناً مل بیٹھیں گے۔" جیک نے کہا جب وہ فائلیں پھلانگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

"جیک، بتاؤ یہ فرض کرنے میں کوئی حرج تو نہیں کہ سیتھ نے اپنی گزشتہ وصیت کو منسوخ کر دیا تھا؟"

"ہاں!"

"اور کیا وہ وصیت تمھاری فرم سے کسی بڑی فرم

نے تیار کی تھی؟"

"ہاں!"

"پھر اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو عدالت کی طرف دوڑ لگا دیتا اور وصیت کو قانونی حیثیت دینے کے لیے پہلی درخواست دے دیتا۔"

"میرا سوکل چاہتا ہے کہ میں اس کی تدفین تک انتظار کروں۔"

"وہ کب ہے؟"

"کل چار بجے۔"

"عدالت پانچ بجے بند ہوتی ہے۔ میں وہاں موجود ہوں گا۔ پہلے کارروائی کرنا ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔"

"شکریہ، میری رکس۔"

"شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے دوبارہ ڈکاری اور ایک فائل اٹھا لی۔

سہ پہر کے دوران ہمسائے، چرچ کے ساتھی اور دوسرے دوست بڑی سنجیدگی سے خاندان کی تالیف قلب کے لیے سامان خورونوش کے ساتھ متواتر سیتھ کے گھر جاتے رہے۔ لیکن ان کا بڑا مقصد فورڈ کا وَنٹی میں گرما گرم موضوع پر گپ شپ کرنا بھی تھا۔ صدر دروازے پر موجود لیٹی ان افراد سے اشیائے خورونوش اور تعزیت قبول کر رہی تھی اور بڑی شائستگی سے یہ کہہ کر انھیں واپس کر دیتی کہ "خاندان کے افراد ان کے شکرگزار ہیں لیکن ملاقات کرنے کے لیے تیار نہیں۔" تاہم ان میں سے کچھ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے جہاں وہ مرحوم کی زندگی کے آخری حصے پر گفتگو کرتے۔ وہ پہلے کبھی وہاں نہیں آئے تھے اور لیٹی نے ان کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا۔ پھر بھی وہ غم کا اظہار کرتے تھے۔ دنیا سے جانے کا نہایت المناک طریقہ۔ کیا اس نے واقعی خود پھانسی لی؟

افراد کنبہ گھر کے عقبی حصے میں چھپے ہوئے تھے جہاں وہ تعزیت کے لیے آنے والوں سے دور ایک میز پر بیٹھے تھے۔ ان کو سیتھ کی میز اور درازوں کی تلاشی سے کوئی مفید چیز حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جب لیٹی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ انھیں اس بات پر شک تھا۔ اس نے ان کے سوالات کے جوابات سوچ سمجھ کر نرمی اور آہستگی سے دیے جس سے ان کے شک میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے دوپہر ان کو لنچ پیش کیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میز پوش، رومال اور کٹلری بھی مہیا کی جائے اگرچہ سیتھ کے گھر میں سالوں سے ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ جذبات کا اظہار کیے بغیر وہ چاہتے تھے کہ بارنج ڈالر فی گھنٹا کے حساب سے معاوضہ لینے والی لیٹی ایک حقیقی خادمہ بن کر کام کرے۔

جب وہ ادھر ادھر گھوم رہی تھی، تو اس نے ان کو بحث کرتے ہوئے سنا کہ کون تجہیز و تکفین میں شامل ہو گا اور کون نہیں۔ مثال کے طور پر آیان ایک بہت بڑا سودا طے کرنے کے درمیان تھا جو ممکن طور پر پوری ریاست کے مالی مستقبل پر اثرانداز ہو سکتا تھا۔ کل کچھ اہم ملاقاتیں ایجنڈے پر تھیں اور ان میں شرکت نہ کرنے سے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

ہرشل اور ریمونا نے بادل نخواستہ اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ وہ تجہیز و تکفین کی رسوم کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اگرچہ بعض اوقات لیٹی سوچتی کہ وہ بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ریمونا کی طبیعت ہر لمحے خراب ہوتی جا رہی تھی اور اسے یقین نہیں تھا کہ وہ مزید دباؤ برداشت کر پائے

گی۔ ہرشل کی دو بیٹیاں تھیں ایک ٹیکساس کالج میں اور دوسری میکسکس کے ہائی اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ اپنی کلاسیں نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ ہرشل کو اعتراف تھا کہ وہ واقعی اپنے دادا کے اتنی قریب نہ تھیں۔

سیتھ کا ایک بھائی تھا، ان کا انکل اینسل جس سے وہ کبھی ملے تھے نہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ ایک خاندانی کہانی کے مطابق اینسل نے اپنی عمر کے بارے میں جھوٹ بولا اور سولہ یا سترہ سال کی عمر میں بحری فوج میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ بحرالکاہل میں زخمی ہوا لیکن زندہ بچ گیا۔ پھر جہازرانی کے کاروبار میں اس نے دنیا گھوم پھر کر دیکھی۔ سیتھ کا اپنے بھائی کے ساتھ کئی عشرے قبل رابطہ ختم ہو گیا تھا اور اس نے کبھی اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ اینسل سے رابطہ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا اور ایسا کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ غالباً وہ بھی سیتھ کی طرح مر چکا تھا۔

انھوں نے اپنے کچھ پرانے رشتہ داروں کے بارے میں بات کی۔ ان میں سے کسی کو انھوں نے سالوں سے نہیں دیکھا تھا نہ ہی وہ ان میں سے کسی کو بھی دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ کتنا افسردہ، عجیب خاندان ہے! لیتھی نے سوچا جب اس نے ان کے سامنے منتخب کیک پیش کیے۔ وہ ایک مختصر، جلدی تدفین کی تیاری کر رہے تھے۔

"آئیے اس کو یہاں سے نکال باہر کریں۔" ہرشل نے کہا جب لیتھی باورچی خانے میں واپس گئی۔ "پانچ ڈالر گھنٹا کے حساب سے ہم لوٹے جا رہے ہیں۔"

"ہم؟ ہم اس کو کب سے تنخواہ دے رہے ہیں؟" ریمونا نے پوچھا۔

"وہ اب تو اس کی تنخواہ ہمارے ذمے ہے، کسی نہ کسی طرح۔ ہر چیز جائداد سے نکل رہی ہے۔"

"میں گھر کی صفائی نہیں کر رہی ہرشل۔ تم کرو گے؟"

"بے شک نہیں۔"

آیان بولا "آرام سے معاملے کو طے کریں۔ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو جائیں تو اس کو گھر کی صفائی کرنے کے لیے کہیں۔ پھر بدھ کو جب ہم یہاں سے جائیں گے تو گھر مقفل کر دیں گے۔"

"اسے کون بتائے گا کہ وہ ملازمت سے فارغ ہے؟" ریمونا نے پوچھا۔

"میں بتاؤں گا۔" ہرشل نے کہا۔

"یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ صرف ایک ملازمہ ہے۔"

"اس میں ایک طرح کی پراسراریت پائی جاتی ہے۔" آیان نے کہا۔ "کسی چیز کی نشاندہی نہیں کر سکتا لیکن اس کا رویہ ایسا ہے کہ جیسے وہ کچھ جانتی ہے جو ہم نہیں جانتے۔ کوئی اہم بات۔ تم بھی اس کو محسوس کرو گے۔"

"یقیناً کچھ نہ کچھ ظاہر ہونے والا ہے۔" ہرشل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا اپنے برادر نسبتی کے ساتھ کسی بات پر تو اتفاق ہوا۔

لیکن ریمونا نے اختلاف رائے کیا "نہیں، یہ صرف صدمہ اور افسردگی ہے۔ وہ ان بہت ہی کم لوگوں میں سے ہے جن کو سیتھ برداشت کر سکتا تھا یا جو سیتھ کو برداشت کر سکتے تھے۔ اسے غم ہے کہ وہ دنیا سے جا چکا ہے اور یہ بھی کہ اب اس کی ملازمت ختم ہونے والی ہے۔"

"تمھارے خیال میں وہ جانتی ہے کہ وہ کام سے فارغ ہونے والی ہے؟" ہرشل نے پوچھا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ پریشان ہے۔"

"وہ صرف گھر کی دیکھ بھال کرنے والی ملازمہ ہے۔"

◆◆◆

مکڑی

قدرت کی اُعجوبہ تخلیق

دنیا میں پائی جانے والی مکڑیوں کی اقسام اور ان کے احوال کا دلچسپ ماجرا

غلام رسول

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ سے قبل تین دن غارِ حرا میں قیام فرمایا تھا۔ جب کفارِ مکہ آپ کو تلاش کرتے غار تک پہنچے تو اللہ کے حکم سے مکڑیاں اُس کے دہانے پر جالا تن چکی تھیں۔ کفارِ مکہ یہ سوچ کر چلے گئے کہ اس غار میں کون آیا ہو گا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے مکڑیوں کے ذریعے نبی کریمؐ کو دشمنوں سے محفوظ رکھا۔ اسی باعث مسلمان مکڑی کو مقدس کیڑا سمجھتے ہیں۔

☆☆

مکڑیوں کا ذکر آتے ہی کچھ لوگوں کے دلوں پر خوف اور ناپسندیدگی کے تاثرات چھا جاتے ہیں اور بعض تو اس قدر خوفزدہ ہوتے ہیں کہ وہ ایک خاص نام

کے ڈر "آرکنو فوبیا" (Arachnophobia) میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس ڈر میں مبتلا افراد کو مکڑیوں سے بے انتہا خوف محسوس ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تو مکڑی کے جالے یا مکڑی دیکھتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز اور جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔

محقق اس ڈر کی وجہ تلاش کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ صنفِ نازک (خواتین) میں اس کی شرح مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق 50 فیصد خواتین اور 10 فیصد مرد اس خوف میں مبتلا ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مکڑیوں کی زیادہ تر اقسام انسانوں کے لیے غیر مضر اور غیر زہریلی ہوتی ہیں بلکہ انسان کو مکڑیوں کی وجہ سے اکثر و بیشتر فائدہ ہی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی کثیر آبادی کا انحصار زرعی اجناس پر ہے۔ بہت سے کیڑے مکوڑے ان قیمتی فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر یہ نقصان حد سے بڑھ جائے تو ساری دنیا قحط سالی کا شکار ہو سکتی ہے۔ مگر فصلوں اور ان کے قرب و جوار میں پائی جانے والی انواع و اقسام کی مکڑیاں ان فصل دشمن اور انسان دشمن کیڑوں کو اپنی خوراک بناتی ہیں۔

سب سے بڑھ کر اہم بات یہ کہ مکڑیاں فصلوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں کیونکہ وہ پودوں کے پتے یا زرعی اجناس بالکل نہیں کھاتیں۔ مکڑی کی غذا میں صرف مختلف انواع کے کیڑے مکوڑے شامل ہیں۔ اس لحاظ سے مکڑی انسان کی دوست ہے۔

ویسے بھی کیڑے مار ادویہ کے استعمال کا رجحان اب پرانا ہو گیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں کیڑے مار ادویہ کا استعمال کم کرنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے۔ ان ادویہ کی جگہ دوسرے ماحول دوست طریقے استعمال کیے جا رہے ہیں جن میں سے "حیاتیاتی کنٹرول" (Biological Control) موثر اور ماحول دوست ذریعہ ہے۔ اس طریقہ کار میں ایسے جانداروں کو استعمال کیا جاتا ہے جو نقصان دہ کیڑے مکوڑوں کو ختم کر سکیں۔

چین میں کسان عرصہ دراز سے مکڑیوں کو "حیاتیاتی کنٹرول" کے موثر ہتھیار کی حیثیت سے استعمال کرتے آئے ہیں۔ مکڑیوں کی آبادی بڑھانے اور انھیں پناہ گاہ اور مسکن فراہم کرنے کے لیے کھیتوں کے کناروں پر گھاس پھوس کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگا دی جاتی ہیں۔ ان میں مکڑیاں افزائش پاتی ہیں۔ جب چاول کی فصل میں پانی زیادہ ہو تو ان پناہ گاہوں میں مکڑیاں آرام کرتی ہیں۔ اس طریقہ کار سے نہ صرف کیڑے مار ادویہ پر خرچ ہونے والا کثیر زرِمبادلہ بچتا ہے بلکہ ان کے مضر اثرات سے بھی محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اب یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ کیڑے مار ادویہ کے انسانی صحت، جنگلی حیات اور ماحول پر انتہائی تباہ کن اثرات پڑتے ہیں۔

ارضِ پاکستان کو جہاں اللہ تعالیٰ نے زرخیز کھیتوں اور زرعی اجناس سے مالا مال کیا ہے وہیں انواع و اقسام کی مکڑیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ انسان اور فصل دشمن کیڑوں کی آبادی قابو میں رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

گھروں میں پائی جانے والی مکڑیاں کھیتوں اور

مچھروں کو اپنا شکار بناتی ہیں۔ مکھی ایک ایسا جاندار ہے جس کے خلاف ساری کیڑے مار ادویہ تقریباً ناکام ہو چکی ہیں۔ یہ کیڑے بہت جلد ان ادویہ کے خلاف قوت مدافعت پیدا کر لیتے ہیں، سو وہ ان پر اثر نہیں کرتیں۔ مکڑی کے جالوں میں مچھر بھی پھنس جاتے ہیں۔ یوں مکھی اور مچھر جیسے موذی کیڑوں سے نجات دلا کر مکڑیاں انسانی آبادی کو بیماریوں سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

کچھ ممالک میں تو مکڑیاں باقاعدہ خوراک کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ تارنتولا (Tarantola) نامی مکڑی سائز میں ایک فٹ تک بڑی ہوتی ہے۔ اس کی کچھ اقسام ایک فٹ سے بھی بڑی ہو سکتی ہیں۔ یہ مکڑی لاطینی امریکا کے ممالک میں کھائی جاتی ہے۔

برازیل میں تلی ہوئی تارنتولا مکڑیاں تھال میں لیے فروخت کرنے والے عام گھومتے رہتے ہیں۔ انھیں وہاں کے لوگ مزے لے لے کر چٹ کر جاتے ہیں۔

مغرب اور ایشیا کے کچھ لوگوں کو تو مکڑیوں سے اس قدر پیار ہے کہ وہ انھیں پالتو جانوروں کی طرح پالتے ہیں۔ جاپان میں یہ شوق عام ہے۔ جاپانی چھوٹے چھوٹے اپارٹمنٹس میں رہتے ہیں جن میں کتے، بلی جیسے جانور پالنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے اکثر جاپانیوں نے تارنتولا مکڑیاں پال رکھی ہیں۔ ان مکڑیوں کی عمر 25 سال اور بعض کی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ اچھا پالتو جانور ثابت ہوتی ہیں۔

جاپان ہی میں دنیا کا سب سے بڑا مکڑیوں کا تہوار منایا جاتا ہے۔ ایک جاپانی قصبے میں جس کا نام ''کاجیکی'' ہے، ہر سال مکڑیوں کی لڑائی کرانے کا مقابلہ

شانِ قلندری

آسٹریلیا کے بلے باز وکٹر ٹرمپر کھیل میں منفرد تکنیک کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھے۔ ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے ''کرکٹ میں کوئی دوسرا وکٹر ٹرمپر پیدا نہیں ہو سکتا۔'' اس کرکٹر کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انھوں نے دنیا میں 38 سال فاقہ مستی میں گزارے۔ کرکٹ کی دنیا کا یہ کامیاب بلے باز ایک ناکام تاجر تھا۔ وکٹر سڈنی میں کھیلوں کا سامان بنانے والی کمپنی کے مالک تھے۔ لیکن وہ سامان کی فروخت سے زیادہ تحفے تحائف دینے میں دلچسپی رکھتے۔ اسی لیے دکان کم چلتی۔ ایک دن صبح وہ اپنی دکان میں کام کر رہے تھے۔ ٹیسٹ شروع ہونے میں کچھ وقت رہ گیا تھا۔ انھوں نے اپنا کوٹ سنبھالا۔ الماری سے نیا بلا نکالا اور ٹیکسی پکڑ فوراً سڈنی کرکٹ گراؤنڈ پہنچ گئے۔ اس دن انھوں نے نئے بلے سے آؤٹ ہوئے بغیر 185 رنز بنائے۔ ان کی یہ اننگز لازوال ہے۔ کھیل کے اختتام پر وہ دوبارہ اپنی دکان پر آ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کا ایک دلدادہ بھی دکان میں داخل ہوا اور ان سے پوچھا ''میں آپ کا وہ بلا خریدنا چاہتا ہوں جس سے آپ نے آج سنچری بنائی تھی۔''

وکٹر ٹرمپر نے نہایت دلچسپ جواب دیا ''جی ہاں وہ بلا موجود ہے۔ آج میرے استعمال کرنے سے پہلے اس کی قیمت 45 ڈالر تھی لیکن اب وہ پرانا ہو چکا۔ اس لیے وہ آپ کو صرف ایک ڈالر میں مل جائے گا۔''

منعقد ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں دیہات اور قصبوں میں مرغوں اور بٹیروں کی لڑائی کرائی جاتی ہے۔ لیکن جاپان کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہاں لڑنے والی مکڑیوں کا سائز بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ مقابلے صدیوں پرانے ہیں اور تقریباً چھے صدیوں سے ہر سال جاپان کے اس قصبے میں ہو رہے ہیں۔ ان مکڑیوں کو "سامورائی" کہا جاتا ہے۔

جاپانی سارا سال ان سامورائی مکڑیوں کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں تاکہ وہ مقابلے کے لیے تیار ہو سکیں۔ یہ مقابلہ بہت دلچسپ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ مقابلے میں باقاعدہ ایک ریفری ہوتا ہے جو مکڑیوں کی لڑائی کا معائنہ کرتا اور انھیں نمبر دیتا ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی مکڑی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اگر کوئی مکڑی اپنے مخالف کی جان کے درپے ہو جائے تو مقابلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔

مقابلے کے لیے بہترین سائز کی مکڑیوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ان کی اگلی ٹانگوں کی لمبائی کو خاص دھیان میں رکھا جاتا ہے۔ جس مکڑی کا سائز بڑا ہو اور اگلی ٹانگیں بڑی ہوں اس کی جیت کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ مقابلے کے بعد جیتنے والی مکڑی کے تربیت کار کو انعام ملتا ہے۔ جاپانی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ مقابلے کے دوران کسی مکڑی کو تکلیف نہ پہنچے۔ مقابلے کے بعد وہ مکڑی کو آزاد کر دیتے ہیں۔ عموماً یہ جگہ چاولوں کے کھیت ہوتے ہیں۔

جاپان میں لوگ مکڑیوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ آپ کو ہر جگہ مکڑیوں کو چاہنے والے مل جائیں گے۔

"پیٹریا واٹا" کی مثال ہی لے لیجیے۔ پیٹریا واٹا ٹوکیو میں ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں پچاس مکڑیوں اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔

پاکستان میں بھی یہ خاص قسم کی مکڑیاں جنھیں جاپانی "سامورائی سپائڈر" کہتے ہیں پائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں بھی مکڑیوں کو پسند کرنے والوں کی کمی نہیں۔ یہاں یونیورسٹیوں میں مکڑیوں پر تدریس و تحقیق جاری ہے۔

اب کچھ بات زہریلی مکڑیوں کی ہو جائے۔ "سڈنی' آسٹریلیا کی فنل ویب مکڑی" (Sydney funnel web spider) کا شمار زہریلی ترین مکڑیوں میں ہوتا ہے۔ اگر اس کے ڈسے کا علاج نہ کیا جائے تو پندرہ منٹ میں انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

برازیل کی "آوارہ گرد مکڑی" (Wandering spider) بھی زہریلے پن میں کسی سے کم نہیں۔ اسے وانڈرنگ سپائیڈر اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ جالا نہیں بنتی اور ایک سے دوسری جگہ گھومتی رہتی ہے۔ 2010ء میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں اس مکڑی کو دنیا کی سب سے زہریلی مکڑی قرار دیا گیا۔

"سیاہ بیوہ" (Black widow) بھی قدرے زہریلی مکڑی ہے۔ یہ اپنے ہی نر (خاوند) کو کھا جاتی ہے۔ اسی لیے اس مکڑی کو بیوہ (widow) کہا جاتا ہے۔

ویسے تو مکڑیاں صرف کیڑے مکوڑے کھاتی ہیں۔ لیکن بڑے سائز کی مکڑیاں نہ صرف چوہے اور سانپ تک کھاتی بلکہ موقع ملنے پر پرندوں تک کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔

پاکستانی قارئین کے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ خوفناک مکڑیاں کم ہی پاکستان میں پائی جاتی ہیں۔ ٹارنٹولا اور سڈنی فنل ویب پاکستان میں نہیں پائی

جاتیں۔ جہاں تک سیاہ بیوہ کی بات ہے، کچھ ماہرین حشرات نے اس مکڑی کی پاکستان میں موجودگی کا امکان ظاہر کیا ہے۔ لیکن حکومت پاکستان کو ان مکڑیوں کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پاکستانی مکڑیوں کی کثیر تعداد انسان اور فصل دوست ہے۔ یہ موذی کیڑے کھا کر ہمیں بیماریوں سے محفوظ اور ہماری قیمتی فصلوں کو تباہی سے بچاتی ہیں۔ مکڑیاں ایک ایسا انوکھا جاندار ہیں جو قدرت نے خداداد حسین تحفہ ہیں۔ انھیں اللہ نے انسان کی مدد اور آزمائش کے لیے تخلیق کیا۔

کچھ مکڑیاں تو اتنی رنگین اور خوبصورت ہوتی ہیں کہ پتھر سے پتھر دل انسان بھی ان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسی ہی ایک مکڑی "مور مکڑی" (Peacock Spider) ہے۔ اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ جیسے مور اپنے پنکھ پھیلا کر دلفریب اور حسین رنگ بکھیرتا ہے ایسے ہی یہ مکڑی اپنی پیٹھ کے ایک خاص حصے کو پھیلا کر مور کی طرح اپنے حسین اور تیکھے رنگ پھیلا دیتی ہے۔ اس مکڑی کا ناچ بھی دیکھنے والا ہوتا ہے۔

مکڑی کو اللہ تعالیٰ نے ایک حیرت انگیز خوبی سے نوازا ہے۔ وہ ہے اس کی ریشم (Silk) پیدا کرنے کی صلاحیت۔ مکڑی کی ریشم مختلف اقسام کی ہوتی ہے۔ "کیلا مکڑی" (Banana spider) کی ریشم تو اس قدر مضبوط ہے کہ سٹیل کی مضبوطی اس کے مقابلے میں کم بھی جاتی ہے۔ اسی خاصیت کی بنیاد پر سائنسدان اس بات پر تحقیق کر رہے ہیں کہ مکڑی کے ریشم سے انسانی بلٹ پروف لباس تیار کیا جائے۔ یہ ریشم اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ گولی کو بھی روک سکتا ہے۔ اگر اسے مصنوعی طریقے سے تیار کر کے حفاظتی لباس بنا لیا جائے تو پولیس کو دہشت گرد مجرموں سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔

مکڑیوں میں مادہ کا سائز عموماً نر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اکثر مادہ کی خوراک بن جاتا ہے۔ مکڑیوں کی دنیا میں نر کی حیثیت بہت ہی مسکین اور یتیم جیسی ہے۔ پہلے وہ مادہ کے ناز و نخرے اٹھاتا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے پاس جاتا ہے۔ بعد میں اسے اپنی ہی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر وہ مادہ کے پاس سے بھاگتا ہے۔

ریشم کے کیڑے کی طرح مکڑی سے بھی ریشم حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ وجہ یہ ہے کہ مکڑیاں بڑی تعداد میں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ ایسی صورت میں یہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتی اور اپنی ہی نسل کو کھانا شروع کر دیتی ہیں جبکہ ریشم کے کیڑے ہزاروں کی تعداد میں بڑے مزے سے اکٹھے رہتے ہیں۔

مکڑی کی بیشتر اقسام ماحول دوست جاندار ہیں۔ پاکستانی مکڑیوں پر جاری تدریس و تحقیق کو بین الاقوامی معیار کا بنا کر ہم کیڑے مار ادویہ پر خرچ اور ضائع ہونے والے قیمتی سرمائے کو بچا سکتے ہیں۔ یہ بات قابل قدر اور لائق تحسین ہے کہ پاکستانی درس گاہوں میں قدرت کے اس عظیم شاہکار پر تحقیق ہو رہی ہے۔ ایسا ہی ایک نام پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ حیوانیات کی پروفیسر میڈم عابدہ بٹ کا ہے جو عرصہ دراز سے اپنے طالب علموں کو اس اہم جاندار پر تحقیق کرا رہی ہیں۔ مگر اس دقیق، اہم اور انتہائی ضروری میدان میں ابھی بھی تحقیق و تدریس کی بے پناہ گنجائش موجود ہے۔

◆◆◆

فریزر میں رکھا سمبندھ

مادی خواہشات سے مغلوب جوڑے کا فسانہ
ایک انوکھی تمنا نے ازدواجی رشتے میں
دراڑیں پیدا کر ڈالیں

کلدیپ بگا/اخلاق حیدرآبادی

سمیر اور رچنا دونوں سرکاری دفتر میں کام کرتے ہیں۔ ان کا ایک بچہ ہے۔ دونوں کی ان کی گھر گرہستی ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔ لیکن میاں بیوی کا من یہ سوچ کر دکھی رہتا ہے کہ ان کا رہن سہن اپنے رشتے داروں اور کئی دوستوں سے کم تر ہے۔ یہ احساس ہر وقت انھیں گھیرے رہتا ہے۔

سمیر کے کچھ رشتے دار چند برسوں ہی میں بڑے امیر بن گئے۔ ان کے کام دھندے تو معمولی ہیں لیکن شاندار کوٹھیاں اور گھر کے عیش و آرام دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ لاکھوں روپے کماتے ہیں۔

رچنا کے بھی کئی رشتے دار ٹھیکے دار ہیں۔ وہ بہت کم پڑھے لکھے ہیں۔ رہن سہن میں گنوار پن جھلکتا ہے۔ لیکن ان کے پاس عیش و آرام کی سبھی چیزیں ہیں... کار، بنگلہ، ایئرکنڈیشنر اور ٹی وی وغیرہ۔

جب بھی وہ اپنے ایسے رشتے داروں کے ہاں جائیں، تو انھیں اپنے اوپر شرم آنے لگتی ہے۔ خود پر کوفت ہوتی ہے۔ "ہمیں پڑھ لکھ کر کیا ملا؟" یہ سوال کئی بار ان کے درمیان اٹھا۔ ہر بار ایک لمبی بحث چھڑتی ہے۔ وہ دونوں اپنے دفتر کے کاموں میں جتے رہتے ہیں۔ ایمانداری سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہر بار پریشانی ہی ہاتھ آتی ہے۔

سمیر سمجھانے کے انداز میں بولتا ہے۔ "بیوپار اور نوکری میں بہت فرق ہے۔ ہمیں صرف انسانی سکھ میں زیادہ دھیان دینا چاہیے۔"

رچنا اداس ہو کر بولتی ہے "ہم دونوں کام کرتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ چھوٹی سی ہماری گرہستی ہے پھر بھی ہم اپنا مکان نہیں بنا سکے۔ اپنے گھر اور ڈرائنگ روم کو اچھے ڈھنگ سے سجا نہیں سکے۔ ہم ایک فرج تک تو خرید نہیں سکے۔"

فریج کے موضوع پر ان دونوں میں کافی تکرار ہو جاتی۔ رچنا سوچتی کہ ان کے پاس فریج ہو تو اشیا تادیر رکھنے میں آسانی رہے گی۔ کئی بار فریج خریدنے کا پروگرام بنا اور بگڑ گیا۔ ہر بار مہنگائی اور نئے بجٹ کے کارن قیمتیں بڑھ گئیں۔ ان کا جوش ٹوٹ جاتا۔ رچنا کے ماموں کا لڑکا موبل آئل اور تیل کا کام کرتا ہے۔ ایک دن اس کے گھر سے واپس آتے ہوئے وہ بولی

"آپ نے ان کا نیا فریج دیکھا۔ فل سائز خریدا ہے۔"

"ان کا کیا ہے بجٹ کا اعلان ہوتے ہی چالیس ہزار روپے کا فائدہ ہو گیا۔ مال پر دولی لگ گئی۔" کبیر بولا۔

"دکھ تو بس ہمارے لیے ہے۔ چکی کی طرح زندگی پسے جاؤ۔ ہر بجٹ مزید مہنگائی بڑھاتا جائے۔" رچنا مایوسی سے بولی۔

فریج خریدنے کے لیے ایک بار تو رچنا نے پراویڈنٹ فنڈ سے سات ہزار روپیہ نکلوا بھی لیا۔ تبھی کبیر کی بہن کی شادی کا خرچا آن پڑا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ باقی پیسے بنک سے قرضہ لے کر فریج خرید لیں گے لیکن سارا منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

دفتر میں ان دونوں کے اپنے اپنے ساتھی تھے اور سب گھروں کے مالک! کسی کے گھر کا بڑھیا ڈرائنگ روم، کسی گھر کا فریج، کسی کے گھر میں ائیر کنڈیشنر اور کسی کے گھر میں ایل سی ڈی ٹی وی وغیرہ۔

ایک دن وہ باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے بولی "آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"کیا؟" اس نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بتایا تھا کہ لکھنؤ میں جہاں ہم رہتے تھے، اسی گلی میں ایک خاندان مقیم تھا۔ ان کے ساتھ ہمارے اچھے تعلقات تھے۔ ان کے ایک لڑکے کا نام راکیش تھا۔"

یہ کہہ کر رچنا کبیر کو آنکھوں کے کناروں سے دیکھنے لگی۔

"تم نے اس کا ذکر تو کیا تھا۔ شاید اس نے اپنی بھابی کی معرفت تم سے شادی کی بات بھی کی تھی۔"

رچنا یہ سن کر ہنسنے لگی، بولی "آپ کو یہ بات اب تک یاد ہے؟"

کبیر جھینپ گیا۔ اسے رچنا کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"وہ آج مجھے اچانک ہی دفتر سے واپس لوٹتے ہوئے مل گیا۔ میں کناٹ پلیس بس کی قطار میں کھڑی تھی۔ اچانک ایک کار میرے سامنے آ کر رکی۔ میں تو گھبرا گئی۔ تبھی میں نے سنا، راکیش مجھے آواز دے کر بلا رہا تھا۔ آپ لکھنؤ میں اس سے ملے تھے ناں؟"

"ہاں ایک بار ملا تھا۔ پر اس دن وہ جلدی میں تھا۔ اس سے کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔"

"پڑھنے میں وہ ہوشیار نہیں تھا۔ ایک دو بار فیل بھی ہوا پھر گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔" رچنا جوش بھرے انداز میں بولتی جا رہی تھی۔

"میں نے اس سے پوچھا، کیا حال ہے؟ کہنے لگا، تین بچے ہو چکے۔ اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا لیکن اپنے آپ ہی میرے منہ سے نکل گیا 'ہمارا ایک بچہ ہے۔'"

پھر رچنا بتانے لگی کہ اس نے صابن کا بڑا کارخانہ لگا لیا ہے۔ تین چار شاخیں کھول لی ہیں۔ سبھی بھائیوں کے پاس اپنی اپنی کار ہے۔ کبیر اخبار پڑھتا

چاہتا تھا۔ رچنا راکیش کے ساتھ ہوئی ساری باتیں بتا کر غم ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

"اس کو رات کے کھانے پر بلا لیتی۔"

"آپ سے ڈرتا ہے۔" رچنا کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"کیوں؟"

"مجھے ایسا ہی لگا۔ میں نے اسے کہا، چلو گھر چلیں لیکن وہ ٹال گیا۔ میں نے اسے گھر آنے کے لیے کہا ہے۔ شاید وہ کسی دن آئے۔"

.....☆☆.....

ایک دن کھانا کھاتے ہوئے رچنا نے بتایا۔

"کل راکیش کہہ رہا تھا اگر فریج لینا ہو تو مجھے بتانا۔ فریج میں کمپنی سے بھجوا دوں گا۔ پیسے جب ہو جائیں تو دے دینا۔"

"وہ کیوں دینے لگا؟" سمیر کے لہجے میں کڑواہٹ تھا۔

رچنا یہ سن کر سہم گئی۔ کچھ لمحے رک کر بولی "جان پہچان کا ہے۔ مدد کرنا چاہتا ہے۔"

سمیر کو وہ پہلی نظر میں برا لگا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کڑوی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سوچنے لگا وہ یہ پرانے ہتھکنڈے ہمارے ساتھ ہی کیوں استعمال کرنا چاہتا ہے۔

"آپ کا کیا خیال ہے.....؟" رچنا کے سوال نے اس کا دھیان توڑ دیا۔ اب اس کی بھوک مر چکی اور گلے میں خراش سی ہونے لگی تھی۔

"وہ ہمارا کیا لگتا ہے؟ وہ ہمیں فریج کیوں لے کر دینا چاہتا ہے؟"

"کیوں کیا وہ ہمارا دوست نہیں ہو سکتا؟ آپ کی دوست، رانی ہماری کیا لگتی ہے؟ اس کا شوہر کیا لگتا ہے ہمارا؟ وہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟ اس کا خیال ہے میں آپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔"

"وہ کیا سیاہ کو سفید کرنا چاہتا ہے۔" سمیر کہتے کہتے رک گیا۔

رچنا اس کا چہرہ پڑھتی ہوئی بولی "کتنے الٹا سوچتے! اپنی طرف سے بڑے جوشیلے بنتے ہیں۔ ہندوستانی شوہر ہو نا آخر! سیدھی سی بات ہے اور آپ پریشان ہو رہے ہیں۔"

وہ پھر اپنے اپنے دائروں میں سمٹ گئے۔ وہ باورچی خانے میں کام کرنے لگی۔ سمیر رات کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"صبح دفتر جانے سے پہلے ناشتا کرتے ہوئے سمیر نے کہا "میں سوچ رہا تھا، اس کا ہمارا کیا رشتہ ہے؟"

"میں نے کہا نہ کہ اب اس بات کو یہیں ختم کریں۔ سچ مچ میں نے پاگل ہوں۔" وہ بپھر اٹھی۔

گھر میں ایک سوال ہوا میں جھولتا رہتا۔ رچنا اب فریج کی بات کرنے سے کترانے لگی۔ وہ بڑی سہمی ہوئی بات کرتی کہ کہیں سمیر کا موڈ نہ بگڑ جائے۔ وہ دونوں اس بات کو جتنا ٹالنا چاہتے اتنا ہی وہ سوال کسی بہانے سامنے آن کھڑا ہوتا۔

آخر ایک دو دن بعد گھر میں پہلے کی طرح ہنسی مذاق ہونے لگا۔ دونوں اپنے اپنے دفتر کی باتیں سناتے مگر پتا نہیں کیسے بات مہنگائی پر آ گئی۔ وہ دونوں بڑھتی ہوئی مہنگائی کا حساب جوڑنے لگتے۔ شام کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا۔ سمیر من ہی من میں ایک مشکل کا حل ڈھونڈتا۔ بہت دنوں بعد ایک چھٹی والے دن سمیر نے رچنا کو بتایا کہ کیوں نہ وہ رشتے داروں کی مدد لے

کر فریج خرید لیں۔ راکیش کو کیوں تکلیف دی جائے۔

رچنا کو یہ سمجھاؤ بڑا پسند آیا۔ سمیر نے اپنے چچا کو خط لکھا۔ رچنا نے اپنے بڑے بھائی صاحب کو اسی دن خط لکھ دیا۔ خطوں کے جواب کا انتظار ہونے لگا۔ سب سے پہلے سمیر کے چچا کا خط آیا۔ انھوں نے لکھا تھا "مجھے کاروبار میں بڑی طرح گھاٹا ہوا ہے۔ کام بند ہے۔ ابھی میں بچھ دینے کی حیثیت میں نہیں۔" سمیر کو دھکا سا لگا۔ اسے امید نہیں تھی کہ چچا اس قسم کا جواب دیں گے۔ رچنا کو وہ کیا بتائے گا؟ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ اداس لگتے ہو؟"

شوہر نے چپ چاپ اس کے آگے خط رکھ دیا۔ رچنا ایک ہی سانس میں پورا خط پڑھ گئی۔ وہ چپ رہی اور بات ٹال گئی۔

دوسرے ہفتے رچنا کے بھائی کا خط آیا۔ انھوں نے بھی پچھلے مہینے ہی کار خریدی تھی۔ اس لیے ابھی پیسہ مدد نہیں کر سکیں گے۔ رچنا خط پڑھ کر رو دی۔

اب ان دونوں کے بیچ پیار اُمڈ آیا۔ وہ سب سے کٹ کر آپس میں جڑ گئے۔ دونوں کو لگنے لگا کہ ان کے لیے سبھی کنارے ٹوٹ چکے۔ سمیر کے من میں ایک کانٹا گہرائی میں چبھ رہا تھا۔ وہ اکثر سوچتا، راکیش کی مدد لینے میں کیا حرج ہے؟

آخر ایک دن سمیر بول ہی پڑا "راکیش کو فون کر دیں۔ اس کی بات مان لینے میں کیا حرج ہے۔"

رچنا غصہ کر لی رہی کہ اب اس سوال کو نہ اٹھایا جائے تو اچھا رہے گا۔ لیکن سمیر نے راکیش کو فون کر دیا۔ گھر میں نیا فریج آ گیا۔ ان کی قدر کی رشتے داروں سے بڑھ گئی۔ دونوں اپنے اپنے دفتر کی باتیں سناتے۔ پتا نہیں بات کیسے ہنگامی پر آ گئی۔ کبھی شام کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا۔ اس سے رچنا کو لگتا کہ سمیر کچھ بدل سا گیا ہے۔

"دوست سے فریج کا پانی کیسی بھی پیاس ہو۔" روز ہی ایسے کسی مذاق کو لے کر خاصی تکرار ہو جاتی۔

ایک بار رچنا نے کہہ دیا "آخر ہمارا دوست ہی کام آیا نا۔"

رچنا نے دیکھا کہ سمیر کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اسے اس کی اتنی نادانی تھی۔ محسوس ہونے لگا کہ سمیر پریشان نظر آتا ہے۔

اس دن سمیر بہت اداس تھا۔ رچنا نے یونہی پوچھا "کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دس برس ہو گئے ہیں، ابھی تک ترقی نہیں ملی۔ ترقی مل جاتی تو قرض جلد اتر جاتا۔"

رچنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سمیر کو دیکھتی رہی۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ سمیر کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اچانک رچنا کا دھیان فریج کی گھوں گھوں کی طرف چلا گیا۔ بولا "فریج شور کرنے لگا ہے۔ اس میں ضرور کوئی خرابی ہے۔"

رچنا اس کے ساتھ لیٹی تھی۔

"اس نے اندر اور باہر سب جگہ شور مچا دیا ہے۔ کل ہی اسے واپس بھجوا دو۔" سمیر بولا۔

رچنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسری طرف کروٹ بدل کر لیٹی رہی۔ کمرے میں گھوں گھوں کا شور ہے۔ وہ دونوں خاموش لیٹے ہیں۔ رچنا کو لگا کہ ان دونوں کے سمبندھ کو کسی نے فریزر میں رکھ دیا ہے۔ اب وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور ہو چکے۔

◆◆◆

جوان رکھنے والی غذائیں

انسان کو دماغی اور جسمانی طور پر صحت مند اور جوان رکھنے والی قدرتی اور سستی غذاؤں کا تذکرہ

ڈاکٹر شائستہ خان

ہنری فورڈ (1947-1863ء) ممتاز امریکی شخصیت گزرے ہیں۔ گو امریکی عوام اب انھیں کم ہی یاد کرتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہنری فورڈ امریکا میں یہود کے بڑھتے اثر و رسوخ سے خائف تھے۔ سو وہ یہود کے مخالف رہے۔ اسی وجہ سے یہود کے زیر اثر امریکی میڈیا اب انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ انہی فورڈ صاحب کا بڑا خوبصورت قول ہے: ''جو انسان علم پانا ترک کر دے، وہی بوڑھا ہے... چاہے اس کی عمر [illegible] سال ہو یا اسی برس! جو بھی سیکھنے کا عمل جاری رکھے، جوان رہتا ہے۔ سو زندگی میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ [illegible] جوان رکھا جائے۔''

اس قول کی اہمیت اپنی جگہ مگر انسان جسم کو جوان رکھنے کی تدابیر بھی اختیار کرے تو یوں دماغی و جسمانی طور پر تندرست رہ کر وہ طویل عمر پا سکتا ہے۔ یہ انداز حیات خصوصاً ان انسانوں کو اپنانا چاہیے جو معاشرے میں بامقصد و مفید کام کرتے ہیں۔

جسمانی و دماغی تندرستی پانے کا ایک طریق کار اچھی غذا کھانا ہے۔ اسی باعث مغرب میں ''غذائیات کی سائنس'' وجود میں آ چکی۔ اس شعبہ علم میں بذریعہ

تحقیق و تجربات دیکھا جاتا ہے کہ کون سی غذائیں انسان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتی ہیں۔ علمی تحقیقات کی روشنی میں درج ذیل بیس غذائیں دوسری اغذیہ سے زیادہ غذائیت بخش ثابت ہوئی ہیں۔ انہیں استعمال کیجیے، صحت پائیے اور آنے والے برسوں میں بھی تندرستی کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتے رہیے۔

1۔ قاطع کولیسٹرول...... السی کے بیج
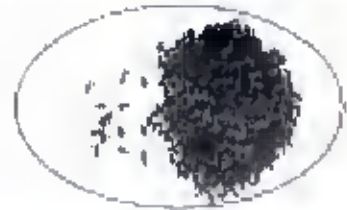
یہ بیج اومیگا تھری فیٹی ایسڈز کا خزانہ ہیں۔ یہ مادہ جسمانی سوزش دور کرتا ہے اور شریانوں میں چربی کی تھکلیاں نہیں بننے دیتا۔ مزید برآں یہ دو مادے لائی گینز (Ligans) اور حل پذیر ریشہ (Soluble Fiber) بھی رکھتے ہیں۔ یہ دونوں انسانی جسم میں برے کولیسٹرول (ایل ڈی ایل) کا خاتمہ کرتے ہیں۔

السی کے بیجوں کو کئی اعتبار سے استعمال کرنا ممکن ہے۔ مثلاً بسکٹوں یا کیک میں ڈالیے۔ ملک شیک کا حصہ بنائیے یا کھانوں پر چھڑک کر کھائیے۔ یاد رہے! ہمارے بدن میں ایل ڈی ایل کی مقدار 100 فیصد MG/DI سے کم ہونی چاہیے۔
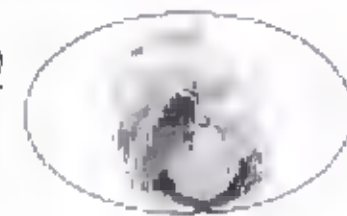
2۔ سرطان (کینسر) کی دشمن...... شاخ گوبھی

یہ ایک مشہور سبزی ہے جسے پکا کر یا کچا کھایا جاتا ہے۔ یہ کئی اہم فائٹو نیوٹرنٹ (Phytonutrients) کی حامل ہے۔ یہ انسان دوست کیمیائی مادے سوزش کم کرتے نیز ہمیں پھیپھڑوں، معدے اور دیگر اعضا کے سرطان سے بچاتے ہیں۔

یہ قدرتی کیمیائی مادے دراصل ان جینز (Genes) کو بحال اپنا کام نہیں کرنے دیتے جو سرطانی رسولیاں پیدا کرتے ہیں۔ چناں چہ ان کا علاج سہل ہو جاتا ہے۔ سو سرطان سے محفوظ رہنے کی خاطر شاخ گوبھی بطور سلاد کھائیے یا سالن بنائیے۔

3۔ جلد کا محافظ...... انگور

اس پھل کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً سبز، سرخ، سیاہ اور جامنی انگور۔ ان میں سرخ انگور سب سے زیادہ کیمیائی مادہ ریسوریٹرول (Resveratrol) رکھتے ہیں۔

یہ کیمیائی مادہ جلد کو سوزش سے بچاتا ہے۔ سو وہ تروتازہ اور چمکدار رہتی ہے۔ مزید برآں ریسوریٹرول ہمیں سورج کی شعاعوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یاد رہے دھوپ کی زیادتی انسان کو جلد کے سرطان میں مبتلا کر سکتی ہے۔

4۔ فوری توانائی دیجیے...... چاکلیٹ دودھ

انسان ورزش کرنے کے بعد عموماً تھکن اور گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ "انرجی ڈرنک" پی کر کھوئی توانائی و چستی پانے کی سعی کرتا ہے۔ مگر انرجی ڈرنک سے کہیں بہتر چاکلیٹ ملا دودھ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ مشروب کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین کا بہترین امتزاج ہے۔ سو وہ انسان کو فوری توانائی فراہم کرتا ہے۔ مزید برآں تجربات سے عیاں ہو چکا کہ جو مرد ورزش چاکلیٹ ملا دودھ نوش کریں، انہیں موٹاپا

نہیں چھٹتا، بلکہ زیادہ عضلات جنم لیتے ہیں۔ سو مجموعی طور پر ان کی جسمانی ہیئت جاذب نظر رہتی ہے۔

5۔ موٹاپے کا دشمن... جو

کئی پاکستانی مرد و زن فربہی کا شکار ہو کر مختلف ٹوٹکے آزماتے ہیں۔

ایک قدرتی طریقہ یہ ہے کہ ناشتے میں سالم جو کھائیے۔ یہ موٹاپا ختم کرنے کی زود اثر غذا ہے۔

وجہ یہ کہ جو کے کاربوہائیڈریٹ کم گلائسیمک انڈکس رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ دیگر کاربوہائیڈریٹ کی نسبت جو والے کاربوہائیڈریٹ خون کی شکر آہستہ آہستہ بلند کرتے ہیں۔ اس باعث انسان کو بھوک زیادہ نہیں لگتی اور اسے سیری کا احساس رہتا ہے۔ جو کم کھانے سے موٹاپا خود بخود ختم ہونے لگتا ہے۔

6۔ درد، سوزش اور ادرک
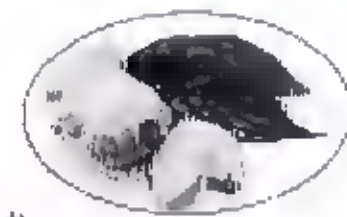
جدید طبی تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ ادرک درد دور کرنے والے کیمیائی مرکبات رکھتا ہے۔ ایک تجربے میں ڈنمارک کی اوڈینسی یونیورسٹی کے ڈاکٹر کرشنا سری واستاوا نے تین ماہ تک ایسے مرد و زن کو ادرک کی تھوڑی سی مقدار روزانہ کھلائی جن کے جسم درد، سوزش اور کھنچاؤ میں مبتلا تھے۔ سبھی نے درد و تکلیف سے نجات پائی۔ چناں چہ ادویہ کو خیرباد کہیے اور اس قدرتی غذا سے ناتا جوڑیے جو کسی قسم کے مضر اثرات بھی نہیں رکھتی۔

7۔ ہڈیاں مضبوط کریں...... سخت پنیر

یہ پنیر کی ایک قسم ہے جو دہی اور اس کے پانی کو بار بار نتھارنے سے بنائی جاتی ہے۔ سخت پنیر (Hard Cheese) کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام پنیروں سے زیادہ کیلشیم ملتا ہے۔ چناں چہ اس کا محض 50 گرام ٹکڑا 550 ملی گرام کیلشیم رکھتا ہے۔

سخت پنیر کی ایک اور خصوصیت اس کا ہاضم ہونا ہے۔ سو اگر آپ ہڈیوں کی بوسیدگی (Osteoporosis) یا کمزوری کا شکار ہیں تو اسے باقاعدگی سے کھائیے۔ کھانا جلد ہضم کرنے کی اضافی خوبی بھی تندرستی بخشے گی۔

8۔ عضلات قوی بنائیے...... پالک

انسان زیادہ کھانا کھاتے لگے یا بڑھاپے میں قدم رکھے تو اس کے عضلات ڈھیلے ہو کر لٹک جاتے ہیں۔ اس خرابی پر پالک کھا کر قابو پائیے۔ وجہ یہ کہ یہ سبزی میگنیشیم کا خزانہ ہے۔ چناں چہ صرف ایک پلیٹ پالک کھانے سے انسان کو میگنیشیم کی روزانہ ضرورت کا 85 فیصد حصہ مل جاتا ہے۔

میگنیشیم انسانی جسم میں عضلات اور نسوں کی ہیئت معمول پر رکھتا ہے۔ نیز بلڈ پریشر اور خون میں شکر کی سطح بھی متوازن کرتا ہے۔ یاد رہے! پالک پکا کر کھائیے، تبھی میگنیشیم جسم میں جذب ہوتا ہے، ابال کر کھانے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔

9۔ کولیسٹرول مار مادہ...... سیب

بچوں بڑوں کا یہ من پسند پھل پیکٹن

(Pectin) نامی حل پذیر (Soluble) ریشہ رکھتا ہے۔ یہ ریشہ خون کی نالیوں میں کولیسٹرول نہیں جمنے دیتا اور یوں ہمیں امراض قلب سے محفوظ رکھتا ہے۔ نیز خلیوں کی دیواروں کو "سیمنٹ" فراہم کرتا ہے تاکہ وہ مضبوط رہیں۔

پیکٹن کی ایک اور خوبی باعث کشش ہوتا ہے۔ نیز یہ جام جیلی کی تیاری میں بھی مستعمل ہے۔ یہ حل پذیر ریشہ سب سے زیادہ سیب میں ملتا ہے۔ مگر اسے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سیب چھلکوں سمیت کھایا جائے۔ بیشتر پیکٹن اور دیگر صحت بخش اجزا اس کے چھلکوں میں ملتے ہیں۔

10۔ فولاد پائیے...... مچھلیاں

بعض اوقات انسان کو روزمرہ کام کاج کے دوران تھکن اور سستی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دراصل اس امر کی نشانی ہے کہ جسم میں فولاد کی کمی جنم لے چکی۔ یہ ایک اہم معدن ہے جو آکسیجن کو خون کے خلیوں سے باندھتا ہے۔

اگر انسانی بدن میں فولاد کی کمی ہو، انسان ارتکاز توجہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس پر تھکن طاری رہتی ہے اور وہ اپنا درجہ حرارت منضبط نہیں کر پاتا۔ یہ معدن گوشت میں زیادہ ملتا ہے۔ تاہم گوشت نہ کھانے والے مچھلیوں اور پھلیوں (Beans) سے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ چنوں میں بھی وافر فولاد ملتا ہے۔

11۔ توانائی بحال رکھیے...... جئی

یہ اناج کھلاڑی اور سخت ورزش کرنے والوں کے لیے مفید ہے۔ وجہ یہ کہ اگر کھیل یا ورزش سے پہلے تھوڑا قبل جئی کھالی جائے تو انسان طویل عرصہ خود کو طاقتور اور چست محسوس کرتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ جسم میں جئی کا نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) سست رفتاری سے جلتا ہے۔ سو انسان کو تادیر توانائی ملتی رہتی ہے۔ جب کہ دیگر اناج یا غذائیں جلد ہضم ہوتی ہیں، تو انسانی جسم مزید توانائی طلب کرنے لگتا ہے۔

12۔ السر کو بھگائیے... پیاز سے

دماغ، دل، جگر، گردے اور شکم (یا پیٹ) ہمارے بدن کے پانچ اہم ترین اعضا ہیں۔ سو ان میں کوئی خرابی جنم لے تو انسان پریشانی اور گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ امراض شکم دور کرنے میں پیاز مفید سبزی ثابت ہوئی ہے۔

دراصل ہمارے پیٹ میں رہائش پذیر ایک جرثومہ "ہیلیکوبیکٹر پائلوری" السر، سوزش معدہ (Gastritis) اور حتیٰ کہ سرطان پیدا کرتا ہے۔ مگر پیاز کا باقاعدہ استعمال جرثومے کی افزائش روکتا اور اسے درج بالا بیماریاں پیدا نہیں کرنے دیتا۔

یاد رہے، لہسن اور چائے بھی ہیلیکوبیکٹر پائلوری کا راستہ روک سکتے ہیں۔ تاہم پیاز اور لہسن کو تیل میں تلا جائے تو وہ جرثومے کو روکنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔

دنیا کی دوسری بڑی مسجد

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مدینہ منورہ میں واقع یہ مقدس عبادت گاہ مسلمانانِ عالم کی آنکھوں کا نور ہے
اور دلوں کا سرور بھی

عبدالمالک مجاہد

گزشتہ تین عشروں میں مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر و ترقی میں بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ کسی دور میں یہ چھوٹی سی مسجد تھی آج یہ حرم مکی کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اعزاز رکھتی ہے۔ وہاں ہر وقت توسیع کا کام جاری رہتا ہے۔ جب بھی حاضری کا موقع ملا مسجد نبوی ﷺ میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور دیکھی۔

مسجد نبویؐ کی شاندار تاریخ ہے۔ اس مسجد نے اسلامی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ مدینہ آمد کے بعد آپؐ نے لوگوں سے فرمایا ''میری اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو، یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ جہاں اسے حکم ہوگا یہ بیٹھ جائے گی۔'' چناں چہ اونٹنی میدان میں جہاں آج کل مسجد نبویؐ واقع ہے بیٹھ گئی۔ یہ جگہ یتیم بچوں سہل اور سہیل کی تھی۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''مسجد کی جگہ خرید لی جائے۔'' ابوبکرؓ نے اس دور میں زمین کے مروجہ نرخوں کے مطابق دس دینار ان یتیم بچوں کو ادا فرما دیے۔

جب تعمیر مسجد کا مرحلہ آیا تو پہلے میدان ہموار کیا گیا۔ پھر مسجد نبویؐ کی بنیادیں کھودنے کا کام شروع ہوا۔ جیسے ہی صحابہ کرامؓ کو علم ہوا کہ مسجد کی تعمیر شروع ہو چکی تو وہ نہایت جوش و خروش سے اس میں حصہ لینے لگے۔ مسجد 35 میٹر لمبی اور 30 میٹر چوڑی تھی۔ بنیادیں پتھروں سے بھری گئیں۔ تین ہاتھ کی اونچائی تک دیواریں بھی اسی

پتھر سے بنائی گئیں۔

مسجد کی تعمیر میں معمار اور مزدور بھی صحابہ کرام تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی بنفس نفیس تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ سیدنا طلق بن علی الیمامیؓ کو اللہ کے رسولؐ نے دیکھا کہ وہ بڑی مہارت سے اینٹیں بنا کر دیوار پر رکھ رہے ہیں۔ چناں چہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اس یمامی کو اینٹیں رکھنے اور دیوار بنانے کا موقع دو کہ یہ بہت اچھا معمار ہے۔''

مسجد نبویؐ کے ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے۔ کھجور ہی کی شاخوں اور پتوں سے چھت بنائی گئی جو زیادہ بلند نہ تھی لمبا آدمی ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ اونچائی کم و بیش ساڑھے دس فٹ تھی۔ چھت پر ہلکی ہلکی مٹی پھیلا دی گئی۔ مگر جب بھی بارش ہوتی تو چھت ٹپکتی اور صحن میں کیچڑ ہو جاتا۔ سو کچھ عرصے بعد کچے فرش پر کنکریاں بچھائی گئیں اور چھت پر مزید مٹی ڈال کر لپائی کر دی گئی۔

مسجد کے شمال کی جانب ایک چبوترہ بنایا گیا جس پر کھجور کے پتوں اور شاخوں کی چھت تھی۔ یہ ''صفہ'' کہلاتا تھا۔ یہاں وہ صحابہؓ رہتے جن کا کوئی گھر بار نہ تھا۔ وہ اللہ کے رسولؐ سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی۔

مسجد کے ساتھ حضرت عمار بن یاسرؓ کی محنت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک کے بجائے دو دو اینٹیں اٹھا کر لاتے۔ ایک بار اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں اس کیفیت میں دیکھا تو اپنے ساتھی پر شفقت فرماتے ہوئے ان کے جسم سے مٹی جھاڑنے لگے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے مسجد کے بازو میں چند مکانات بھی تعمیر کرائے جن کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں۔ کھجور کے تنے ڈال کر کھجور کی شاخوں اور پتوں سے چھتیں بنائی گئیں۔ یہی رسول ﷺ کی ازواج مطہراتؓ کے حجرے تھے۔ جب ان حجروں کی تکمیل ہو گئی تو رسول ﷺ سیدنا ابو ایوب انصاریؓ کے گھر سے یہاں منتقل ہو گئے۔

مسجد نبوی ﷺ صرف نماز پڑھنے ہی کی جگہ نہ تھی بلکہ یہ اسلامی حکومت کا ''سیکرٹریٹ'' بھی بن گیا۔ رسول ﷺ نے وہیں صحابہؓ کی تعلیم و تربیت اور ان کے تزکیہ نفس کا اہتمام کیا۔ مسجد ہی سے مختلف علاقوں کی طرف مہمات روانہ کی جاتی تھیں۔ مسجد کے کچے صحن میں مجلس شوریٰ اور مجلس انتظامیہ کے اجلاس منعقد ہوا کرتے۔ مسجد کی تعمیر کے کچھ ہی عرصہ بعد اذان شروع ہو گئی۔ دن میں پانچ مرتبہ اللہ رب العزت کی کبریائی کا یہ اعلان اپنے مقررہ وقت پر بلند ہوتا۔ سیدنا بلالؓ بن رباح کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ مسجد نبویؐ کے پہلے موذن مقرر ہوئے۔

اسلام تیزی سے پھیلا۔ جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، مسجد کی ہر دور میں توسیع اور مرمت بھی ہوتی رہی۔ مسجد نبویؐ کی عظمت اور بلند مرتبے کا ایک مظہر آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے ''تین مساجد کے سوا کسی مقام کو متبرک سمجھ کر اس کی طرف لمبا سفر نہیں کیا جا سکتا۔ مسجد حرام، مسجد نبویؐ اور مسجد اقصیٰ۔'' (بخاری، مسلم)

مسجد نبویؐ یقیناً ان مساجد میں سے ایک ہے جس کی بنیاد شروع دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی۔ رسول ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کی بنیاد رکھی۔

اس مسجد کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اس میں پڑھی ایک نماز کا ثواب دیگر مساجد میں پڑھی جانے والی ہزار نمازوں سے افضل ہے۔ علما کرام اس بات پر متفق ہیں کہ مسجد میں جتنی بھی توسیع ہوئی یا قیامت تک جتنی بھی ہوگی نئی جگہ پر بھی نماز پڑھنے کا ثواب اتنا ہی ہوگا جتنا ثواب اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں بنی ہوئی مسجد میں ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جب سن یکم ہجری میں اس کی بنیاد رکھی تو اس کا رقبہ 1050 مربع میٹر (تقریباً ساڑھے گیارہ مرلے) تھا۔ مسجد نبویؐ کی پہلی توسیع غزوہ خیبر کے بعد ہوئی۔ تب مسلمانوں کی تعداد بڑھ چکی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود مسجد کی چوڑائی میں چالیس ہاتھ اور لمبائی میں تیس ہاتھ اضافہ کیا گیا۔ اس طرح مسجد مربع کی صورت اختیار کر گئی اور اس کا کل رقبہ 2500 مربع میٹر ہو گیا۔ البتہ قبلہ کی طرف مسجد اپنی پہلی حد تک ہی رہی۔

اس توسیع شدہ مسجد کی بنیاد پتھروں پر مشتمل تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں سے بنائی گئیں اور چھت سات ہاتھ اونچی تھی۔ توسیع شدہ زمین سیدنا عثمان غنیؓ نے خریدی تھی۔ بعد میں مختلف حکومتوں کے سربراہوں نے توسیع کا عمل جاری رکھا حتیٰ کہ آل سعود کی حکومت قائم ہو گئی۔ ان کے عہد میں بھی توسیع جاری رہی۔ ملک عبدالعزیز کے عہد مبارک میں ایک بڑی توسیع کی گئی۔ ان کے بعد خادم الحرمین الشریفین ملک عبداللہ بن عبدالعزیز کے عہد مبارک میں مشرقی جانب ایک بڑی توسیع عمل میں لائی گئی۔ بڑے بڑے ہوٹل اور عمارات گرا کر وہ جگہ اس میں شامل کی گئی۔

برائی کے خلاف جہاد

میرے نانا حاجی محبوب الٰہی ملک استاذ العلما حضرت علامہ مقبول احمد (پرنسپل دارالعلوم محمدیہ غوثیہ عمر خیل شرقی) کے چچا اور مولانا ڈاکٹر عبدالجبار (فاضل بھیرہ شریف) کے والد گرامی تھے۔ 1938ء میں ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے گاؤں کڑی خیسور میں پیدا ہوئے۔ بعدازاں وہاں سے ہجرت کر کے قریبی علاقہ عمر خیل شرقی میں سکونت اختیار کر لی۔ زندگی کے باقی سال وہیں بسر کیے اور 26 اگست 2011ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

حاجی صاحب مرحوم نے اپنی ساری زندگی دین کے لیے وقف کیے رکھی۔ آج کے دور میں یہ بات مفقود ہے کہ برائی کو حسب استطاعت روکا جائے جس کا حدیث پاک میں ذکر ہے "اگر تم کسی برائی کو دیکھو تو اسے ہاتھ سے روکو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو زبان سے روکو۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس برائی کو اپنے دل میں برا خیال کرو" (او کما قال النبیؐ)۔ موجودہ دور کا انسان اگر کہیں برائی ہوتی دیکھے تو اسے روکنے کے بجائے یہ سوچ کر چل دیتا ہے "مجھے کیا پڑی ہے کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی؟"

اس کے برعکس حاجی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے علاقہ میں جس جگہ آپ کو خبر ملتی کہ کوئی خلاف شرع کام ہو رہا ہے تو اپنے سارے کام چھوڑ فوراً پہنچتے اور مطلوبہ افراد کو ناصحانہ انداز میں تنبیہ کرتے۔ اگر وہ بات مان لیتے تو ٹھیک ورنہ آپ قدرے سخت لہجہ اپناتے اور بالآخر اپنی بات منوا کر ہی دم لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علاقہ اور آپ کو جاننے والے آپ کے سامنے کوئی خلاف شرع یا خلاف سنت کام کرنے سے باز رہتے۔ (مرسلہ: عبدالعزیز عمر خیلوی، عمر خیل شرقی)

آج مسجد کا کل رقبہ 400,500 مربع میٹر تک پہنچ چکا ہے۔ مسجد کے نیچے وسیع و عریض علاقے میں دو منزلہ کار پارکنگ ہے جس میں تقریباً بیک وقت پچاس ہزار گاڑیاں کھڑی ہوسکتی ہیں۔ مسجد کے دس منار ہیں۔ ہر منار کی بلندی 105 میٹر ہے۔ مسجد میں چھ لاکھ نمازی سماتے ہیں۔ دوران حج ان کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

شاہ عبداللہ بن عبدالعزیزؒ کے عہد حکومت میں صحن مسجد میں چاروں طرف برقی چھتریاں نصب کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ نمازی کرام دھوپ اور بارش سے محفوظ رہ سکیں۔ ہر چھتری مربع شکل کی ہے اور لمبائی، چوڑائی 18 میٹر ہوتی ہے۔ ابتدا میں 182 چھتریوں کی تنصیب کا حکم دیا گیا پھر مزید نصب ہوئیں۔ ان میں سے ہر ایک چھتری کے نیچے تقریباً آٹھ سو افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ چھتری جب بند ہو تو اس کی بلندی اکیس میٹر ستر سینٹی میٹر ہوتی ہے۔

مسجد کی جنوبی جانب چھ راستوں پر بھی چھت ڈالی گئی ہے تاکہ نمازی حضرات ان کے زیر سایہ آسانی سے آ جا سکیں۔ اس تمام منصوبے پر اخراجات کا تخمینہ چار ارب ستر کروڑ ریال تھا۔

مسجد میں پہلے چار منار تھے۔ خادم الحرمین الشریفین کی توسیع کے بعد ان میں چھ میناروں کا اضافہ کیا گیا۔ اب میناروں کی مجموعی تعداد دس ہے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جس وقت تم میں سے کوئی شخص اپنے گھر سے چل کر میری مسجد میں آئے تو اس کا پاؤں اٹھانا نیکیوں کا سبب بنتا ہے اور پاؤں کو زمین پر نیچے رکھنا گناہوں کے جھڑنے کا سبب بنتا ہے۔"

مسجد کے لیے لاؤڈ اسپیکر کا نظام کچھ اس طرح سے ہے کہ اس میں 600 واٹ کے "260" اسپیکر فائز نصب کیے گئے۔ یہ مسجد کے کونے کونے اور میناروں میں نصب ہیں۔ وہ مسجد کے اندر اور باہر آواز بہت سہولت سے پہنچاتے ہیں۔ مسجد میں آب زمزم اور عام پانی پلانے کا وسیع انتظام ہے۔ مکہ مکرمہ سے روزانہ زمزم لایا جاتا ہے۔ وہ زیر زمین اور بالائی ٹنکیوں میں حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق محفوظ رہتا ہے۔

مسجد کو بجلی فراہم کرنے کے لیے جدید بجلی گھر قائم ہے۔ اس کا رقبہ 11000 مربع میٹر ہے۔ اس میں چھ جنریٹر نصب ہیں۔ ہر ایک کی پیداواری صلاحیت 2.5 میگاواٹ ہے۔ ان میں سے پانچ مسجد اور ایک پارکنگ کے لیے مخصوص ہے۔ چار جنریٹر ہر وقت کام کر کے دس میگاواٹ بجلی پیدا کرتے ہیں جبکہ ایک ہنگامی حالت کے لیے موجود رہتا ہے۔

مسجد نبویؐ میں ایئر کنڈیشننگ کا نظام دنیا میں سب سے بڑا ہے۔ اس کے لیے مسجد سے کئی کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا شہر آباد کیا گیا۔ وہاں چھ مشینیں نصب ہیں جن میں سے ہر ایک 3400 ٹن ٹھنڈک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ مجموعی طور پر 20400 ٹن ٹھنڈک فراہم کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ دو چھوٹی مشینیں مسجد کی عمارت کے باہر نصب ہیں جن میں سے ہر ایک کی پیداواری صلاحیت 240 ٹن ہے۔

آپ بیتی

لعل و گوہر

جو ملے راہوں میں

قدیم مسلم معاشرے کی وہ دلچسپ قلمی جھلکیاں جنھیں دکھانے والے اب ہمارے درمیان موجود نہیں رہے...... ایک اعلیٰ سرکاری افسر کے قلم سے

شہاب الدین رحمت اللہ (آئی سی ایس)

میں پٹنہ (عظیم آباد) سے دس میل دور جانب مغرب واقع سادات کی ایک مشہور بستی نیورہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد انتقال کر چکے تھے۔ ایک سال بعد والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ میری پرورش پرنانی کے ہاتھوں ہوئی جن کی ہمشیر اردو کے مشہور شاعر نواب سید امداد امام اثر کی بیگم تھیں۔ نواب صاحب کے بڑے فرزند سر علی امام مشہور ہندوستانی سیاستدان گزرے ہیں۔

میرے نانا کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے انھوں نے مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھا اور اپنے دل میں جگہ دی۔ اپنی

شہاب الدین رحمت اللہ (1913-1992ء) انڈین سول سروس کے ان ارکان میں شامل تھے جنھوں نے آزادی کے وقت حکومت پاکستان کو اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ چھ 1959ء تک مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ آپ سچے اور دیانتدار افسر تھے۔ شاید اسی لیے عہد ایوب خان میں "جرم بے گناہی" پر سبکدوش کر دیے گئے۔

آخری ایام میں آپ نے اپنی سرگزشت "شہاب بیتی" تحریر کی جو بیسویں صدی کے سیاسی، معاشرتی و معاشی حالات پہ کماحقہ انداز میں نظر ڈالتی ہے۔ زیر نظر آپ بیتی اسی کتاب سے اخذ کی گئی۔

آنکھوں کا نور بنایا، تماشوں میں الجھایا اور کھلونے دے دے کر صرف بہلایا ہی نہیں بلکہ اپنی شفقت، محبت اور حکمت کے ذریعے باتوں باتوں ایسی تعلیم و تربیت کی جو آگے چل کر میری شخصیت کی تعمیر میں بنیادی اینٹ ثابت ہوئی۔ یہی عظیم سرمایہ میرے روحانی ایام کا سرچشمہ اور روحانی ارتقا کی اساس بنا۔

بزرگانِ نیورہ کے لطیفے

نیورہ میں دو منچلے بھائی عابد اور زاہد رہتے تھے۔ وہ نواب سید امداد امام اثر صاحب سے واقف تھے۔ ایک دن وہ ان کے سامنے سے گزرے۔ نواب صاحب نے سرد آہ کھینچی اور فرمایا "نہ ان میں سے کوئی عابد ہے نہ ان میں سے کوئی زاہد۔"

...

ایک ہندو پنڈت جنھیں اردو، فارسی کے شاعر ہونے کا خبط تھا، حاضر ہوئے۔ بڑی منت سماجت کے بعد نواب اثر کو چند اشعار سنانے کی اجازت لی اور کہا "حضور ردو حرفی کہی ہے۔"

نواب صاحب نے فوراً کہا "ٹھہریے پہلے ذرا مجھ سے ایک حرفی سنیے:

"آ" روز گیا ہاتھ میں لے کر سوتا
"ب" روز گیا ہاتھ میں لے کر سوتا
موقوف نہیں ان پہ ب روزا روزانی
"ت" روز گیا ہاتھ میں لے کر سوتا

پنڈت جی نے کہا "چھوڑیے حضور! فارسی کلام سنیے جو تصوف کے رنگ میں ہے۔"

ہمہ آزاں، ہمہ اذاں، ہمہ اوں
ہمہ زاداں، ہمہ زدوں، ہمہ زداں

نواب صاحب نے ہاتھ جوڑ کر فرمایا "پنڈت جی! [illegible] دنیا کے سب شاعر مر گئے، ایک میں ہی رہ گیا ہوں جسے آپ سنا سکتے ہیں۔"

انگریز افسروں سے ٹاکرا

انگریزوں کے دور میں انگریزوں کی بدمزاجی اور حکمرانی کا زعم مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا۔ اگر کوئی انگریز فرسٹ کلاس میں سفر کرتا تو کوئی "کالا آدمی" (ہندوستانی) اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار مسٹر حسن امام پٹنہ سے کلکتہ جا رہے تھے۔ پنجاب میل میں ان کی فرسٹ کلاس برتھ مخصوص تھی۔ ریل آئی تو فوراً ملازموں نے برتھ پر ان کا بستر لگا دیا۔ حسن امام صاحب چادر تان کر لیٹ گئے۔ اتنے میں ایک انگریز ڈبے میں داخل ہوا۔ انھیں سوتا دیکھ کر شرارت سے ان کی توند پر بیٹھ گیا۔

مسٹر حسن امام فوراً اٹھے اور ڈبے سے نکل غصے میں

بخت، ڈیوا گل انجن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ریل چلنے والی تھی کہ اس کے انگریز ڈرائیور کی نظر پڑی، بھاگا بھاگا آیا۔ کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ ہنگامہ ہوا کہ یہ تو مسٹر حسن امام ہیں۔ ڈیوٹی پر متعلقہ عملے، ڈرائیور اور گارڈ نے معاملات سلجھانے کا وعدہ کیا اور بتایا کہ تاخیر سے ان کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ حسن امام نے اس شرط پر ڈبے میں جانے کی رضا مندی ظاہر کی کہ اب وہ انگریز ڈبے میں نہیں بیٹھے گا۔

ریلوے حکام نے معاملات کی نزاکت انگریز کو سمجھائی، لیکن وہ بھی دوسرے ڈبے میں سفر کرنے پر راضی نہ ہوا۔ جب حسن امام صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ملازموں کو حکم دیا کہ وہ انگریز کا سارا سامان ڈبے سے باہر پھینک دیں۔ انگریز نے جب مزاحمت کی تو بیچارے مسٹر حسن امام نے اسے بھی نکال باہر کیا۔ ریل تو پہلے ہی چلنے کے لیے بے چین تھی، اس نے سیٹی دی اور چل پڑی۔ حسن امام صاحب اپنی برتھ پر آرام سے لیٹ گئے جس پر ان کو قانونی حق تھا۔ اس واقعہ کی اخبار میں بھی اشاعت ہوئی۔

٭٭٭

ایک مرتبہ مسٹر حسن امام اپنی انگریز بیوی کے ساتھ پٹنہ ریلوے اسٹیشن پر انتظار گاہ میں چائے پی رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک انگریز بیٹھا گھور گھور کر بیگم امام کو دیکھنے لگا۔ بیگم امام نے شوہر کی توجہ اس طرف دلائی، تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کوٹ اتارا، آستین چڑھائی اور ایک ہاتھ سے کانٹا پکڑے انگریز کی جانب لپکے اور چلائے:

"تیار ہو جاؤ، میں تمھاری آنکھیں نکالنے لگا ہوں۔"

ان کی للکار سن کر انگریز ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے پوچھا "میرا قصور کیا ہے؟"

"تو خود سوچ کہ تیرا قصور کیا ہے؟" حسن امام نے کہا۔

انگریز معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اس نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بہرحال میں معافی مانگتا ہوں" اور معافی مانگتا بھاگ کھڑا ہوا۔

سول سرجن کا کتا

عزیز صاحب بیرسٹری پاس کر کے تازہ تازہ ولایت سے آئے تو علی منزل فریزر روڈ پر اپنے دوست سر علی امام کے ساتھ رہ کر پریکٹس شروع کر دی۔ ایک دن نوکروں نے شکایت کی کہ قریب ہی رہنے والے ایک انگریز کا کتا باورچی خانے میں گھس آتا اور مرغیاں، گوشت لے بھاگتا ہے۔ انگریز کا کتا ہے، کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اس پر عزیز صاحب نے ملازموں سے کہا "اس بار اگر کتا آئے تو اسے اچھی طرح مارو۔ میں سمجھ لوں گا۔ قانون میں جانتا ہوں، تم نہیں؟"

دوسرے دن جب انگریز کا کتا باورچی خانے میں داخل ہوا تو نوکروں نے اس کی اچھی طرح مرمت کی۔ کتا تڑپتا، شور مچاتا سیدھا اپنے مالک کے پاس پہنچا تو وہ بے حد غصے میں آیا۔ کتے کو ساتھ لیے علی منزل کی طرف بڑھا۔ ملازم نے سول سرجن کو آتے دیکھ کر عزیز صاحب کو اطلاع دی۔ وہ پردے کے پیچھے سے دیکھتے رہے۔ نوکروں نے پوچھا "کیا حکم ہے مالک؟"

عزیز صاحب نے ہدایت کی کہ جب سول سرجن باورچی خانے میں آئے تو اس کی بھی اچھی طرح پٹائی کر دو، ہم دیکھ لیں گے۔ سول سرجن طیش میں جب کپا اندر چھلانگتا باورچی خانے کے اندر پہنچ گیا تو عزیز صاحب نے حکم دیا "مارو۔" ساتھ ہی انھوں نے سول

سرجن کے خلاف مداخلت بے جا رپورٹ تھانے میں درج کرائی۔ اس کی ایک کاپی بطور پریس نوٹ اخباری ایجنسی کو بھجوا دی اور مطالبہ کیا کہ سول سرجن کا فوری طور پر یہاں سے تبادلہ کیا جائے۔ نتیجتاً اس سول سرجن کا جلد سے کسی اور جگہ تبادلہ ہو گیا۔

قانون تو جان لو!

ایک دفعہ میرے نانا کو لکھنؤ جانا تھا۔ میل ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ٹکٹ انٹر کلاس کا تھا۔ ٹکٹ چیکر آیا۔ ٹکٹ دیکھا تو کہا "آپ اس ریل میں سفر نہیں کر سکتے۔"

میرے نانا نے مسکرا کر کہا "میں جا رہا ہوں اور آپ کہتے ہیں کہ نہیں جا سکتے۔"

انھوں نے "ہاشتہ اید یکار" اپنے صندوق سے نام نیل نکالا اور دکھا دیا کہ اس قاعدے کی رو سے فلاں فلاں سٹیشن سے زیادہ کا سفر انٹر کلاس کا مسافر میل ریل میں کر سکتا ہے اور یہاں سے لکھنؤ کی مسافت کہیں زیادہ ہے۔ پھر میرے نانا مرحوم نے اسے مخاطب کر کے کہا "آپ انگریزی پڑھتے کیوں نہیں؟"

ٹکٹ چیکر حاضر جواب تھا، بولا "حضور اگر ہم پڑھتے تو یہی کام کرتے!"

میرے نانا نے کہا "برخوردار 'پڑھنے' سے میری مراد یہ نہیں کہ آپ نے بی اے یا ایم اے کیوں پاس نہیں کیا، بلکہ یہ کہ آدمی جو بھی کام کرے، اس کے قاعدے قانون سے ضرور واقفیت حاصل کرے۔"

٭

ایک شخص نے نانا سے عمر دریافت کی۔ انھوں نے جواب دیا "36،35 سال ہو گی۔" وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ تو میرے والد سے بڑے ہیں۔" میرے نانا نے کہا "میاں یہ سمجھ کا پھیر ہے۔

میں نے کہا یہی 36،35 سال! اگر دونوں کو ملا لو تو اکہتر بنتا ہے۔"

میرے نانا ناگپور کے ایک حکیم کے زیر علاج تھے۔ وہ مریض کو پرہیز بہت کراتے۔ حکیم نے نانا کا معائنہ کرنے کے ساتھ ہی سوال کیا "حضور کیا کھاتے ہیں؟"

کہا "چاول"

حکیم نے کہا "چاول نہ کھائیں۔"

پھر دریافت کیا "رات کو کیا تناول فرماتے ہیں؟"

نانا نے کہا "روٹی"

حکیم صاحب نے کہا "روٹی نہ کھائیں۔"

نانا نے بڑے خاص انداز میں کہا "چاول نہ کھاؤ، روٹی نہ کھاؤ، یہ نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ۔ تو اب جوتے کھانے کے سوائے اور کیا رہ گیا ہے؟"

مجسٹریٹوں اور ججوں کے لطیفے

میرے نانا مجھے انگریز آئی سی ایس جج مجسٹریٹوں اور ججوں کے بے حد دلچسپ لطیفے سنایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک پیش ہے۔

ایک انگریز جج کی عدالت میں بحث کے دوران نانا بیمار ہو گئے۔ انھوں نے عدالت سے مہلت کی درخواست کی۔ جج نے دو دن کے لیے مقدمے کی سماعت ملتوی کر دی اور سبب کے طور پر یہ نوٹ لکھا:

"The fault is of the party that brought such a sickly pleader"

(قصور اس فریق کا ہے جو بیمار وکیل لایا ہے۔)

چوک ہاؤس آرہ کا ہندو مسلم فساد

میری سب سے پرانی یاد کا تعلق شاہ آباد ہندو مسلم فساد سے ہے۔ میں وہ بھیانک رات اب تک نہیں بھولا

جب ابا اور منجھلے ابا مرحوم کو انتشار اور پریشانی کے عالم میں باہر مکان کے برآمدے میں گھر کی تمام بندوقیں، رائفلیں اور دیگر اسلحہ جمع کرتے، سیکڑوں خالی کارتوسوں کو بارود اور چھروں سے بھرتے اور ان پر ٹوپیاں لگاتے دیکھا۔ مردانہ مکان کے تمام دالان ہمسایہ مسلمان مردوں سے بھر گئے۔ ان کی خواتین نے بھی حویلی میں پناہ لی۔ عورتوں کو ہدایت دی گئی کہ تلواروں، کٹاریوں، چھریوں، چاقوؤں اور لوہے کی سلاخوں وغیرہ سے خود کو مسلح کر لیں۔

انھیں یہ بھی بتایا گیا کہ بوقت ضرورت کس طرح حملہ آوروں کے خلاف ہتھیار استعمال کرنا ہے۔ پھر یہ بھی کہہ دیا گیا کہ حملہ آوروں سے اگر نوبت عزت و آبرو بچانے تک پہنچ جائے تو کنویں میں چھلانگ لگا دیں۔

یہ تدابیر اس لیے ضروری تھیں کہ ہندوؤں کا ایک بہت بڑا انبوہ نواحی علاقوں میں کشت و خون کا بازار گرم کر کے شہر آرہ کی طرف رخ کرنے والا تھا۔

حالات پر قابو پانے کے لیے کلکتہ شاہ آباد کو فوج طلب کرنا پڑی۔ سب سے پہلے گھڑسوار ملٹری پولیس کے دستے بھی حرکت میں آ گئے۔ آرہ میں مستقل طور پر ملٹری ملازم پولیس کا رسالہ قائم کر دیا گیا جن کے سواروں میں زیادہ تر پنجابی مسلمان تھے۔

حاجی اوگھٹ شاہ

شاہ آباد کی معروف بستی جگ دیش پور سے حضرت حاجی اوگھٹ شاہ جب آرہ تشریف لاتے تو بڑے ہال میں فرشی دریاں بچھا دی جاتیں۔ حضرت کے لیے ان پر خاص قالین بچھایا جاتا۔ یہ بزرگ میرے نانا مرحوم کے پیر بھائی تھے۔ اوگھٹ شاہ کا لقب انھیں پیر دیوا شریف حضرت حاجی وارث علی شاہ نے دیا تھا۔

ان کا پہناوا ایک تہبند اور کھڑاؤں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ فرش پر بیٹھتے اور سوتے۔ کیونکہ ان کا شمار خاصانِ حضور میں تھا۔ جب کبھی آرہ چوک بازار کی طرف نکلتے تو سب لوگ جمع ہو جاتے۔ ان کی باتیں، لطائف اور مثنوی مولانا روم سنتے۔

حاجی اوگھٹ شاہ نے اپنے سفرِ حج کا ایک واقعہ سنایا۔ جب وہ حج بیت اللہ سے واپس آ رہے تھے اور بمبئی پہنچنے کے قریب تھے تو جہاز میں بڑا سوراخ ہو گیا۔ سمندر کا پانی زور شور سے اندر آنے لگا۔ کپتان نے اپنا سرخ لبادہ پہنا اور مسافروں کو خطرے سے آگاہ کیا۔ جب وہ شاہ صاحب کے پاس آیا تو وہ ایک مسافر کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے۔ کپتان بہت خفا ہوا اور کہا "یہاں جہاز غرق ہو رہا ہے اور تم چوسر کھیلتے ہو۔" اس پر اوگھٹ شاہ نے جواب دیا "جہاز غرق نہ ہو گا کیونکہ میرے پیر نے کہا ہے۔ حج سے واپسی پر سے ملو۔" چناں چہ یہی ہوا۔ تمام مسافروں کی کوششوں سے سوراخ بند ہو گیا اور سفر جاری رہا۔

انگریزی شاعری کا مقابلہ

پٹنہ کالج میں پروفیسر انگریزی پڑھایا کرتے تھے، مشہور ہندی کے معروف ادیب تھے۔ ایک بار انھوں نے ہم طلبہ سے کہا کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر تم لوگ "Childhood days" (بچپن کے دنوں) پر ایک نظم لکھو اور دیکھیں پہلے کون لکھتا ہے۔ میں نے دس منٹ کے اندر یہ نظم لکھی: (اس وقت میری عمر 19 سال تھی)

"جب میں تن پر مغرور لیے پھرتا تھا
میری دھرتی میں کیا کیا نہ خوشیوں کے خزانے
تھے
جب باغ میں گھڑسواری کے دوران پھولوں کو

کھلتے اور مرجھاتے دیکھتا

جب میں میرے قصرِ سبزہ زار پر اچھلا کرتا
کبھی دھوپ میں، کبھی چھاؤں میں
مگر اس وقت خواب و خیال میں بھی نہ آیا کہ وقت یوں گزر جائے گا

اب جب کہ میں سن رسیدہ ہو چکا
دعا کرتا ہوں کہ جنت میں بھی مجھے بچپن کے ہی دن میسر آ جائیں۔

مسلم لیگ کے خلاف سازش

جب میں آئی سی ایس کی تربیت کے مرحلے سے گزر چکا، تو مجھے 1941ء میں شمالی بنگال میں ضلع سراج گنج کے سب ڈویژن اور ساتھ ہی سراج گنج شہر کی میونسپلٹی کا چارج دے دیا گیا۔

سراج گنج میں اس وقت دو معروف شخصیات، عبداللہ محمود اور دوسری عبدالرشید محمود بستی تھیں۔ ان میں ایک ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین اور دوسرے سراج گنج میونسپلٹی کے چیئرمین تھے۔ جناب عبداللہ محمود کلکتہ میں ڈپٹی ہائی کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ دونوں مسلمان راہنما مسلم لیگ کے دلدادہ اور قائداعظم کے پرستار تھے۔ انھوں نے اپنی انتھک جدوجہد سے سراج گنج کو مسلم لیگ کا گہوارہ بنا دیا۔ 1941ء میں شمالی بنگال کا تاریخی اجلاس انھی کی کاوشوں سے منعقد ہوا جس میں قائداعظم اور مس فاطمہ جناح مدعو تھے۔ جلسے کے انعقاد کا جب فیصلہ ہوا تو وہاں کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان میں بے انتہا جوش و خروش پایا گیا اور بڑے زور شور سے انھوں نے جلسے کی تیاریوں میں حصہ لیا۔

ایک طرف جلسہ عام کی فقید المثال تیاری اپنے عروج پر تھی، دوسری طرف وزیراعلیٰ بنگال فضل الحق جلسہ گاہ کو نذرِ آتش کرنے کا منصوبہ تیار کرنے لگے۔ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ معزز مہمانوں کے سراج گنج پہنچنے سے صرف چوبیس گھنٹے قبل وزیراعلیٰ فضل الحق مع بدنامِ زمانہ شخصیت شمس الدین احمد سرکاری دورے پر آ نکلے۔ وہ اپنے ساتھ ریل کے دو ڈبے بھر کر کلکتہ کے مشہور بدمعاشوں اور دہشت گردوں کو لائے تھے تاکہ منصوبے کے مطابق قائداعظم کا پنڈال نذرِ آتش کر سکیں۔ یوں دونوں معروف شخصیات کی بدنامی ہوتی اور مسلم لیگ کی مقبولیت کو بھی شدید ٹھیس پہنچتی۔

وزیراعلیٰ فضل الحق کی جانب سے دستخطوں کے ساتھ ضلع کے کلکٹر مسٹر کریک (Creak) اور ایس پی پولیس مسٹر ٹک کو حکم نامہ جاری کیا گیا تھا کہ مجوزہ کانفرنس سے ایک روز قبل شہر کے تمام تھانوں سے مسلح سپاہیوں کو مختلف علاقوں میں بھیج دیا جائے۔ تمام پولیس چوکیاں خالی رہیں اور یہ کہ شہر میں کسی بھی ہنگامے اور فتنے کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے اور نہ ہی آتش زدگی روکی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ انتظامیہ سیاسی معاملات میں اثر انداز نہ ہو سکے۔ چنانچہ وزیراعلیٰ کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے کلکٹر اور ایس پی دونوں روپوش ہو گئے۔

میں نے استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے ریلوے اسٹیشن پر وزیراعلیٰ کا استقبال کیا۔ پھر ایس ڈی او کے بنگلے پر جہاں ان کے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام تھا، انھیں ساتھ لیے پہنچ گیا۔ اعلیٰ قسم کی جھینگا مچھلی خصوصی طور پر پکائی گئی تھی۔ وزیراعلیٰ نے اس ڈش پر ایسا ہلا بولا اور بے قراری و ندیدے پن کا ایسا عملی مظاہرہ کیا کہ تہذیب و تمدن کی قدروں کو بھی شرم محسوس ہونے لگی۔ طعام سے فارغ ہو کر چیف منسٹر نے میرا

ہاتھ پکڑا اور بہت بہت شکریہ کہتے ہوئے فرمایا ''ہم لوگوں نے آپ کو بڑی تکلیف دی، یکا یک دورے کا پروگرام بنانا پڑا تاکہ میں اپنی پارٹی کے کارکنوں سے ضروری صلاح و مشورہ کر سکوں۔ اب آپ چند گھنٹے آرام فرمائیں، ان شاء اللہ شام کو چائے پر آپ سے ملاقات ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رخصت ہو گئے۔

اُدھر کارکنان مسلم لیگ سخت پریشان تھے کہ اس آفت سے نجات کیوں کر حاصل ہو؟ جلسہ ہونے میں صرف ایک شب باقی رہ گئی تھی اور کام بھی بہت تھا۔ مجھے پہلے ہی فضل الحق کے ارادوں سے آگاہی حاصل تھی۔ پنڈال و جلسہ درہم برہم کرنے کے پروگرام سے بھی انتظامیہ کا اعلیٰ عملہ آگاہ ہونے کے ناتے واقف تھا۔ لہٰذا اپنے منصوبے کے مطابق مسلم نیشنل گارڈز کے پانچ سو کارکنوں کو تیار کر کے یہ ہدایت دی کہ باہر سے لائے غنڈوں کا سختی سے محاصرہ کر لیں اور ان کی نقل و حرکت پر حاوی رہیں تاکہ رات میں کوئی بھی نہ تو شہر میں نکلے اور نہ پنڈال کی جانب بڑھ سکے۔

اب غنڈوں نے اپنے آپ کو سخت مشکل میں پایا۔ پولیس کو بھی غائب دیکھا تو پسپائی اختیار کرنے کے انداز میں مسلم لیگ گارڈ کمانڈر کو تجویز پیش کی کہ وہ لوگ کلکتہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ چناں چہ تجویز منظور کرتے ہوئے انھیں اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ ان کی روانگی تک گارڈز کا دستہ وہاں متعین رہا۔

میری اس خفیہ کارروائی کی بھنک تک کسی سرکاری افسر، پولیس اہلکار اور مخالف سیاسی کارکنوں تک پہنچنا محال تھی۔ سہ پہر چار بجے چائے پارٹی کے لیے میونسپل آفس کے میدان میں وزیراعلیٰ اور مسٹر شمس الدین پہنچے تو کلکٹر کریک اور ایس پی مسٹر تنگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں دیکھتا رہا کہ مسٹر شمس الدین ان سے یہ معلوم کرنے کو کیسے بے قرار تھے کہ جلسہ روکنے کے سلسلے میں انتظامیہ نے کیا انتظامات کیے ہیں۔

مسٹر شمس الدین نہایت متکبرانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کریک، تنگ، کریک، تنگ کی آوازیں بلند کر رہے تھے، جیسے انھیں تلاش کر رہے ہوں۔ جوں ہی یہ دونوں افسر اُن کے قریب پہنچے تو دریافت کیا ''آپ لوگوں نے کیا انتظام کیا؟'' دونوں نے جواباً صرف یہ عرض کیا'' جیسا وزیراعلیٰ نے حکم دیا تھا۔'' تسلی جواب پا کر مسکرائے اور فاتحانہ انداز سے چیف منسٹر کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر مسلم لیگ کے گارڈز نے وزیراعلیٰ کو سلامی دی جس سے مسٹر شمس الدین بھی کافی محظوظ نظر آئے۔

اسی اثنا میں شمس الدین کی نظر ریل کے ان دو ڈبوں پر پڑی جن کی کھڑکیوں سے کلکتہ سے لائے گئے غنڈے گارڈز کے سماں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اب حضرت سکتے میں آ گئے اور فوراً ہی اپنے ڈبے میں گھس گئے۔ یوں چیف منسٹر کی سرکار اپنے غنڈوں کو لے کر آئے تھے اسی طرح نامراد واپس لے گئے۔ قارئین یہ تھا وہ شخص جو ہر لمحے ہندوستانی مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے درپے رہتا۔ اگر بروقت یہ تمام اطلاعات مجھے نہ ملتیں تو یقیناً بڑا ہنگامہ جنم لیتا۔ اللہ نے چیف منسٹر کا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا اور مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجلاس اس دوست نما دشمن کے شر سے محفوظ رہا۔

قحط، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کا زمانہ

1946ء میں پورا بنگال بری طرح قحط کی زد میں آ گیا۔ کئی بڑے اور اہم شہروں میں راشن نظام رائج کر

دیا گیا۔ ڈھاکہ میں بالخصوص بری حالت تھی۔ ایک دن ڈھاکہ کے کلکٹر جے ایل لیولین (J.L. Lewlyn) نے بڑی پریشانی میں مجھے فون پر بتایا کہ کل ڈھاکہ شہر کی تمام راشن دکانوں میں چاول کا ایک دانہ دستیاب ہو گا اور نہ ہی چلو بھر سرسوں کا تیل ملے گا۔ انھوں نے اس سلسلے میں مجھ سے مدد مانگی۔ یاد رہے کہ ڈھاکہ ہی نہیں نرائن گنج، منشی گنج وغیرہ میں بھی یہی حالت تھی۔

میں نے انھیں فون پر جواب دیا کہ میں اسی تدارک میں لگا ہوا ہوں جس سے کم از کم تین ماہ تک چاول اور سرسوں کے تیل کی فراہمی برقرار رہے۔ یہ سن کر وہ اچھل پڑے اور کہنے لگے کہ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر ایسا کیجیے کہ کل صبح تک دس ہزار من چاول ڈھاکہ پہنچا دیں اور ایک ہزار ڈبے سرسوں کے تیل سے بھرے۔ میں نے کہا کہ ایسا ہی کیا جائے گا۔

میں نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت پانچ سو سرکاری ملازمین کو خصوصی کانسٹیبل مقرر کر دیا۔ پھر مجسٹریٹ، پولیس اور ان خصوصی کانسٹیبلوں کے ہمراہ بیک وقت بڑے بڑے گوداموں پر چھاپے مارنا شروع کیے۔ ہم نے لاکھوں بوریاں چاول اور ہزاروں ڈبے تیل سرکاری تحویل میں لے لیے۔ پھر ان کی ضبطی کے احکام جاری کیے جس کے خلاف کسی بھی عدالت میں چارہ جوئی ممکن نہ تھی۔ میری اس کارروائی کا مقصد دراصل ان لوگوں کو سبق سکھانا تھا جو چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی جیسے جرائم میں ملوث تھے۔ میں نے الحمدللہ بڑی آسانی سے یہ کام کر دکھایا۔

اس کے بعد چھوٹے بڑے جہازوں پر مشتمل ایک بیڑہ تیار کر کے اسے سرخ روشنی کی جگمگ میں رات ختم ہونے سے پہلے ڈھاکہ پہنچا دیا۔ پھر خود بھی پہنچا اور چاول، تیل اور دوسری ضروری اشیا ایس ڈی ایم کے حوالے کیں۔ وہ دنگ رہ گئے کہ یہ کارنامہ کیسے انجام پایا۔

میری اس کارروائی کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں سراہا گیا۔ سارے اخبارات نے یک زبان ہو کر مجھے کھلے الفاظ میں داد دی۔ یہ بھی کہا گیا کہ کاش رحمت اللہ تمام مجرمان کو سرسوں کے گرم تیل میں ڈبو دیتے۔ مجھے وہ واحد سرکاری افسر تسلیم کیا گیا جس نے مسٹر سہروردی کے اس دعوے کو ثابت کر دکھایا کہ بنگال میں اناج اور تیل وغیرہ زیر زمین چھپا دیے گئے ہیں۔

مسلمانوں کی زبوں حالی

نرائن گنج کے مسلمانوں کی بدحالی سے میں بہت پریشان تھا۔ وہاں ایک طرف ہندو ساہوکار، پٹ سن کے تاجر اور ملوں، کمپنیوں کے بڑے بڑے ہندو مالکان تھے جو ہر طرح کے آرام و آسائش سے مالا مال تھے۔ دوسری طرف نہایت غریب مسلمان نہایت درجے کی غربت و افلاس اور ذلت کا شکار تھے۔ وہ بالکل غلاموں کی سی زندگی گزار رہے تھے اور ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ بدقسمتی سے وہاں کے حکام سو فیصد ہندو نواز تھے۔ انھیں مسلمانوں کے مفادات سے ذرہ برابر سروکار نہ تھا۔

مسلمانوں کے یہ خراب حالات میرے لیے ناقابل برداشت تھے۔ میں ان کی ترقی اور خوشحالی کی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان کے لیے نرائن گنج گھاٹ کے بالمقابل ایک انسٹی ٹیوٹ بنانے میں کامیاب ہو گیا جو بعد میں رحمت اللہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے نام سے مشہور ہوا۔

اس ادارے کی بدولت ڈھاکہ شہر کے مسلمانوں

نے نہ صرف متحد ہو کر اپنے مسائل حل کیے بلکہ یہ بہت جلد ڈھاکہ شہر میں مسلم لیگ کی تمام سرگرمیوں کا عظیم الشان گہوارہ بن گیا۔ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے دفتر کے لیے تو کرائے پر بھی چھوٹا سا کمرا فراہم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس حالت میں رحمت اللہ مسلم انسٹی ٹیوٹ نے قائداعظم کی قائم کردہ مسلم لیگ کی بقا و ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔

متعصب انگریز ایس پی

مرشد آباد کے ایس پی لیوس ایک سن رسیدہ انگریز تھے جس وقت میں نے کلکٹری کی حیثیت سے مرشد آباد کا چارج لیا اسی وقت وہ مرشد آباد کے پہلے ایس پی کے طور پر وہاں تعینات تھے۔ انگریز ہونے کا خمار اور رعونت اتنی غالب تھی کہ مجھ سے کبھی نہ ملنے آتے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میری عمر تیس سال تھی اور ان کی پچاس سال۔ ساتھ ہی میں دیسی تھا اور مسلمان بھی۔ وہ اس بات سے بے حد خار کھاتے کہ میں آئی سی ایس جیسی فردوس میں جنم لینے والی ملازمت کا رکن ہوں اور وہ انڈین پولیس کے پولیس میں۔

ان دنوں آئی سی ایس اور پولیس والوں کی رقابت عام تھی۔ خصوصاً انگریز پولیس والے تو دیسی آئی سی ایس والوں کے ساتھ بڑی رعونت سے پیش آتے۔ گوری چمڑی کے سبب پولیس کا ایک کم عمر اور کم تعلیم یافتہ ملازم اپنے آپ کو آئی سی ایس افسران کے برابر دکھانے کی کوشش کرتا۔ مسلمان کلکٹر کیا، انگریز کلکٹر بھی ایس پی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

لیوس صاحب اگرچہ فرعون بے سامان تھے، مگر وہاں کے عیار و چالاک تھانے دار اور داروغہ انھیں مکمل طور پر اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ خاص وجہ یہ کہ ایس پی کو بنگلہ زبان بالکل نہیں آتی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی جو بول لیتے وہ بھی بے سود ثابت ہوتی۔ اس کے برعکس بنگالی ہندو پولیس والے جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے تھے، وہ ایس پی کو سمجھانے اور اس سے من مانے حکم نامے حاصل کرنے کے لیے کافی ہوتی۔

مسلمانانِ لال گولہ پر کیا گزری!

ایک بار لال گولہ تھانے کی متعصب ہندو پولیس نے علاقے کے شریف، معصوم و معمر مسلمانوں کے خلاف چال چلی۔ تھانے دار نے لیوس کے دستخط سے ایک سو سے زیادہ معتبر مسلمان شہری "ڈیفنس آف انڈیا رولز" کے تحت جبریہ اسپیشل کانسٹیبل مقرر کر دیے۔ ظاہر ہے اس میں کسی داد و فریاد کی گنجائش کہاں باقی تھی۔ ان لوگوں کو یہ ڈیوٹی سپرد کی گئی کہ ہر روز انھیں سرحد پر بیس میل پیدل چلنا پڑتا جہاں بالکل ضرورت نہ تھی۔ یہ یک طرفہ ظلم تھا اور اس کام پر ایک بھی ہندو متعین نہیں ہوا۔

جب میں مہاراجا لال گولہ کا مہمان بن کر ان کے محل میں ٹھہرا تو مجھے اس ظلم کا پتا چلا۔ مہاراجا ضعیف العمر اور ایک مدت سے [illegible] تھے۔ محل چھوڑ کر قریب ہی دو کمروں پر مشتمل ایک کٹیا میں رہتے۔ ان کے صاحب زادے ڈی این رائے میرے دوستوں میں سے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت کلکتہ میں بسر ہوتا۔ ادبی مشاغل سے خاص شغف تھا۔

ایک بار جب میں ڈی این رائے کے ساتھ دریائے گنگ کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر جبری بھرتی کیے جانے والے مظلوم مسلمان اسپیشل کانسٹیبلوں کے ایک گروہ نے مجھ سے ملاقات کی۔ انھوں نے جبری بھرتی کے علاوہ مسلمانوں پر روا رکھے گئے مظالم کی داستانیں بھی سنائیں۔ میرا

دل بھر آیا اور مجھے ایس پی کے معاندانہ اور بے ہودہ رویے پر بہت غصہ آیا۔ ظلم اور گوری چمڑی کے غرور کی بھی انتہا ہونی چاہیے۔

احکامات کی منسوخی

برہم پور واپس پہنچتے ہی میں نے ایس پی لیوس کے احکامات اور ساتھ ہی ڈیفنس آف انڈیا رولز کا بغور مطالعہ کیا۔ قانون کے تحت ایس پی کو ہنگامی حالات جنگ کے دوران جبری طور پر اسپیشل کانسٹیبل بھرتی کرنے کے اختیارات حاصل تھے۔ مگر یہ صاف الفاظ میں واضح کر دیا گیا کہ ایس پی ایسا کرنے کا اسی وقت مجاز ہے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے رابطہ منقطع ہو جائے اور حکم نامہ اس کے دستخط سے جاری نہ کرایا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اختیارات سو فیصد ڈی ایم کے پاس تھے نہ کہ ایس پی کے۔

مزید برآں اس وقت نہ تو ہنگامی حالات تھے نہ ہی جنگ۔ ایس پی لیوس ہی مجھ سے دور۔ انھوں نے شاید یہ اپنی شان کے خلاف تصور کیا کہ پولیس انتظامیہ کے سلسلے میں مجھ سے کوئی حکم نامہ حاصل کریں۔ دراصل تھانیدار کو یہ معلوم تھا کہ جبری بھرتی کی یہ تجویز مجھ تک پہنچی تو میں رد کر دوں گا، کیونکہ یہ بھرتی یکطرفہ تھی۔ مشقت کے اس کام کے لیے صرف شریف مسلمانوں ہی کو منتخب کیا گیا تھا۔ چناں چہ بالا ہی بالا ایس پی کے دستخط سے یہ حکم نامہ جاری کر دیا اور مجھے ہوا تک نہ لگنے دی۔

میں نے فوراً ایک خاص حکم نامہ جاری کیا جس کے ذریعے انگریز چیف سیکرٹری کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ مغرور ایس پی لیوس ڈی آئی جی ہونے والے تھے، میرے حکم نامہ پر بہت جھلائے۔ وہ اپنے حکم نامے کو کالعدم ہوتا کس طرح دیکھ سکتے تھے!

انھوں نے فوراً اپنے دوست، کمشنر مسٹر اے ایس ہینڈز (A.S. Hands) سے رجوع کیا۔ ڈی آئی جی بھی میدان میں آ گئے اور معاملہ چیف سیکرٹری کے سامنے پیش ہوا۔ وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کو بھی مطلع کیا گیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ جو کام لیوس نے کیا، وہ صریحاً غلط اور غیر قانونی تھا۔ اس لیے ڈی آئی جی اور کمشنر اے ایس ہینڈز برہم پور جا کر مجھ سے ملیں اور ایس پی کے ساتھ تعلقات کو پھر سے استوار کریں۔

چناں چہ فیصلے کے مطابق ڈی آئی جی اور کمشنر مسٹر اے ایس ہینڈز خفت زدہ سے ملاقات کرنے آئے۔ مگر لیوس کی رعونت دیکھیے کہ وہ ہتم کر پھر بھی نہ آیا۔ تاہم دیکھا گیا کہ چند ماہ کے اندر اندر لیوس نظروں سے غائب ہو گیا۔

مشرقی پاکستان میں بدعنوانیوں کا آغاز

قیام پاکستان کے ایک دو سال کے بعد بدعنوانی اور بدانتظامی کی لعنت صوبائی حکومت کے وزرا میں بھی در آنے لگی۔ بیشتر حضرات تو اس مرض میں مبتلا تھے ہی، اب وزرا بھی ان میں شامل ہو گئے۔ خواجہ ناظم الدین کابینہ کے ایک اہم ترین وزیر حمید الحق چودھری دولت تیار کرنے اور راتوں رات امیر ہونے کی خواہش میں اپنے وسیع اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ انھوں نے مال خانے سے پانچ ہزار روپے مالیت کی بہترین رائفل پچاس روپے میں خریدنے کے لیے میری تائید طلب کی۔ میری تائید کے بغیر بندوق خریدنا ممکن نہ تھا۔ ادھر اس رائفل پر ایس پی کی نظر بھی جمی تھی۔ چناں چہ بات بڑھی اور بہت سی درپردہ باتیں سطح پر آ گئیں۔

یہ ثبوت پا کر میں نے وزیر صاحب کے خلاف

پرودا مقدمہ چلانے کی سرکاری منظوری لے لی۔ چیف سیکرٹری عزیز احمد میرے سدا کے مخالف تھے لہٰذا میرے اس اقدام سے وہ خوش نہ ہوئے۔ ناخوشی کی دوسری وجہ اس وزیر باتدبیر سے چیف سیکرٹری کا یارانہ تھا۔ چودھری حمید الحق اپنی قابلیت کی وجہ سے کافی رعب رکھتے تھے۔ نامی گرامی وکیل تھے۔ مرکزی حکومت میں بھی ان کی اچھی بنی ہوئی تھی۔ میں نے ان باتوں کی پروا کیے بغیر ذاتی شہادت کی بنا پر ان کے خلاف کافی مواد جمع کر لیا جس کی وجہ سے پرودا کے تحت ان پر مقدمہ چل سکتا تھا۔

حکومت پاکستان نے پرودا کے مقدمات کی جانچ پڑتال اور سماعت کے لیے دو ٹریبونل قائم کیے۔ ایک کراچی میں جو ڈھاکہ ہائیکورٹ کے جسٹس شہاب الدین پر مشتمل تھا۔ دوسرا ڈھاکہ میں جس کے جج ڈھاکہ ہائیکورٹ کے جسٹس ایلس (Ellis I.C.S) نامزد ہوئے۔ کراچی میں ایوب کھوڑو اور ڈھاکہ میں حمید الحق کا ٹرائل ہوا۔ حمید الحق چودھری والے مقدمے کی سماعت کے وقت میں ڈی سی سلہٹ تھا۔ مجھے شہادت کے لیے بذریعہ سمن طلب کیا گیا۔ حمید الحق کی جانب سے مولوی فضل الحق وکیل مقرر ہوئے۔ وہ خود بھی کورٹ میں موجود تھے۔ مجھ پر جرح کے دوران انھوں نے یہ الزام لگایا کہ میں نے مہاجروں کے لیے ڈھاکہ کا سرکاری خزانہ کھول رکھا تھا۔ اور ان کی آبادکاری اور امداد پر اپنی مرضی سے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔

میں نے بتایا کہ ہنگامی حالات میں بحیثیت ڈی سی ڈھاکہ مجھ پر فرض عائد ہوتا تھا کہ میں انھیں فاقہ کشی اور سڑکوں پر دم توڑنے سے بچاتا۔ اس لیے جو اخراجات کیے، وہ ٹریژری رول 27 کے تحت انجام پائے۔ بعد میں اس کی منظوری محکمہ ریلیف سے حاصل کر لی جس کے وزیر جناب شفیق الدین احمد اور جوائنٹ سیکرٹری انچارج میزان الرحمٰن تھے۔ اس پر فضل الحق چراغ پا ہوئے اور چیخ پڑے۔

''کون سا محکمہ ریلیف؟ مائی لارڈ کوئی محکمہ ریلیف وجود نہیں رکھتا۔''

فضل الحق کا تیز لہجہ سن کر جسٹس ایلس بھی طیش میں آ گئے۔ آواز بلند بولے ''گواہ کو گمراہ کرنے کی کوشش مت کریں۔ گواہ نے ابھی کہا ہے کہ مشرقی بنگال میں ریلیف ڈیپارٹمنٹ موجود تھا۔ انھوں نے محکمہ کے وزیر اور سیکرٹری کے نام بھی بتا دیے۔ ایسا نہ کیجیے، یہ بُری بات ہے۔''

فضل الحق فوراً کھڑے ہوئے اور کہا ''جو کچھ گواہ کہتا ہے، اگر اس پر کورٹ یقین کر لیتی ہے تو پھر میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اس مقدمے سے خود کو الگ کرتا ہوں، میرے موکل ایڈووکیٹ ہیں، وہ خود جرح جاری رکھیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ عدالت سے باہر چلے گئے۔

حمید الحق چودھری نے سرسری انداز میں مجھ سے چند معمولی سوالات کیے اور بیٹھ گئے۔ انھیں بچانے کے لیے مجھ سے پہلے چیف سیکرٹری نے بھی ان کی حمایت میں شہادت دی تھی لیکن جرح میں وہ بُری طرح ٹوٹ گئے۔ آخر میں میری فتح ہوئی یعنی سابق وزیر خزانہ حمید الحق کو سزا ہوئی۔ وہ کئی سال کے لیے انتخابات میں حصہ لینے کے نااہل قرار دیے گئے۔ چیف سیکرٹری کے خلاف بھی جسٹس ایلس نے اپنے فیصلے میں چند جملے لکھے کہ انھوں نے ملزم وزیر کے جرائم کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی۔ مگر کون تھا جو چیف سیکرٹری پر انگلیاں اٹھاتا! نیرنگیِ سیاست کے طفیل وہی ملزم آگے

چل کر حکومت پاکستان کا وزیر خارجہ بن بیٹھا۔

گورنر جنرل غلام محمد کا دورہ

ضلع سلہٹ کا چارج لینے کے کچھ دنوں بعد گورنر جنرل پاکستان جناب غلام محمد تشریف لائے۔ مرکزی وزیر جناب پیرزادہ عبدالستار بھی ساتھ تھے۔ ان کے قیام کے لیے سرکٹ ہاؤس کو ہر طرح آراستہ کیا گیا۔ ہوائی اڈے پر استقبال کے بعد میں ان کے ساتھ پولیس جیپ میں سرکٹ ہاؤس آیا۔ ملاقاتوں کا پروگرام شروع ہوا۔ سرفہرست میرا نام تھا۔ سرکٹ ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے تپاک سے مصافحہ کر کے میرا خاندانی پس منظر دریافت کیا۔ میں نے بتایا کہ حاجی سید زین العابدین وارثی کا نواسا ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے مجھے گلے لگایا۔ کلام اللہ کی آیات پڑھ کر پھونکیں ماریں اور دعائیں دیں۔ پھر کہنے لگے "آپ زین العابدین بھائی کے نواسے ہیں تو میرے بھی ہوئے۔ انھوں نے دیوا شریف کے لیے بے مثال خدمات انجام دیں۔"

بعد ازاں غلام محمد نے میز پر کھانا شروع کرنے سے پہلے میرا سب سے تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ میں ان کے عزیز ترین پیر بھائی سید زین الدین وارثی کا نواسا ہوں۔ پھر دوران لنچ انھوں نے کہا کہ برخوردار آپ تصویریں خوب بناتے ہیں۔ میری ایک فرمائش پوری کریں اور غالب کے اس شعر کا تصویری مرقع تیار کر دیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ کہہ کر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے جواب دیا "ضرور ضرور بہت جلد پورا کر کے بھیجوں گا۔" تو مجھے شاباش دی اور زندہ باد کہا۔

گورنر جنرل غلام محمد نے صبح سویرے ایک انوکھی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ ایک ایسے شخص سے ملنا چاہتے تھے جو ان دنوں سلہٹ کے سرحدی علاقے میں کسٹم انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ گورنر جنرل اسے اس زمانے سے جانتے تھے جب وہ حیدرآباد دکن میں مقیم تھے۔ میں نے کسٹم انسپکٹر کو تلاش کرایا اور ان کے سامنے پیش کر دیا۔ گورنر جنرل اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ غریب اور معمولی ملازم کا اس درجہ خیال رکھنا ان کے خوف خدا کی دلیل تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بزرگان دین کا احترام، پرانی تہذیب کا لحاظ، غریبوں کی امداد، چھوٹوں سے پیار اور محبت گورنر جنرل کی ایسی صفات تھیں جو ایک سچے صوفی مزاج شخص ہی میں پائی جاتی ہیں۔

جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنے شہاب نامہ میں غلام محمد کے متعلق غلط بیانی سے کام لیا جو بہرحال [illegible] ہے۔ میں نے جو انھیں دیکھا تو یہ پایا کہ مرد مسلمان کی بہت سی خوبیوں سے وہ متصف تھے۔ ان کی [illegible] قاعد جلیل اور [illegible]

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اگر بقول قدرت اللہ شہاب وہ بحیثیت گورنر جنرل بری طرح ناکام رہے تو ایسا ان میں کسی خاص نقص کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ انھیں نااہل اور بدعنوان حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی پڑی۔ افسر شاہی اور حکمرانوں کی بدعنوانی نے اسے اس درجے تباہ کر دیا تھا کہ صورت حال کو درست کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ غلام محمد کے ساتھ افسر شاہی نے تعاون کیا، لیکن یہ بات بھی مسلم ہے کہ وہ عہدہ گورنر جنرل کے لائق نہیں تھے۔ ♦♦♦

جاتے ہیں۔"

آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا مگر پتلیاں ایسی گدلی گدلی سی تھیں جیسے برسوں کی دھول بیٹ رکھی ہو۔ ناک بلدی کی گانٹھ معلوم ہوتی اور ہونٹ چہرے سے کچھ زیادہ ہی سیاہ تھے۔ گردن کی ایک ایک رگ کچھ یوں غیر معمولی طور سے ابھری اور تنی ہوئی تھی جیسے اس کے دماغ اور دل میں رسہ کشی ہو رہی ہو۔ کرتے میں نیل رچ گیا تھا اور تہبند پر جا بجا شوربے کے دھبے تھے۔ لالہ تیج بھان نے جب اس کا نام بتایا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے کالے حاشیوں والے لمبے لمبے دانت یوں نمایاں ہو گئے جیسے کسی نے کپاٹ بڑا چیر ڈالا ہے۔ مگر مجھے دانتوں کے آس پاس مسوڑے کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ بعد میں بتایا گیا کہ بس سے کھانے چیں تو پہلے منہ سے کبھی پی جا سکتی ہے۔ سیپیے کے دانتوں پر چاندی کا ایک ایک تار لپٹا ہوا تھا۔ دانتوں کی ریخوں میں دنوں کا کوڑا اٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

لالہ جی اس کا نام بتا چکے تو ایک سکھ اندر آیا۔ لالہ تیج بھان کو جھک کر سلام کیا اور مجھ پر ایک اچٹتی سی سرپرستانہ نظر سے دیکھ کر خادو کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

لالہ جی بولے "یہ خادو ملتان میں پہلا نمبر مخبر ہے۔ پہلا نمبر مخبر تو یہ دلاسہ سنگھ بھی ہے پر بات یہ ہے کہ مجھے اس ضلع میں آئے ڈھائی برس بیت چکے۔ ڈھائی برس میں تیس مہینے ہوتے ہیں۔ خادو نے تیس مخبریاں کی ہیں اور تیس کی تیس سچی اور تیسوں اتنے بڑے مقدمے کہ ڈی سی نے چند مقدموں پر تو مجھے "ویل ڈن" دیا اور ایک مقدمے پر پانچ سو روپے انعام کی سفارش کر دی۔ خادو نے بھی ان مخبریوں میں کوئی ہزار روپیہ تو کمایا ہو گا۔"

خادو پہلی بار بولا "اللہ نگہبان ہو۔ جھوٹ کیوں بولوں۔ آپ کے دربار سے میں نے تو گیارہ سو چھڑا پائے۔ بچے دعائیں دیتے ہیں۔"

لالہ تیج بھان بولے "اب یہ خادو کا جادو نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی کوئی بھی مخبری غلط نہ نکلی۔ ایک آدھ بار تو کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔ اس دلاسہ سنگھ کو لیجیے۔ شراب کی بھٹیوں کا مخبر ہے۔ آٹھ بھٹیاں پکڑوا چکا مگر جب نویں کی باری آئی تو کیوں دلاسے یاد ہے؟ ہم کھیتوں میں پہنچے تو جہاں اس نے بھٹی کی نشاندہی کی تھی وہاں راکھ اڑ رہی تھی۔ ہم نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو دلاسے کی مخبری کے مطابق بھٹی چلانے والا کاہن سنگھ کھیت کی مینڈھ پر کھڑا تھا۔ بولا "تھانیدار جی۔ کھٹیا اٹھا لاؤں۔ بیٹھو گے جی ہو۔"

"جب میں نے سپاہیوں کے سامنے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ڈپٹ کر کہا کہ یہاں خاک کی جگہ راکھ کیوں اڑ رہی ہے تو وہ بولا وہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں دروغہ جی۔ جہاں دو تین مہینے شراب کی بھٹیاں چلتی رہی ہوں وہاں تو خاک کی جگہ راکھ ہی اڑے گی۔ بات کا ڈھب بتا رہا تھا کہ ابھی بھٹی چلنے کے بعد اسے بھی مخبری ہو گئی تھی۔ سو بڑے سے بڑے مخبر پر بھی ایسا وقت آ ہی جاتا ہے۔ پر یہ خادو۔ توبہ! ایک بار آیا۔ بولا بیس سیر افیون کا مقدمہ ہے۔ میں نے کہا بھنگ پی کر تو نہیں آئے۔ بولا قسم ہے محکمہ آبکاری کی پوری بیس سیر افیون ہے۔ اب آپ سوچیے کہ بیس سیر افیون میں سولہ سو تولے افیون ہوتی ہے اور ہم نے ایک ایک چھٹانک افیون کے مقدموں میں آدھے آدھے صفحے کی شاباشیاں لی ہیں۔ میں یونہی دل لگی کے لیے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسٹیشن پر پہنچا۔ گاڑی آئی۔ سیکنڈ کلاس

کے ایک ڈبے میں ایک موٹا بولڈ مسافر بیٹھا تھا۔

''خادو نے کہا' یہی ہے۔ سپاہیوں نے فوراً مسافر کو گھیر لیا' سامان کی تلاشی ہوئی تو چار صندوقوں کے خفیہ پیندوں میں پانچ پانچ سیر افیون پڑی مہک رہی تھی۔ ضلع بھر میں دھوم مچ گئی۔ اخباروں میں خبریں چھپیں اور آبکاری کی نوکری کا مزا آ گیا۔ اسی مقدمے پر میرے لیے پانچ سو روپے کے انعام کی سفارش ہوئی۔ سو اس خادو کو بالکل سچا موتی سمجھئے۔ ایسے ایماندار مخبر ذرا کم ہی ملتے ہیں۔ کیوں خادو اس اللہ بخش چنڈو والے کا کیا بنا۔''

خادو بولا ''اللہ نگہبان ہے۔ وہ تو سائیں ابھی میں یاری ہی لگا رہا ہوں۔ چار بار سال سال کی قید بھگتی ہے تو اب بڑا کائیاں ہو گیا ہے۔ جانتے چنڈو کی شیشی کہاں رکھتی ہے' ہوا ہی نہیں دیتا۔ ایک بار اسے میرے ہاتھ میں شیشی دینے کا اعتبار آ جائے۔ پھر دیکھیے کیسے شکرے کی طرح جھپٹتا ہوں۔ کل کہہ رہا تھا' مجھے ان آس پاس کی قبروں والوں کی قسم۔ تو مجھے بڑا کھٹا لگتا ہے۔ میں نے کہا' چنڈو پیتا ہوں تو کیا کھٹا بھی نہ لگاؤں۔ بس دیا یہ بڈھے کا ایمان مجھ پر جم نہیں رہا۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ آخر کب تک' صبر کا پھل تو آخر خدا دیتا ہی ہے۔ ایک دن اڑ نکلے پر لا کے ایسا ماروں گا کہ دن کو تارے نظر آ جائیں گے۔ اللہ نگہبان ہے۔''

''اور یہ دلاسہ سنگھ ہے۔'' لالہ تیج بھان نے ادھیڑ عمر کے سکھ کی طرف اشارہ کیا۔

دلاسہ سنگھ نے میری طرف دیکھا ہی نہیں' انسپکٹر کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ اور پھر اچانک تڑپ کر خادو سے بولا ''اے اوپر کیوں چڑھا آ رہا ہے۔ ہٹ کر کھڑا ہو۔ لالہ جی کو بات کرنے دے۔''

مگر لالہ جی نے سوائے اس کے کوئی بات نہ کی ''اس کی تعریف تو میں کر ہی چکا ہوں۔ میرا خاص الخاص آدمی ہے۔''

دلاسہ سنگھ کے تیور بتا رہے تھے کہ اسے رُلا دیا گیا ہے۔ اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر داڑھی میں دو انگلیاں ڈالیں اور ٹھوڑی کو چھیر چھیر ملا۔ پھر مجھے سلام کیے بغیر لالہ تیج بھان کے پیچھے پیچھے ان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔

مجھے چند روز دفتر کی فضا' بڑے بڑے رجسٹروں اور منشیات کے مختلف وارداتوں سے مانوس ہونے میں لگے۔ ہفتے میں دور دراز کے بعض قصبات میں بھنگ اور افیون کے ٹھیکوں کا معائنہ بھی کر آیا۔ ایک روز ایک ٹھیکیدار کے ہمراہ تانگے میں دفتر جا رہا تھا کہ کوچوان سے کہا ''بھئی خدا کے لیے تانگا احتیاط سے چلانا۔ تم تو سگریٹ میں چرس پی رہے ہو۔''

کوچوان نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مسکرایا اور بولا ''پی تو رہا ہوں بابو' پر آج ہی سے تو نہیں' برسوں سے چرس چل رہی ہے اور تانگا بھی چل رہا ہے۔''

ٹھیکیدار نے پاگلوں کی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پھر کچھ اس قسم کی بے ہنگم آوازیں نکالیں جیسے مجھے کسی شعر پر داد دے رہا ہے۔ ''ہاہاہا۔ واہ مزا آ گیا۔'' وہ بولا ''کئی برس ہو گئے آبکاری والوں سے نمٹتے' پر بھگوان کی قسم ایسا داروغہ آج ہی دیکھا کہ نوکری شروع ہوئے مہینا بھی نہیں گزرا اور چرس کی بو پہچان لی۔ حد ہو گئی۔''

ٹھیکیدار کی داد و تحسین نے کچھ ایسا پھلایا کہ میں تانگے ہی میں بیٹھے بیٹھے انسپکٹر بن گیا۔ مگر جب دفتر میں آ کر پوچھے ہفتے کی ڈائری انسپکٹر کی خدمت میں

پیش کی تو وہ بولے "یہ آپ سیر و سیاحت ہی کرتے رہیں گے یا کبھی کوئی مقدمہ بھی پکڑیں گے؟"

"مخبری ہوئی تو پکڑ لوں گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اور اگر مخبری نہ ہوئی تو؟" لالہ گنج بھان نے پوچھا۔

"تو مجبوری ہے۔" میں نے اپنی طرف سے معقول جواب دیا۔

مگر لالہ گنج بھان کو غصہ آ گیا۔ "تو صاحب اس طرح تو گورنمنٹ بھی آپ کو نوکری سے جواب دینے پر مجبور ہو جائے گی۔"

"یعنی مخبری نہ بھی ہو جب بھی کہیں سے کوئی کیس پکڑ لاؤں؟"

"جی ہاں۔" لالہ بولے۔

"کمال ہے۔" مجھے صورت حال پر اتنی تعجب کا اظہار کرنا پڑا کیونکہ ڈپٹی کمشنر نے بھی میری ڈائری پر تبصرہ کرتے ہوئے مجھے میری سستی اور کاہلی کے سلسلے میں "وارننگ" دے ڈالی۔

لالہ گنج بھان نے نرمی سے کہا "یہ کوئی خاص بات نہیں۔ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مدتوں سے خادو میرے پاس نہیں آیا۔ جانے بیمار ہو گیا یا کہیں باہر چلا گیا۔ وہ آ جائے تو میں اسے آپ کے حوالے کر دوں کہ کوئی بھنگ وغیرہ ہی کا مقدمہ پکڑوا دے۔ میرے لیے تو صرف دلاسہ ہی کافی ہے۔ اپنے چپراسی کو شہر بھیجئے کہیں سے خادو کو ڈھونڈ لائے۔ کسی تکیے میں پڑا ہو گا۔ مرنے کا نہیں، چرسی لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔"

میں نے چپراسی کو حکم دیا کہ خادو کو ڈھونڈ کر لاؤ۔

جب شام کو گھر پہنچا تو خادو میرے ملازم کے پاس بیٹھا اپنی آنکھوں میں گھستی ہوئی مکھیاں اڑا رہا تھا۔ اس کے سر کی منڈی ہوئی مستطیل پر گرد جمی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فرشی سلام کیا اور پھر رونے لگا۔

میں اسے باہر برآمدے میں لے آیا اور کھاٹ پر بٹھا کر پوچھا "بیمار ہو گیا؟"

"آپ تو سائیں بھولے بادشاہوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔" وہ بولا "بیماری کو مجھ سے کیا لینا دینا۔ میں عجب مصیبت میں پھنس گیا ہوں سائیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ مجھ بچارے سے کون سا گناہ ہو گیا کہ جس تکیے پر جاؤں دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہوں۔ اللہ بخش چنڈو والے پر آدھے بیچے سے ہاتھ پھیر رہا تھا پر اس کے پاس پہنچا تو وہ بولا "جا جا حرامزدہ مخبر کہیں کا۔ چنڈو پینے آتا ہے۔ صورت تو دیکھو چنڈو پینے والے کی۔ چہرے پر بادشاہوں کا نشہ ہے۔ اور پھر میں کہتا تھا کہ تو [illegible] ہے تیری آنکھوں میں [illegible] ہے۔ آج کے بعد [illegible] تو اپنی قبر میں زندہ گڑوا دوں گا۔ قبر [illegible]۔"

"[illegible] سائیں میں تو [illegible] اشتہاری [illegible] گیا ہوں۔ جو دیکھتا ہے دھتکارتا ہے۔ بھنگ [illegible] میں نے آج تک نہیں پکڑوایا اس لیے کہ بچارے بوٹی پینے والے بے دو پیسے ہی کا تو سودا کرتے ہیں۔ پر میں نے تنگ آ کر کہا اللہ [illegible] یار بھنگ والے کو ڈھونڈوں۔ میں ادھر گیا۔ کونڈی میں گھوٹا چل رہا تھا، چلم چل رہا تھا۔ میں نے کہا وقت پر پہنچے۔ ابھی کوئی سر گھوٹنے والے تو فوراً آپ کے پاس پہنچوں اور بسم اللہ تو کراؤں۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا "آ آ بھئی خادو کیسے ہو۔ تم تو بڑے بڑے نشوں کی دنیا میں رہنے والے ہو۔ ہمارے یہاں تو تمہارا

مدتوں بعد آنا ہوتا ہے۔ لاؤ تمہاری ذرا سی خاطر کر دوں اور سائیں پتا ہے اس نے میری خاطر کیسے کی؟ اُلٹا اپنی ہی صورت کے دو کتے کھول لے اور مجھ پر ہشکار دیے۔ یہ پنڈلی کا زخم دیکھا ہے آپ نے؟"

اس کی پنڈلی ٹخنے سے لے کر گھٹنے تک بانس کی طرح برابر پھٹی گئی تھی۔ ایک جگہ کتے کے کاٹنے کا زخم تھا جس پر کھرنڈ آ رہا تھا۔

وہ پھر رونے لگا اور روتی آواز ہی میں بولا "سچ کہتا ہوں سائیں میرا کوئی دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ ورنہ میں تو ہمیشہ جس ٹھیکے میں گیا انھوں میں اختیار بنا لیا۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک ٹھیکے پر استاد کو پکڑا لیا اور دوسرے دن اسی ٹھیکے پر استاد کے ٹھیلے سے پیس خریدنے چلے گئے اور کسی نے شبہ بھی نہ کیا کہ ابھی سے نکل استاد کی بکری اٹھائی تھی۔ میں تو مارے شرم کے آپ کے پاس نہیں آیا۔ میں نے کہا ادھر لالہ جی مجھے اتنا بڑا بنا رہے ہیں اور ادھر مجھ پر کتے چھوڑ دیے گئے۔ اپنی حالت تو جب تھا کہ ادھر آپ آئے ادھر ایک مقدمہ دے کر آپ کی پہلی ڈائری ٹھاٹھ سے بھرواتا پر سائیں اللہ نگہبان ہو میری روزی پر کوئی ضرور لات مار رہا ہے۔ پتا چلے تو....." وہ گالی بک کر آنسو پونچھنے لگا۔

خاور کے آنسوؤں کا جادو مجھ پر نہ چل سکا۔ کیونکہ میرے لطیف احساسات پر تو ڈپٹی کمشنر کی "وارننگ" سوار تھی۔ میں نے اسے تسلی دے کر چلتا کیا اور سیدھا انسپکٹر کے ہاں جا نکلا۔ وہ اس وقت انگریزی شراب کے ٹھیکے دار کی بیٹی کی شادی میں شمولیت کے لیے جا رہے تھے۔ مجھے یوں بے وقت اپنے ہاں دیکھا تو ایک کونے میں لے جا کر بولے "کوئی مقدمہ ملا ہے؟"

"مقدمہ کہاں ملا ہے لالہ جی۔" میں نے کہا "خاور ملا ہے؟"

"خاور ملا ہے تو سمجھئے مقدمہ مل گیا۔" وہ اپنی کلمانی کی جھریاں درست کرتے ہوئے مسکرائے۔

میں نے انھیں خاور کی بے بسی کی تفصیل بتائی تو وہ کچھ دیر بوٹ کی نوک کدال کی طرح زمین پر مارتے رہے۔ پھر بولے "بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔" پھر دوسرے بوٹ کی نوک سے تھوڑی سی مٹی کھودی اور بولے "فکر نہ کیجیے۔ میں کوئی انتظام کر دوں گا۔ مقدمہ تو ملے تو پیدا کرنا چاہیے۔" پھر مجھے حواس باختہ دیکھ کر بولے "یہاں یونہی چلتا ہے صاحب۔ بڑے افسر کیا دیکھتے ہیں کہ مقدمہ نہیں ملا۔ یہ نہیں دیکھتے کہ کیوں نہیں ملا۔"

میں کھویا کھویا سا گھر واپس آ گیا۔ ایک دو روز خاور کے انتظار میں گزرے۔ تیسرے روز دفتر جانے کو تیار بیٹھا تھا کہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے دلاسہ سنگھ کھڑا تھا۔ بولا "چلیے ایک مقدمہ پیش کر دوں۔"

میں نے کہا "بھئی دلاسہ سنگھ، تم تو لالہ جی کے لوگوں میں شامل ہو۔ میرے حصے میں تو خاور آیا ہے۔"

بولا "لالہ جی کی اجازت سے آیا ہوں۔ سنا ہے خاور پر تو کچھ لوگ کتے چھوڑ رہے ہیں۔ مخبر کا پردہ ایک بار اٹھا تو مرتے دم تک کے لیے وہ ننگا ہو گیا۔ ہمارا کاروبار شراب کی بھٹیوں کا ہے۔ اس لیے ہمارا سلسلہ باہر جنگلوں سے ہے اور پردے شہروں میں اٹھتے ہیں۔ کل ایک بھٹی پر ریڈ ہو رہا ہے۔ لالہ جی نے کہا جاتے جاتے آپ کی ڈائری بھروا دوں۔ چلو، دو کا مقدمہ ہے۔ میں ان گندے نشوں کی دنیا میں اب تک نہیں آیا تھا پر آپ بھی ہمارے افسر ہیں اور سنا ہے صاحب ضلع نے آپ کو ڈانٹا ہے۔ سو ان نے صرف

آپ کو نہیں ڈانٹا' ولاسے کو بھی ڈانٹ دیا۔ ولاسہ زہر پی لے گا پر ڈانٹ نہیں پیے گا۔ اس وقت اٹھوں پہر مر کے سب غٹ پڑے ہیں۔ راستے میں چار سپاہی بھیجیے۔ میں چنڈو خرید کر اشارہ کر دوں گا۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

چھاپہ کامیاب رہا۔ پانچ ملزموں کا چالان ہوا اور میری ڈائری پر ڈپٹی کمشنر نے مجھے "گڈ" دیا۔

ایک مہینے کے اندر میں نے بھنگ کے چار افیون کا ایک اور چرس کے دو مقدمے پکڑے اور ان سب کا مخبر ولاسہ تھا۔ ایک مقدمے میں چرس ذرا سی کم تھی۔ ولاسے نے کہا آپ استغاثہ تو بھیجے۔ استغاثے کے آخر میں جب میں نے چرس کا وزن پوچھا تو ولاسہ بولا تول لیجیے۔ چرس تولی گئی تو ساتھ وزن سے ایک تولہ زائد نکلی۔ میں نے حیران ہو کر ولاسے کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آنکھ مار دی۔ میں نے استغاثہ ملزموں سمیت پولیس کے حوالے کر دیا۔

اسی دوران ایک بار خادو سے سر راہے ملاقات ہوئی۔ کان پر سگریٹ کا ایک ٹکڑا رکھے وہ دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ میں نے مزاج پوچھا تو بولا "دمہ ہو گیا سائیں۔ سانس پیٹ میں سما نہیں رہی۔ ہوا کا اتنا بڑا گولہ یہاں چھاتی میں گھس گیا ہے۔ اللہ نگہبان ہو۔" پھر وہ رونے لگا۔

مجھے ہرا بھرا مقدمے مل رہے تھے سو اس کے آنسو گالوں پر بہ گئے' میرے دل پر نہ ٹپک سکے۔ میں نے کہا "روتے کیوں ہو؟ محنت کرو۔ سارا ملتان پڑا ہے۔ تم تو صرف چار پانچ تکیوں سے نکالے گئے ہو اور یہاں ملتان میں تو ہر دسویں مکان کے بعد ایک تکیہ ہے۔"

اچانک اس کے تیور بدل گئے۔ جھلیوں کے گدلے پن میں درازی کی چمک پیدا ہوئی۔ سیاہ حاشیوں والے تربوز کے بیجوں کے سے دانت ایک ساتھ نمایاں ہو گئے۔ وہ بولا "جانتا ہوں سائیں' جانتا ہوں۔ ولاسے نے آپ کو اکٹھے آٹھ مقدمے دیے ہیں۔ یہ سب میرے مقدمے تھے پر وہ حرامزادہ مجھے لوٹ لے گیا۔ اسی نے میری مخبری کا دھندہ چھینا ہے۔ اب میں مقدمے تو کیا پکڑواؤں گا۔ ہاں یہ دمہ دور ہو تو ایک چھرا ولاسے کے پیٹ میں اتارنے کا بڑا ہی شوق ہے۔" اور وہ مجھے سلام کیے بغیر میلوں بھری کھائی کے جھکے کھاتا مخالف سمت رینگ گیا۔

چند روز بعد میں دفتر سے گھر آیا تو وہ میرے ملازم کے پاس بیٹھا ایک ہاتھ سے آنکھوں میں گھستی مکھیاں اڑا رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ٹوٹے سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے لیے مسلسل چٹکیاں بجا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو پہلے رو دیا اور پھر بولا "تین دن سے بھوکا ہوں سائیں اور نشہ بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ نشہ تو خیر آپ کیا دیں گے' مجھے [illegible] روٹی مل جائے تو ولاسے کا پیٹ چاک کرنے کے لیے کچھ دن اور زندہ رہ جاؤں۔ اللہ نگہبان ہو۔"

میں نے ملازم کو الگ لے جا کر کہا کہ خادو کو کھانا کھلا دے اور پھر اسے چلتا کرے۔ اس نے ایسا ہی کیا' مگر دوسرے تیسرے دن وہ پھر موجود تھا۔ رونے سے پہلے بے حیاؤں کی طرح مسکرایا تو میں نے دیکھا کہ نیچے کے دو دانت غائب ہیں۔ پھر ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ وہ چھلا بھی اس کے کان کی لو میں نہیں جو استاد نے ضرورت سے زیادہ بھنگ پینے کی خوشی میں اسے ڈالا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو رونے لگا۔ بولا "نشہ

لوٹ رہا تھا اور آپ جانیں کشتی کی گردن تڑوا لے گا پر نشہ نہیں ٹوٹنے دے گا۔ میں نے دانتوں اور کان کے دونوں تار کھینچ کر سگریٹ بھر چرس لے لی۔ آدھی یہ میرے کان میں رکھی ہے۔ سوچا اُکھڑے ہوئے دانتوں کو کوئی کب تک تار میں جکڑے پھرے؟ سو اب کاہے کو نکلوں بھنگ پینے کا اشتہار لیے پھروں جب بوٹی کا ایک منکر ابھی نصیب نہیں ہوتا۔ اللہ نگہبان ہو۔"

میں نے جل کر کہا "کیا میں نے یہاں لنگر کھول رکھا ہے کہ چرسیوں اور لوفروں کو روزانہ کھانا ٹھساتا پھروں۔ تم مخبر ہو۔ مخبری کرنا چاہتے ہو تو کرو اور سرکار سے انعام لو ورنہ مجھے بخشو۔ میں آبکاری کے ان داروغوں میں سے نہیں کہ اپنی کی بھنگ کے مقدمے کی خاطر مخبروں کو ہفتوں مہمانیاں کھلاتے رہیں۔ اگر کوئی مقدمہ نہیں دے سکتے تو جاؤ کسی تکیے میں پڑ رہو۔" پھر میں نے وہیں سے ملازم کو حکم دیا کہ آئندہ خادو کو میری اجازت کے بغیر گھر میں نہ گھسنے دے۔

وہ اس دوران پلکیں جھپکے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ جب میں ملازم کو ہدایات دے چکا تو وہ آہستہ سے بولا "اجازت ہے؟"

میں نے کہا "تو اور کس طرح اجازت دی جاتی ہے۔"

"اللہ نگہبان ہو۔" وہ بولا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز دلاسہ سنگھ نے مجھے ناجائز شراب فروشی کا "دو بوتلی" مقدمہ پکڑوا دیا۔ میں نے استغاثہ لکھا اور ملزم کو پولیس کے سپرد کر کے گھر آیا تو خادو باہر دروازے سے لگا بیٹھا تھا۔ میرے ملازم نے اندر سے زنجیر چڑھا رکھی تھی۔

جوہری کی نظر

ایک مرتبہ ایک دیہاتی اپنے گدھے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے ایک ہار ملا۔ دیہاتی نے ہار اٹھایا اور سوچا کہ کیوں نہ میں یہ ہار اپنے گدھے کو پہنا دوں۔ اتفاق سے ایک جوہری کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اُس نے جو اتنے قیمتی الماس کا ہار گدھے کی گردن میں دیکھا تو فوراً دیہاتی سے بولا:

"بھائی صاحب! کیا آپ یہ ہار فروخت کریں گے؟"

دیہاتی یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ سوچنے لگا "مجھے تو مفت میں یہ ہار ملا ہے۔ اب اپنے پیسے کھرے کرتا ہوں۔"

دیہاتی نے جواب دیا "جی ہاں میں یہ ہار فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی قیمت ایک ہزار اشرفی ہے۔"

دیہاتی کو کیا معلوم تھا کہ یہ انتہائی قیمتی موتیوں کا ہار ہے۔ اُس نے تو اندازے سے قیمت بتا دی تھی اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔

جوہری بہت چالاک تھا۔ قیمت سن کر کہنے لگا: "ایک ہزار تو نہیں البتہ تمھیں پانچ سو اشرفیاں دوں گا۔"

جوہری کے یہ کہتے ہی ہار ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ جوہری بہت حیران ہوا۔ اُس نے ہیروں کے ذروں سے سوال کیا "تم کیوں بکھر گئے؟"

ذرے بڑے دکھ سے بولے "یہ تو ایک دیہاتی تھا کم عقل اور جاہل۔ اس کو ہماری حقیقت کا علم نہیں تھا۔ لیکن تم تو جوہری ہو۔ جب تم نے سچائی جانتے ہوئے ہماری اتنی قیمت گرا دی تو ہم ثابت رہ سکتے تھے؟" (مرسلہ: شہلا اعظم، اوکاڑہ)

میں نے چھوٹتے ہی کہا "دیکھو جادو مجھ پر تمہارا جادو ذرا مشکل ہی سے چلے گا۔ میں دیکھ چکا کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ تم سے ایک بار کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمہیں افسروں کے لیے۔۔۔"

"ایک مقدمہ ہے۔" وہ کچھ یوں بولا جیسے ٹین کی چادر پر کنکر گر پڑے ہیں۔

"مقدمہ ہے؟" کرسی سے نرمی کی طرف پلٹنے والے میرے ذہن کو صرف یہی الفاظ سوجھے اور میرے سامنے آنے والے شخص کی ڈائری کے ورق کھل گئے۔

"جی۔" وہ اسی طرح تیکھے لہجے سے بولا۔

"کیا مقدمہ ہے؟"

"چھوٹا سا مقدمہ ہے۔ ایک آدمی پھنس چکا ہے۔ یہ مقدمہ تو ہے سائیں۔"

"ہاں مقدمہ تو ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "کہاں ہے؟"

"کالے منڈی میں۔"

"کب چلیں؟"

"ابھی چلیے۔ نیا نیا آدمی ہے۔ وقت بے وقت کی پروا نہیں کرتا۔ جب جائیے گلے میں ٹکڑا خرید لیجیے۔ آپ نے انگریزی سوٹ پہن رکھا ہے پر وہ آپ کا ہی ہو لے گا۔ بڑا ہی بھولا آدمی ہے۔"

"تو پھر چلو۔"

"چلیے۔ اللہ نگہبان ہو۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اٹھا اور پھر جیسے چکرا کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور گھٹنے کانپنے لگے۔ پھر اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ کمان کی طرح دہرا ہو کر دیر تک کھانستا رہا۔ حتیٰ کہ کھانسی اس کے حلق سے سیٹیاں اور سیٹیں بن کر نکلنے لگی۔

میں دروازہ کھلوا کر اندر سے ایک مونڈھا اٹھا لایا مگر اس نے دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں میں کہا "نہیں جی اس کی ضرورت نہیں۔ اللہ نگہبان ہو۔"

پھر وہ سیدھا ہو گیا۔ آستین سے آنکھیں پونچھیں۔ کان پر سے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر مجھ سے دیا سلائی مانگی اور سگریٹ سلگا کر بولا "چلیے۔"

تھانے تک اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی صرف سگریٹ پیتا رہا۔ ہم تھانے کے پاس پہنچے تو وہ ایک بار پھر زور سے کھانسا۔ اس کی ہر سانس کے ساتھ حلق سے کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سے آرہ کش ایک ساتھ لکڑیاں چیر رہے ہیں۔ میرے چہرے پر تردد کے آثار دیکھ کر وہ فوراً بولا "اس کھانسی اور اس کھانسی میں بڑا فرق ہے سائیں۔ وہ کھانسی تو چرس کی ہے۔ اس سے سینہ بیٹھتا تھا۔ اس سے پاؤں کے ناخنوں سے ماتھے کی کھوپڑی تک ہلتا ہے۔ فکر کی بات نہیں اللہ نگہبان ہو۔"

تھانے سے اس نے پہلو بچایا ساتھ لیے اور کالی منڈی کا رخ کیا۔ بہت تنگ تاریک اور تیلی تیلی گلیوں میں سے گزر کر ہم اندر ہوا۔ اپنے ہڈیلے بھرے ہاتھ سے میرا ہاتھ دبایا اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا "وہ سامنے جو دروازہ کھلا ہے نا اس میں آپ داخل ہو جائیے۔ سپاہیوں کو باہر رہنے دیجیے۔ آپ خود جا کر گلے کا ٹکڑا خرید لیجیے۔ مقدمہ یوں آپ کے سامنے رکھا ہے جیسے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ چلیے۔۔ بسم اللہ کیجیے۔"

وہ پلٹ کر گلی کے موڑ کی طرف رینگ گیا۔ میں اس کے مشورے پر کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

خاصی معتبر صورت کا ایک آدمی پانچ آدمیوں کے درمیان بیٹھا سنتے نے موسل سے نئی کونڈی میں بھنگ گھوٹ رہا تھا۔ پانچوں آدمی مٹی کے نئے پیالوں میں بھنگ پی رہے تھے۔ ایک طرف دو نئے گھڑے رکھے تھے جن کے دہانوں پر سرخ ململ کی نئی نئی صافیاں بندھی تھیں۔ چبوترے سے آنگن کے ایک کونے میں تین کالے بچے کھجور کی گٹھلیوں سے کھیل رہے تھے۔

معتبر صورت آدمی میری طرف دیکھ کر ذرا سا چونکا اور موسل چلانا بند کر دیا۔ مگر جب میں نے مسکرا کر بولی کا ایک مٹکرا طلب کیا تو اس نے مجھے سے چیزی نکال کر میری طرف بڑھا دی اور مجھے کہا "بسم اللہ۔" وہ بولا "مشغل والی کہ سادہ؟"

"سادہ۔" میں نے کہا تاکہ دونوں گھڑے اور گلی میں کوئی آتا جاتا سپاہیوں کو نہ دیکھ لے۔

ایک مٹکرا اٹھا کر اس نے ایک گھڑے کو جھکایا جس میں دو بڑی آوازیں پیدا ہوئیں۔ گھڑا بھنگ سے لبریز رکھا تھا۔ ایک اکنی جس پر میں نے پہلے سے چاقو کی نوک سے اپنے دستخط کر رکھے تھے اس کی طرف پھینک کر مٹکرا ہاتھ میں لیا اور مجوزہ منصوبے کے مطابق کھانس دیا۔ سپاہی لپک کر آگئے۔ ملزم کے چہرے سے لے کر ہاتھوں کے ناخنوں تک پیلدی کھنڈ گئی۔

میں نے بھرے ہوئے دونوں گھڑے سربمہر کر کے استغاثہ لکھا اور ملزم میراں بخش کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ تینوں بچے چیخ چیخ کر روتے ہوئے میراں بخش کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ ایک عورت کوٹھے سے نکل کر بین کرنے لگی۔ آس پاس کی چھتوں پر بکھرے بالوں اور نیلے چہروں والی عورتوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ میراں بخش بکا بکا کھڑا سامنے کھلے دروازے سے پار دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے روز میں دفتر گیا تو خادو پہلے سے دروازے میں موجود تھا۔ میں اندر کرسی پر جا کر بیٹھا تو وہ بھی اندر آ گیا۔ میرے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر بولا "مقدمہ کیسا تھا سائیں؟"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا۔ "پورے دو گھڑے لبالب بھرے رکھے تھے۔"

"پورے دو گھڑے؟" وہ ضرورت سے زیادہ حیران نظر آنے لگا۔

ذرا سے وقفے کے بعد وہ بولا "ایک بات کہوں سائیں۔"

"کہو۔" میں نے کہا۔

"اللہ نگہبان ہو۔" وہ بولا۔ "میراں بخش کے ساتھ ذرا سی رعایت ہو سکے گی؟"

"رعایت؟" میں نے پوچھا "رعایت کیسی؟"

"رعایت چاہیے سائیں۔" خادو میری کرسی کے ساتھ لگ کر میری پنڈلیاں دبانے لگا۔ "میراں بخش سے میں نے نیا نیا کام شروع کرایا ہے۔ بے چارا بالکل بھولا ہے۔ پہلے کھجوروں کی چھابڑی لگاتا تھا۔ نیا نیا ہے۔ قید نہ ہو جرمانہ ہو جائے۔ بس اتنی رعایت چاہیے۔"

میں نے سب انسپکٹر آبکاری کی حیثیت سے کہا "وہ ملزم ہے اور ملزم سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی۔"

"پر سنیے تو سائیں۔" خادو نے اچانک بچے کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے کہا "یہ میراں بخش میرا بڑا بھائی ہے۔ اسے پکڑوانے کا مجھے جو انعام ملا اُسے میں جرمانے میں دے دوں گا۔ اللہ نگہبان ہو۔" ◆◆◆

تجربات زندگی

مشورہ مفت

جائیں تو جائیں کہاں؟

ایک بے روزگار نوجوان کو انٹرویو میں کامیابی کے لیے ملنے والے بھانت بھانت کے مشورے

سجاد قادر

رات سونے سے پہلے میں نے کپڑے استری اور جوتے پالش کر لیے تھے کہ مبادا صبح ان کاموں کی وجہ سے دیر ہو جائے۔ صبح فٹافٹ شیو کیا' نہایا اور کپڑے پہن کر جاتم بھاگ نکل پڑا۔ دراصل آج مجھے انٹرویو دینے جانا تھا۔ یہ میرا پہلا انٹرویو نہیں تھا۔ میں ان سے اب تک ہو گئے تھے لاہور آئے ہر روز دو نہیں تو ایک انٹرویو لازمی ہو جاتا۔ ہاسٹل میں رہنے والے میرے اور ساتھی پوچھتے "بھیا انٹرویو دینے جاتے ہو کہ لینے جو اتنے دن ہو گئے ملازمت ہی نہیں ملی؟" ان دوستوں میں سے چند ایک ملازمت کر رہے تھے جبکہ کچھ ابھی زیر تعلیم تھے۔

روزانہ شام جب میں نامراد لوٹتا تو وہ مجھے طرح طرح کے مشوروں سے نوازتے۔ قیمتی انگلی اور بے جان ایسی ناکامی فلاں ہوٹل اور تیار کر کے جاؤ۔ جب بلایا جائے تو دروازے پہ کھڑے ہو کر اجازت نہیں مانگی "میں اندر آ سکتا ہوں سر" سیدھے اندر چلے جاؤ۔ جب تک وہ کہیں نا تب تک کرسی پہ نہیں بیٹھنا۔ ہر جملے کے شروع اور آخر میں سر کہنا ضروری ہے۔ اگر کسی بات پہ اعتراض ہو تو بحث نہیں کرنی چاہیے۔ تمہاری بات لاکھ ٹھیک ہی ہو۔ سر کے بالوں میں تیل لگا کر نہیں جانا' پسینا آنے کے بعد بو آنے لگتی ہے۔ پرفیوم ساتھ رکھنا اور کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہلکا سا لگا لینا۔

اس سارے لیکچر کے بعد وہ مجھے بتاتے کہ فلاں لڑکا آیا تھا۔ اسے ہم نے یہی مشورے دیے۔ آج وہ

فلاں جگہ ملازمت کر رہا ہے۔ ایک پینڈو آیا' تمہاری طرح مگر ہم نے اسے "بابو" بنا دیا۔ آج وہ ایک بہت بڑی کمپنی میں ملازمت کر رہا ہے۔ "تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کیسے دوستوں سے پالا پڑا تھا' بس ہمارے مشوروں پہ عمل کرو' دیکھنا چند دنوں کے اندر اندر ملازمت پکی!"

ملازمت خاک ملنی تھی۔ بیس دنوں سے دفاتر کی خاک چھان رہا تھا مگر ملازمت تھی کہ ملنے کا نام نہ لیتی۔ آج اکیسواں دن تھا۔ میں تیار ہو کر ڈاکٹرز اسپتال کے کینال اسٹاپ پہنچا ہی تھا کہ دھڑام کی آواز آئی۔ ادھر ادھر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ لگا یوں تھا جیسے کوئی چھت گر گئی ہو۔ پھر دیکھا کہ لوگ قریب ہی نہر پہ بنے زیریں پل (انڈر پاس) کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ میں بھی وہاں پہنچا تو منظر دیکھ کر عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ پٹھانوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ انھوں نے ٹرک کی دو منزلیں بنا رکھی تھیں' کچھ پختون نچلی منزل میں تھے اور بقیہ بالائی منزل پر سوار تھے۔

ٹرک ڈرائیور شاید پہلی دفعہ لاہور آیا تھا اور ان پڑھ بھی تھا۔ اس نے انڈر پاس کے اوپر سے گزرنے کے بجائے نیچے سے ٹرک گزارنا چاہا' مگر پل کی اونچائی مخصوص تھی لہٰذا ٹرک اس کی چھت سے ٹکرا گیا۔ چونکہ رفتار بہت زیادہ تھی۔ وہ پل کے نیچے سے گزر کر آگے تو آ گیا مگر بالائی منزل کے سوار شدید زخمی ہو گئے۔ اس میں سوار پختون رائیونڈ تبلیغی اجتماع میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔

جب میں وہاں پہنچا تو ٹرک رک چکا تھا۔ باہوش پٹھان زخمی ساتھیوں کو ٹرک سے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ بے ہوش تھے' کچھ چوٹیں کھانے کے باوجود زیادہ زخمی ہونے والے ساتھیوں کو اتارنے لگے۔ ٹرک میں جا بجا خون بکھرا نظر آ رہا تھا۔ دو تین مسافروں کی حالت بہت خراب تھی۔ پٹھانوں نے ایسا واویلا مچا رکھا تھا کہ کہرام برپا ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے پل کے دائیں بائیں کناروں پر خاصے لوگ جمع ہو گئے۔ کچھ گاڑیاں بھی رک گئیں۔ لوگ ٹھہرتے' پوچھتے کہ کیا ہوا اور اپنی راہ چل دیتے۔ ٹرک میں موجود زخمی جس قدر چیخ پکار کر رہے تھے اس سے کہیں زیادہ انڈر پاس کے اوپر کھڑے تماشا دیکھنے والوں پر خاموشی طاری تھی۔ مجھ سمیت کوئی بھی ان کی مدد کرنے کو آگے نہیں بڑھا۔ نہ ہی پختونوں نے کسی سے مدد مانگی۔ کچھ دیر بعد اوپر کھڑے لوگ پٹھانوں کو طرح طرح کے مشورے دینے لگے۔ کوئی کہتا' زخمی کو نیچے مت اتارو بلکہ ٹرک ہی پر اسپتال لے جاؤ۔ کوئی کہتا' پہلے انھیں اتار لو اور جو زیادہ زخمی ہیں انھیں اسپتال لے جاؤ۔ غرض جتنے لوگ تھے ان سے کہیں زیادہ مشورے۔ پہلے سے موجود تماشائی نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتے اور انھیں حادثے سے متعلق معلومات بڑھا چڑھا کر بتاتے۔ کوئی کہتا پٹھان تو ہیں ہی بے وقوف' انھیں وہ بورڈ نظر نہیں آیا جس پر واضح اور جلی حروف میں لکھا ہے کہ ٹرک اور بس کا داخلہ ممنوع ہے۔

مجھے وہاں رنگا رنگ مشورے اور تبصرے سننے کو ملے' افسوس ہم میں سے کوئی سوائے باتیں کرنے کے عملی طور پر ان کی مدد نہیں کر سکا۔ ایک دفعہ ذہن میں ضرور آیا کہ نیچے اتر کر زخمیوں کی مدد کروں۔ پھر خیال آیا کہ میرے کپڑوں کی استری خراب ہو جائے گی۔ شاید کہیں خون کا دھبا بھی لگ جائے۔ اور اگر نیکی کے اس کام میں دیر ہوئی تو انٹرویو نہیں دے پاؤں گا۔

ملازمت ڈھونڈتے اتنے دن ہو چلے اب تو تن پونجی بھی ختم ہونے کو ہے۔ سو طرح طرح کی باتیں اور سوچیں ذہن میں عود کر آئیں۔

بالآخر کچھ سوچ کر میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور 1122 پر حادثے کی اطلاع دے دی۔ کچھ ہی دیر میں دو ایمبولینسیں سائرن بجاتی آ دھمکیں۔ میرے دل کو کچھ تسلی ہوئی اور میں آنکھیں چرا کر وہاں سے آگے چل دیا۔

دفتر پہنچنے تک میرے دماغ میں حادثے کا منظر مسلسل گھومتا رہا۔ زخمیوں اور پھٹوؤں کی شکلیں، تباہ حال ٹرک کا منظر اور اکٹھے ہوئے لوگوں کے عجیب و غریب تبصرے دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔

انٹرویو دینے کے لیے لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ کچھ کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کچھ شوقیہ آئے تھے کہ چلو دیکھتے ہیں انٹرویو کیسے ہوتا ہے۔ کچھ کی حرکات اور بات چیت سے عیاں تھا کہ وہ مراحل گزرتے گزرتے انٹرویو دینے چلے آئے اور کچھ باقاعدہ تیاری کر کے آئے تھے۔ بعض لڑکوں کا یہ حال تھا کہ اب بھی کتابیں کھول رٹے لگا رہے تھے۔ یہاں بھی کچھ "بڑے دل" کے لوگ ملے جو خود انٹرویو دینے آئے تھے اور دوسروں کو مشورے دے رہے تھے کہ انٹرویو ایسے دیتے ہیں۔ ایسی ویسی بات نہیں کرنی، کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھنا ہے، کمر کو جھکانا نہیں، ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے نہیں بیٹھنا، کان یا سر نہیں کھجانا خواہ کتنی ہی زور کی خارش کیوں نہ ہو، ناک میں تو انگلی بالکل نہیں ڈالنی، انگلش میں بات کرنی ہے اردو بالکل نہیں بولنی، سی وی خود لفافے سے نکال کر انھیں دینا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے دیکھا یہاں بھی مشوروں اور تبصروں کے دفتر کھلے تھے۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوا کہ کتنے اچھے لوگ ہیں.... خود ہی دوسروں کو مشورے دے رہے ہیں کہ انٹرویو کیسے دینا ہے جبکہ انھیں علم ہے کہ وہ خود بھی ملازمت پانے کی دوڑ میں شامل ہیں۔ دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ ہو تو ایسا!

خیر جیسے تیسے انٹرویو ہو گیا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات... ناکام واپسی ہوئی۔ خلاف معمول بس میں خالی نشست مل گئی۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ساتھ کے پیٹے میں ایک شریف آدمی ساتھ والی نشست پر براجمان ہو گئے۔ میرے ہاتھوں میں تعلیمی اسناد دیکھ کر گویا ہوئے "بیٹا انٹرویو دے کر آ رہے ہو؟" کچھ کہنے سے قبل میں نے ان کے چہرے کا بغور جائزہ لیا اور "جی" کہہ کر منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہوئے "کہاں تک پڑھے ہو؟ تم نے بتایا نہیں؟" "ماسٹر کیا ہے۔" بس پھر کیا تھا وہی ایک لمبا چوڑا لیکچر ہمارے کانوں کو چوکے لگانے کے لیے تیار تھا۔

وہ بزرگ گویا ہوئے "بیٹا عام تعلیم کیوں پائی؟ آج کل اس کی کوئی وقعت نہیں۔ آپ کوئی ٹیکنیکل ڈگری لیتے یا کوئی ڈپلومہ کرتے تو فوراً ملازمت مل جاتی۔ ایم اے والے ڈگریاں ہاتھ میں لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور جس نے کوئی ڈپلومہ کیا ہے انجینئرنگ میں یا کسی اور ٹیکنیکل فیلڈ میں اس کے تو وارے نیارے ہیں۔ میرے بیٹے نے سول انجینئرنگ کی ہے۔ آج پچاس ہزار روپے تنخواہ لے رہا ہے۔ ایک بھتیجے نے الیکٹریکل میں ڈپلومہ کیا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر ہے۔ کمپنی نے گاڑی اور کوٹھی بھی دے رکھی ہے۔ آپ بھی کوئی ڈپلومہ کر لو بیٹا جلد ہی ملازمت مل جائے گی... نہیں تو کوئی چھوٹا

موٹا کاروبار کر لو۔"

میں نے کہا "چچا! کاروبار کے لیے پیسا چاہیے جو میرے پاس نہیں۔"

"تو پھر کوئی ہنر سیکھ لو اور عرب امارات چلے جاؤ۔" بزرگ نے مشورہ دیا۔ وہاں معقول معاوضہ مل جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں کیا رکھا ہے؟ لوڈشیڈنگ، مہنگائی، ہڑتالیں، بیروزگاری، دہشت گردی... یہاں تو سانس لینا محال ہے۔

میرا اسٹاپ آ گیا تھا۔ میں نے پرخلوص مشورہ دینے پر شریف آدمی کا شکریہ ادا کیا اور بس سے نیچے اتر آیا۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر احساس ہوا کہ بس میں کسی نے میری گردن دبوچ رکھی تھی اور میں نے پچھلے آدھے گھنٹے سے اپنا سانس روک رکھا تھا۔ ہاسٹل جانے کے بجائے میں وہیں سڑک پہ مسافروں کے لیے مخصوص بنچ پر بیٹھ گیا۔ سوچتے سوچتے جب چاروں طرف مایوسی نظر آئی تو بھول گیا کہ مایوسی گناہ ہے اور اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ مختلف قسم کے منصوبے ذہن میں آئے۔ سڑک پہ کسی تیز رفتار گاڑی کے آگے چھلانگ لگا دوں یا قریبی نہر میں ڈوب مروں۔ کبھی سوچتا ہاسٹل جاتا ہوں اور گھر والوں کو خط میں اپنی مجبوری سے آگاہ کرتا ہوں۔ پھر زہر پھانک لوں گا...

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا

خودکشی سے قبل دو رکعت نماز تو پڑھ لوں تاکہ اللہ کو بتا سکوں کہ میں یہ قدم کیوں اٹھا رہا ہوں۔ ویسے تو اللہ سب جانتا ہے مگر خودکشی سے پہلے توبہ کر لوں تو شاید اللہ میرا گناہ بخش دے۔ یا پھر اگر باوضو ہو کر قبلہ رخ کھڑے کلمہ طیبہ پڑھ کر زہر پیا جائے شاید تبھی خودکشی حرام نہ ہو۔

میں ابھی یہ منصوبے بنا ہی رہا تھا کہ میرے بالکل ساتھ ایک نوجوان لڑکا آ براجمان ہوا۔ پہلے پہل تو میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی لیکن چہرہ دیکھا کہ وہ بھی بڑا افسردہ دکھائی دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا "مرنے کی کوشش کر رہا ہوں، آپ نے بھی مرنا ہے کیا؟!"

میں نے کہا "بڑے شوق سے مریں بلکہ اگر آپ کا منصوبہ اچھا اور عمدہ ہے تو شاید میں بھی اس پر عمل کر لوں۔ مگر پہلے وجہ تو پتا چلے کہ جناب یہ شوق کیوں فرما رہے ہیں؟!"

برخوردار نے بتایا "میں ایک لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔ مگر میرے گھر والے اسے بہو نہیں بنانا چاہتے۔ اس لیے تنگ آ کر اپنی جان قربان کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "بھائی! اتنی جلد ہار نہیں مانتے۔ صبر سے کام لو۔ اللہ سے دعا کرو اور اپنے والدین کو منانے کی کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے وہ مان جائیں گے۔ اگر جلدی میں جذباتی فیصلہ کیا تو اپنی عاقبت خراب کرو گے اور والدین کو بھی تکلیف پہنچاؤ گے۔ آخر وہ ہیں تو تمہارے والدین۔ ارشاد باری تعالیٰ قرآن پاک میں ہے کہ اپنے والدین کو اف تک نہ کہو... اور جہاں تک پسند کی شادی کا سوال ہے تو تھوڑا صبر کرو۔ اپنے والد کے دوستوں سے مل کر ان سے مدد لو اور گھر میں بھی اچھے طریقے سے بات چلاؤ۔ مجھے امید ہے والدین تمہاری بات رد نہیں کریں گے۔" ان باتوں کے دوران ہی اچانک مجھے خیال آیا کہ مشوروں اور تبصروں کا لیکچر تو یہاں بھی شروع ہو چکا... جائیں تو جائیں کہاں!؟ اتنا بہرحال ہوا کہ میں نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور اگلے دن سے نئے ولولے کے ساتھ ملازمت کی تلاش کا منصوبہ بنا لیا۔

◆◆◆

خدمت خلق

لاہور کی سماجی تنظیم کا کارنامہ

ڈاکٹر آصف محمود جاہ

یہ پچھلے سال کے اوائل کی بات ہے کہ صحرائے تھر جاتے ہوئے ہم پہلے تھر کول منصوبے کی جگہ پہنچے جہاں مشینری لگ رہی تھی۔ وہاں ظفر اللہ انجینئر اور عطا اللہ ماہر ارضیات سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اس سیکڑوں مربع میل رقبے پر پھیلے علاقے میں اربوں ٹن کوئلے کے ذخائر ہیں۔ یہ کوئلہ بجلی گھروں میں استعمال کرنا ممکن ہے۔

واپسی پر اسلام کوٹ میں کھانا کھایا اور آگے بڑھے۔ تھر پارکر کی سڑکوں اور ریگستانوں سے رفتہ رفتہ کچھ آشنائی سی ہو گئی۔ اگرچہ یہاں کام کرتے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن محسوس ہوتا ہے کہ جب بھی آئیں تو سارے گوٹھ بانہیں کھولے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ اس بات کا کرشمہ ہے کہ یہاں آ کر ہم نے خوشیاں بانٹیں، غریبوں کے دکھوں کا مداوا کیا اور جواب میں محبت اور اپنائیت پائی۔ مٹھی میں کچھ دیر قیام کیا۔ کل ورڈز نے

بتلایا کہ گوٹھ کاروجھیرا کی مسجد میں وضو کے لیے چند ٹوٹیاں لگا دیا گیا ہے۔

تھر کی خاک چھاننے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوا کہ وہاں کے باسیوں بشمول انسانوں اور جانوروں کا بنیادی مسئلہ پانی کی فراہمی ہے۔ بارش پانی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ بارش ہو جائے تو جانوروں کے لیے چارہ بھی اُگتا ہے۔ کچھ نہ کچھ فصل بھی ہو جاتی ہے۔ بھیڑ، بکریاں، گائے، اونٹ موٹے تازے اور خوش رہتے ہیں۔ انھیں صحیح خوراک بھی ملتی ہے۔ یوں منڈی میں ان کی اچھی قیمت بھی مل جاتی ہے۔ بارش نہ ہو تو پھر سارا معاملہ تلپٹ ہو جاتا ہے۔ نہ جانوروں کو چارہ ملتا ہے اور نہ انسانوں کو کھانے پینے کی اشیا میسر آتی ہیں اور چاروں طرف موت اور بیماری کے سائے لہرانے لگتے ہیں۔

اڑنے والے پرندوں میں مور تھر کا حسن ہیں۔ جب تھر کے ریگستانوں میں موروں کی ڈاریں نیچے اترتی ہیں۔ سیر ہو کر پانی پینے کے بعد مور اور مورنیاں محو رقص ہوں اور موروں کے خوبصورت پنکھ کھلیں تو فضا میں قوسِ قزح کے سارے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ مور اور مورنیاں اپنے حال میں مست اٹکھیلیاں کرتے، کلکاریاں مارتے اپنی پیاری آواز میں گاتے اتنے اچھے لگتے ہیں کہ جی چاہتا ہے یہ منظر کبھی آنکھوں کے سامنے سے محو نہ ہو۔ پچھلے دنوں دوسرے جانوروں کی طرح تھر کے خوبصورت مور بھی بیماری کا شکار ہوئے۔

لاہور سے جانے والی ڈاکٹروں اور سماجی کارکنوں کی ٹیمیں تھر کے صحراؤں اور نخلستانوں میں علاج اور خدمت کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ سندھ میں کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کے کوآرڈینیٹر گل دراز خان اور مردان خان کے ہم نشین عبدالرؤف خان، عطا ہمدانی، رفیق جاوید جونیجو اور ڈاکٹر عبداللطیف جونیجو نے مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر تھر جا کر وہاں ضرورت مندوں کو مدد پہنچائی۔

گل دراز خان پچھلے تین ماہ سے مصروفِ عمل تھے۔ تھر کے لوگوں نے انھیں کنواں خان کا نام دے ڈالا کیونکہ ان کے ذمے بنیادی کام کنوؤں کی کھدائی اور ان کی جلد تکمیل ہے۔ گل دراز خان اور بابا عبدالرؤف خان گوٹھ گوٹھ، پھر کر ایسی جگہیں تلاش کرتے جہاں کنوؤں کی ضرورت ہے۔

انسانوں اور جانوروں کی پیاس بجھانے کے لیے

غزل

آئے گی روشنی کو آنا ہے
یہ اٹل ہے کہ شب کو جانا ہے
یہ کمال اب ہمیں دکھانا ہے
آندھیوں میں دیا جلانا ہے
اپنا حق مانگتے ہیں کانٹے بھی
قرض پھولوں کا بھی چکانا ہے
ان تضادات سے نہ ڈر کہ چمن
آب و آتش کا کارخانہ ہے
اک نئی رت کی آس میں ہم کو
خشک پیڑوں کو بھی بچانا ہے
آج پھر پتھروں کی بستی میں
ہم کو آئینہ لے کے جانا ہے

(احمد شریف)

میٹھے پانی کے کنویں کھدوانا بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں بھوکوں کو کھانا کھلانے اور پیاسوں کو پانی پلانے کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق صحیح طریقے سے کھدوایا گیا کنواں سالہا سال چلتا ہے اور روزانہ سیکڑوں پیاسے انسانوں اور جانوروں کی پیاس بجھاتا ہے۔

تھر میں کام کرتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوا کہ پانی کی اہمیت کیا ہے؟ مریضوں کو دیکھتے ہوئے پتا چلا کہ یہاں کے بچے، بوڑھے اور خاص کر عورتیں مہینوں بغیر نہائے رہتی ہیں۔ بچوں کے جسموں پر مٹی کی تہیں نظر آئیں۔ کنویں کا صاف پانی ان کے لیے آبِ حیات ہے۔

تھر کے گوٹھوں میں کام کرتے ہوئے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوا کہ غریب کسان یہاں کا مظلوم طبقہ ہے۔ ہاری نسل در نسل ٹھاکر یا وڈیرے کے غلام ہوتے ہیں۔ گزر بسر کے لیے ٹھاکر سے اگر کچھ قرضہ لیا تو وہ سود در سود ہر سال بڑھتا اور اصل رقم سے کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ یوں ان غریبوں کے لیے ادا کرنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

ہم نے جس گوٹھ میں کنویں بنوائے وہاں ہر گروہ کے لوگوں، مکھیا یا نمبردار، امام مسجد وغیرہ کو اکٹھا کر کے اعلان کیا کہ یہ کنواں سبھی کے لیے ہے۔ یہ کسی مخصوص گروپ، فرقے یا مذہب سے منسلک نہیں۔ آپ سب اس سے جب چاہیں جتنا چاہیں پانی لے سکتے ہیں۔ یہ کنواں آپ سب کا ہے۔ اسے صاف رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا بھی آپ سب کی ذمہ داری ہے۔

کئی گوٹھوں میں دیکھا کہ وہاں کنویں سے صرف چند خاندانوں کو پانی لینے کی اجازت ہے۔ باقی لوگ دور دراز کے گوٹھ سے پانی لاتے ہیں۔ اسلام کوٹ کے قریب ایک گوٹھ گئے تو وہاں سبھی ہندو آباد تھے۔ سارے مرد و زن جمع ہو گئے۔ سب ایک ہی گزارش کرنے لگے۔ "مہاراج! ہمارے گوٹھ میں کنواں بنوا دو۔ ہمیں دوسرے گوٹھ والے پانی لینے نہیں دیتے۔" ہم نے فوراً وہاں کنواں بنوانا شروع کیا۔ اللہ کے فضل سے ہندوؤں کے گوٹھ میں کنویں کی کھدائی اور تعمیر مکمل ہوئی اور صاف اور میٹھا پانی نکل آیا۔

ہم نے انھیں مذاقاً کہا کہ اب اگر دوسرے گوٹھ والے آپ کے کنویں سے پانی بھرنے آئیں تو انھیں منع نہ کیجیے گا... وہ کوئی جواب دیے بغیر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اب صبح و شام ہندو وہاں سے پانی بھرتے اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر اپنے انداز سے دعا دیتے ہیں۔

کسی گوٹھ میں جب نئے کنویں کی تعمیر کا آغاز ہو تو عجب منظر ہوتا ہے۔ گاؤں کے سارے مرد و زن اور بچے وہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان میں ہندو ہوتے ہیں اور مسلمان بھی۔ سب اپنے رب کو پکارتے اور اس سے میٹھا پانی نکلنے کی دعا کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک عجیب منظر دیکھا۔ جب ایک گوٹھ میں نئے کنویں کی تعمیر کا آغاز ہونے لگا تو ایک ہندو عورت کندھے تک سفید چوڑیوں میں ملبوس بازوؤں میں چینی کا تھال لیے آئی۔ آتے ہی ساری چینی کنویں کی کھدائی والی جگہ کی ریت میں ملائی، منہ میں کچھ بڑبڑایا اور جاتے جاتے کہنے لگی کہ رام بھلی کرے گا، یہاں سے میٹھا پانی نکلے گا۔ ساتھ کھڑی اماں بولی "میں نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگی ہے۔ اللہ مہربانی کرے گا۔ میری دعا کی برکت سے یہاں سے میٹھا پانی ضرور نکلے گا۔"

بقیہ اسلم کمال انٹرویو

"ان خواتین کا کہنا تھا کہ آپ تو طویل عرصے سے عورتوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اپنی تخلیقات میں ایسی عورتیں دکھاتے ہیں جو ہونٹ نہیں رکھتیں اور آنکھوں و ہاتھوں کے اشاروں سے باتیں کرتی ہیں۔ یہ مردانہ شاؤنیت والے معاشرے پر زبردست طنز ہے۔ ہم آپ کو سلام کرتے ہیں۔"

اسلم صاحب اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ شاعروں کی طرح مصور بھی روحانی واردات سے گزرتے ہیں۔ یعنی ایسی کیفیات اور اشارے جنھیں انسان شناخت نہ کر سکے، مگر محسوس ضرور کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ ایک حیران کن واقعہ سناتے ہیں:

"ممتاز اقبال ملک پاک فوج کے رسالے "ہلال" کے مدیر تھے۔ ایک مرتبہ وہ عمرہ ادا کرنے گئے۔ واپسی پر انھوں نے مجھے خط لکھ کر بتایا: میں ریاض الجنہ میں بیٹھا تھا۔ اچانک کسی غیبی آواز نے مجھے حکم دیا کہ ماہ رمضان میں شائع ہونے والے "ہلال" کے سیرت نمبر کا سرورق اسلم کمال سے بنوایا جائے۔ سو میں نے وہ سرورق بنوایا جو بڑا مشہور ہوا۔ بے پناہ عزت و شہرت عطا ہوئی۔"

بعض حلقوں کا دعویٰ ہے کہ مصورانہ خطاطی نے صدر ضیا الحق کے دور میں عروج پایا۔ اسلم کمال صاحب نے اس بابت بتایا: "یہ محض پراپیگنڈا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت اس فن کی سرپرست رہی۔ انھی کے دور میں مصورانہ خطاطی کے فن پاروں کی اولین نمائشیں منعقد ہوئیں۔ پھر بھٹو صاحب اندرا گاندھی سے ملنے شملہ گئے تو صادقین سے خطاطی کا ایک فن پارہ "وتعز من تشاء وتذل من تشاء" بطور تحفہ عطا کر لے گئے۔

"دراصل مصورانہ خطاطی میں سنہری تار اسلام ہے۔ اسی لیے اس فن کو عروج ملا تو اسلام مخالف علقے مصورانہ خطاطی کو بدنام کرنے کی خاطر یہ پروپیگنڈا کرنے لگے کہ اسے صدر ضیا الحق نے فروغ دیا۔ حالانکہ مصورانہ خطاطی کی ترقی و ترویج 1970ء کے بعد شروع ہوئی تھی۔"

تجربات زندگی پہ خاصی گفتگو ہو چکی تھی، سو طیب صاحب نے سوچا کہ اب ذرا فن پر بھی بات ہو جائے۔ انھوں نے کھنکتی آواز میں پوچھا: "مصوری اور خطاطی کا مستقبل کیا ہے؟"

یہ سوال سن کر اسلم کمال چند لمحے خاموش رہے، پھر اپنا تمام تر تجربہ الفاظ میں سموتے ہوئے گویا ہوئے "آج کل بیشتر نوجوان لڑکے لڑکیاں فیشن کو بطور پیشہ مستقلاً اپنانے کی خاطر فائن آرٹس کے تعلیمی اداروں میں داخلہ لیتے ہیں۔ انھیں مصوری خصوصاً خطاطی سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا۔ لیکن مصورانہ خطاطی کے فن پاروں کی مقبولیت اور اس کی مانگ اس وقت تمام اصناف مصوری میں زیادہ ہے۔

"ہمارا المیہ یہ ہے کہ خطاطی سکھانے کے لیے تعلیمی اداروں میں کوئی مربوط نظام موجود نہیں۔ یہ المیہ ہے کہ تقریباً ہر اسکول اور کالج کا اپنا اپنا نصاب ہے۔ اسی لیے فائن آرٹس کالجوں سے خال خال ہی عمدہ خطاط نکلتے ہیں۔

"اس کے باوجود پاکستان اور دیگر کئی ممالک میں بھی مصوری و خطاطی کی تمام اقسام میں مصورانہ خطاطی سب سے مقبول صنف ہے۔ امریکا و یورپ میں اسے "مقدس آرٹ" (Sacred Art) کہا جاتا ہے۔ بعض نقاد اس فن کو "بولتا آرٹ" (Speaking Art) بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ مصورانہ خطاطی خود بول کر دیکھنے والے کو اپنی سمت متوجہ کرتی ہے۔ قرآن پاک کے بارے میں بھی تو قرآن میں لکھا ہے 'ھٰذا بیان للناس'۔"

پی ٹی وی کے ایک مذاکرے میں اسلم کمال کے

علاوہ نیشنل کالج آف آرٹس اور کالج آف آرٹ ڈیزائن پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ شامل تھے۔ مذاکرے میں کئی طلبہ و طالبات بھی شریک تھے۔ جب سوال جواب کا مرحلہ آیا، تو ایک طالبہ نے نامور مصورہ سے دریافت کیا "میڈم! اگر آپ اپنی بنائی تصویر پہ اپنا نام نہ لکھیں تو کیا لوگ پہچان جائیں گے کہ یہ آپ کی تخلیق ہے؟"

مصورہ نے کچھ توقف کے بعد نفی میں سر ہلا دیا۔ طالبہ نے پھر یہی سوال دیگر مصوروں سے کیا۔ وہ بھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔ آخر وہ لڑکی کہنے لگی: "اس مذاکرے میں اسلم کمال صاحب بھی شریک ہیں۔ جب وہ کوئی سرورق بنائیں تو صاف پہچانا جاتا ہے کہ یہ ان کی تخلیق ہے۔ اسی طرح وہ خطاطی کا نمونہ بنائیں تو وہ خود بولتا ہے کہ کس کی انگلیوں کا اعجاز و کرشمہ ہے۔"

اب طیب قریشی جاننا چاہتے تھے کہ مصورانہ خطاطی پر مبنی ایک عمدہ تصویر کیا مالیت رکھتی ہے؟ اسلم صاحب مسکراتے ہوئے بولے "بھائی! ہمارے ملک میں دو نمبر چیزوں کا خاصا رواج ہو چکا۔ مصوری اور خطاطی بھی اس وبا سے بچ نہ سکیں۔ ویسے ایک فن پارے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ خریدنے والے پر منحصر ہے کہ کیا وہ قدر شناس ہے؟ تب وہ ایک لاکھ روپے میں بھی فن پارہ خرید لے گا۔ قدر شناس نہ ہوا تو اسے تصویر دو روپے میں بھی مہنگی لگے گی۔"

تاہم یہ سچ ہے کہ مصورانہ خطاطی عوام و خواص میں بہت مقبول ہو چکی۔ اسلم صاحب کے بقول "وجہ یہ ہے کہ مصورانہ خطاطی کا خوبصورت نمونہ نہ صرف کمرا سجا دیتا بلکہ باطنی پیغام بھی دیتا ہے۔" اسی لیے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے 1976ء میں مصورانہ خطاطی کی تصاویر پر مشتمل پہلا کیلنڈر شائع کیا، تو وہ بہت مقبول ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیلنڈر تھا۔ اور اس میں شامل سبھی تخلیقات اسلم صاحب کے موقلم کا نتیجہ تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ بظاہر تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے لوگ بھی تصاویر پرکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جبکہ جنھیں ناخواندہ اور مادہ پرست سمجھا جاتا ہے، وہ دوسروں سے بڑھ کر خطاطی و مصوری کے قدر شناس نکلتے ہیں۔ اس ضمن میں اسلم صاحب نے ایک پرلطف واقعہ سنایا:

"1979ء میں پی آئی اے کی تنظیم 'پیاک' نے تصاویر کی نمائش لگائی۔ اس میں میری بھی تصویریں رکھی گئیں۔ جب میں کراچی پہنچا تو پی آئی اے کے سربراہ انور نقال نے میرا شاندار استقبال کیا۔ مجھے لنچ کرایا اور مرسڈیز میں ادھر اُدھر گھمایا پھرایا۔

"میں اس آؤ بھگت سے بہت خوش ہوا۔ تب تک مجھے وحدت کالونی میں سرکاری کوارٹر چھوڑنے کا عدالتی حکم مل چکا تھا۔ اب میری خواہش تھی کہ اپنے خریدے گئے پلاٹ پہ مکان تعمیر کر لوں۔ مجھے ایک لاکھ روپے کی

ضرورت تھی۔ سوچا تھا کہ کچھ رقم دوستوں سے پکڑوں گا' بقیہ پیسے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے بطور قرضہ مل جائیں گے۔ یوں سر چھپانے کا آشیانہ بن جاتا۔

"پہلے میں پی آئی اے کی پذیرائی سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری تمام تصاویر خرید لیں گے۔ ہر تصویر کی قیمت دس ہزار روپے تھی۔ لیکن نمائش کے آخری دن افشا ہوا کہ الو، جمال صاحب میری صرف ایک تصویر خریدیں گے۔ یہ سن کر میرے خواب ہی نہیں ٹوٹے' گھر بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔

"پی آئی اے کے کمرشل سیکرٹری مجھے کہنے لگے: فٹ بال کو ٹھڈے مارنے والے ان سے لاکھوں روپے لے اڑتے ہیں۔ مگر یہ آرٹ اینڈ کلچر کی کوئی خدمت کرنے کو تیار نہیں۔ میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایسا کیجیے اپنی تصویر کے بل پہ پچاس ہزار روپے لکھ دیں' میں منظور کرا لوں گا۔

"لیکن میں نے یہ ڈنڈی مارنے سے معذرت کر لی اور کہا بھائی! میں ساری عمر چالیس ہزار روپے کا بوجھ کیسے اٹھاؤں گا؟ میں واپس اپنے ہوٹل چلا آیا۔ میرے کمرے میں لیٹر پیڈ رکھا تھا۔ میں نے ایک ورق پر لکھا

"میں اپنی یہ تصویر پی آئی اے کو عطیہ کرتا ہوں۔ اس کی کوئی قیمت وصول نہ کی جائے۔" یہ ورق میں نے صبح کمرشل سیکرٹری کو بھجوایا اور واپس لاہور آ گیا۔

"ان دنوں میں شاکر علی میوزیم کا انچارج تھا۔ اگلے دن جیسے ہی دفتر پہنچا' کمرشل سیکرٹری کا فون آ گیا۔ پہلے اس نے کہا آپ یقیناً کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔ پھر یہ خوش خبری سنائی کہ محمد احمد نامی ایک صاحب نے نمائش دیکھی' تو انھیں آپ کی تصاویر بہت پسند آئیں۔ انھوں نے وہ ساری خرید لی ہیں۔

"محمد احمد نے پھر مجھے اپنے خرچ پر کراچی بلوایا۔ وہ ایک امیر تاجر تھے۔ انھوں نے مجھے بہت عزت بخشی۔ یوں ایک در بند ہوا تو اللہ تعالیٰ نے دوسرا کھول دیا۔ مکان کی تعمیر کے واسطے مجھے رقم مل گئی۔"

یہ داستان ابھی تمام نہیں ہوئی۔ 1981ء میں جنوبی ایشیا میں یونیسکو کے نمائندے ڈائرکٹر نیویارک آرٹس کونسل کے ساتھ اسلم صاحب سے ملنے آئے۔ انکشاف ہوا کہ یونیسکو نئی صدی ہجری کے موقع پر مسلمانوں کی خوشنودی کے لیے ایک تہنیتی کارڈ (Greeting Card) چھاپ رہا ہے۔ ادارہ اس کارڈ پہ کوئی موزوں تصویر شائع کرنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں اسی تصویر کی تلاش میں پاکستان چلے آئے۔

کراچی ہوائی اڈے کے لاؤنج میں مختلف مصوروں کی تصاویر دیواروں پر ٹنگی تھیں۔ جب وہ اسلم صاحب کی مصورانہ خطاطی (لاالٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین) تک پہنچے تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ انھوں نے اب تک تقریباً تمام پاکستانی تصاویر مغربی مصوروں کی نقالی میں ہی دیکھی تھیں لیکن مصورانہ خطاطی کی یہ تخلیق فن کا انوکھا نمونہ تھا۔ سو انھوں نے تخلیق کار کا پتا دریافت کیا اور پوچھتے پاچھتے اسلم کمال کے گھر پہنچ گئے۔ یوں ان کے کمال فن کا ایک نمونہ یونیسیف کے تہنیتی کارڈ پر گیارہ زبانوں میں شائع ہوا۔

اس انوکھے واقعے سے عیاں ہے کہ ہوائی اڈوں کے لاؤنجوں میں لگی تصاویر قومی تہذیب و ثقافت کی بولتی نشانیاں ہیں۔ اگلا سوال بھی اسی موضوع پہ کیا گیا کہ وطن عزیز میں ثقافت کس حال میں ہے؟

اسلم صاحب نے ٹھنڈے پانی سے لب تر کیے اور گمبھیر لہجے میں بولے "آپ وزارت ثقافت کو ایسا ہال

کیجیے جس میں تمام فنون لطیفہ مثلاً مصوری، ادب، موسیقی وغیرہ آتے ہیں۔ یہ یہاں درحقیقت ایک حکومت بلکہ پوری قوم کا "میک اپ روم" ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کے چہرے کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنائے تاکہ اقوام عالم کو چہرہ دلربا نظر آئے۔

"یہ وزارت ثقافت ہی دنیا والوں کو بتاتی ہے کہ پاکستانی قوم کا قومی رنگ، لباس، کھیل، پھول، پرندہ، جانور وغیرہ کون سا ہے۔ اس کا انداز گفتگو کیا ہے۔ آداب مجلس اور نشست و برخاست کیسے ہیں۔

"افسوس کی بات ہے کہ طویل عرصہ پاکستان میں ایسے لوگ وزارت ثقافت کے وزیر بنتے رہے ہیں جنھیں ثقافتی امور کی خبر ہی نہیں تھی۔ کبھی الیکٹرانکس والا آجاتا ہے، کبھی ڈاکٹر کارکن آ جاتا۔ ایسے ہی وزیر ثقافت ایک بار ایوان اقبال میں اقبال گیلری میں میری تخلیقات دیکھنے آئے۔ وہ انھیں دیکھ کر کہنے لگے "آپ پھول اچھے بناتے ہیں۔"

سیاسی بنیادوں پر تقرر کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزارت ثقافت تباہ ہو گئی۔ وہ بحیثیت مسلمان اور پاکستانی ہمارا تشخص نہیں ابھار سکی اور دنیا والے بھی اس سے بے خبر رہے۔ ظاہر ہے قوم کا جو میک اپ ہوگا، وہی دوسروں کو نظر آئے گا۔ اب یہ وزارت ثقافت کے کارپردازوں پر منحصر ہے کہ وہ پاکستان کا کیسا چہرہ اقوام عالم کو دکھانا چاہتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ وزارت ثقافت کا وزیر تعلیم یافتہ اور ادب سے وافر رغبت رکھتا ہو۔ وہ قوم کے دکھ درد اور خوشیوں کو سمجھتا ہو۔ ایسا وزیر ہی ہماری حقیقی تہذیب و ثقافت کو ترقی و تحفظ دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ناروے کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہاں وزارت ثقافت کا شمار طاقتور وزارتوں میں ہوتا ہے۔ ناروے میں فنون لطیفہ کی حفاظت و ترویج اسی کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ کام وزارت ثقافت محنت و دیانت داری سے انجام دیتی ہے۔ ناروے میں آپ کسی کے پیچھے کھڑے ہو کر اخبار نہیں پڑھ سکتے۔ اسی طرح کوئی دوسروں سے کتاب پڑھنے کے لیے مانگے تو لوگ برا مناتے ہیں۔ مقامی روایت یہ ہے کہ اخبار اور کتاب خود خرید کر پڑھیے۔

"اسی طرح ناروے میں جو ادیب، شاعر، سائنس دان، مصور یا سنگ تراش خود کو منوالے، عوام و خواص اس کی از حد عزت کرتے ہیں۔ اور ان کے ناموں پر پارکوں، سڑکوں، اسکولوں، ہسپتالوں اور ریلوے اسٹیشنوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ اور ان کے اعزاز میں جگہ جگہ مجسمے نصب کیے جاتے ہیں۔

"پاکستان میں تو فنون لطیفہ سے منسلک شخصیات کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ناروے میں سرکاری و عوامی سطح پر ہر ممکن طریقے سے انھیں پذیرائی ملتی ہے۔ مثلاً وہاں یہ رواج ہے کہ لائبریری سے کسی زندہ ادیب کی کتاب جاری ہو تو اسے رائلٹی ملے گی۔ وجہ یہی کہ نارویجین اپنے فنکاروں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔"

شرافت کی نشانی

مانچسٹر میں ایک ٹیلی ویژن نے اسلم کمال صاحب کا انٹرویو کیا۔ اس کے اشتہار کے طور پر جو فکر چلتا رہا وہ یہ تھا: ”اسلم کمال ایک ایسا مصور ہے جو نشہ تو در کنار سگریٹ نوشی بھی نہیں کرتا۔“

اسلم کمال صاحب نے عام فہم انداز میں شگفتہ پر اتنی سیر حاصل گفتگو کی کہ محفل میں بیٹھے بھی لوگ اس شعبہ زندگی کی باریکیوں سے واقف ہو گئے۔ آپ نے اقبال اور فیض وطن عزیز کے دو بڑے شاعروں کی شاعری کو مصور کر رکھا ہے۔ ان سے اگلا سوال یہ ہوا کہ آپ نے دونوں شعرا کو موازنہ کرنے پر کیسا پایا؟

اسلم صاحب نے کچھ لمحے توقف کیا اور پھر کہنے لگے ”اقبال اور فیض دونوں نظریاتی شاعر ہیں۔ دونوں ایک شہر میں پیدا ہوئے۔ ملتے جلتے ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ اساتذہ بھی کم و بیش وہی ملے۔ تاہم دونوں شعرا کی منزل کچھ مختلف رہی۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں سیالکوٹ کے ہیں۔ اور ان کی شاعری کو جس نے مصور کیا وہ بھی سیالکوٹ کا ہے۔

طیب صاحب نے پھر اگلا سوال کر ڈالا: بھارتی مصور ایف ایم حسین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اسلم صاحب مسکرا کر بھارتیوں کے ایسے طرز فکر کی بابت بتانے لگے جس سے کم ہی پاکستانی واقف ہیں: ”بھارتی حکومت اور طبقہ اشرافیہ اپنی سیکولر پسندی ثابت کرنے کی خاطر دوسرے تیسرے درجے کے مسلمانوں کو نوازتا رہتا ہے۔ معاف کیجیے ایف ایم حسین بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ میں ان سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ ”ایف ایم حسین خطاط تھے اور مصور بھی لیکن بھارتی اشرافیہ نے انھیں بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ جبکہ وہ حقیقی مسلمان جوہر قابل کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مثلاً دلیپ کمار پہ یہ الزام لگا کہ وہ پاکستانی ایجنٹ ہیں۔ اب شاہ رخ خان کے بارے میں بھی اُن کا یہی رویہ ہے۔ دراصل جب کوئی بھی مسلمان نمایاں ہو جائے تو وہ حیلے بہانوں سے اس کی تذلیل کرتے ہیں۔“

اسلم صاحب کی دلچسپ اور معلومات افزا گفتگو سنتے ہوئے طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی۔ مگر وقت کی کمی آڑے آ گئی۔ یوں روحانی طور پہ بالیدہ کرنے والی ملاقات اختتام پذیر ہوئی مگر اپنے پیچھے پرلطف یادیں چھوڑ گئی۔

☆☆

خطاطی کی مختصر تاریخ

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں خط حیری مستعمل تھا۔ اسی سے خط کوفی بنایا گیا۔ بعدازاں تیسری صدی ہجری میں بغداد کے ایک نابغہ روزگار خوش نویس ابن مقلہ نے چھے خطوط ... ثلث، نسخ، محقق، ریحان، رقاع اور توقیع ایجاد کیے۔

ان خطوط کی ایجاد کے بعد فن خطاطی نے جنم لیا۔ اب قرآنی آیات، احادیث اور دیگر جملے بڑے خوبصورت انداز میں لکھے جانے لگے۔ جب فن خطاطی مصر، ایران، ترکی، ہندوستان اور اندلس پہنچا تو مقامی رنگ و روپ کی شمولیت نے اُسے مزید نکھار دیا۔

نویں صدی میں ایران کے خوش نویس میر علی تبریزی نے خط نسخ اور قدیم ایرانی خط تعلیق کے امتزاج سے خط نستعلیق ایجاد کیا۔ اسی دوران مختلف خطوط کے ادغام سے نئے خط سامنے آئے جن میں دیوانی، ثلث، شکستہ وغیرہ شامل ہیں۔

خطاطوں نے مساجد، مقابر اور دیگر اسلامی عمارات

میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ان تعمیرات میں فن خطاطی کے دیدہ زیب اور خوبصورت نمونے آج بھی دیکھنے والوں کو مسحور کرتے ہیں۔

فن خطاطی کی تاریخ میں ابن مقلہ، ابن البواب، شاہ محمد نیشاپوری، کمال الدین ہراتی، غیاث الدین اصفہانی اور امانت خان (ہندوستان) کے نام نمایاں ہیں۔ جبکہ ہند و پاکستان میں مصورانہ خطاطی کرنے والوں میں حنیف رامے، صادقین، اسلم کمال اور سردار محمد سرفہرست شمار کیے جاتے ہیں۔

اقبال اکیڈمی کا تنازع

لاہور میں واقع ایوان اقبال اور اقبال اکیڈمی دراصل دو مختلف ادارے ہیں۔ کئی سال پہلے اقبال اکیڈمی کا دفتر کرائے کی کوٹھی میں تھا۔ جب ایوان اقبال تعمیر ہوا تو اکیڈمی والوں کو بھی اس میں جگہ دے دی گئی تاکہ وہ جگہ جگہ بھٹکنے سے نجات پا لیں۔ انہیں ایوان اقبال کی چھٹی منزل مفت دی گئی۔

انصاری برائے ایوان اقبال کے سربراہ مجید نظامی تھے۔ انھوں نے اسلم کمال کو ایوان اقبال کو قابل دید عمارت بنانے کے سلسلے میں ڈائریکٹر پروگرامز بنا دیا۔ اسلم صاحب نے کچھ ہی عرصے میں وہاں تین آرٹ گیلریاں قائم کر دیں۔ ایک کو کلام اقبال کی مصوری سے مزین کیا۔ دوسری گیلری کو علامہ اقبال کی جائے پیدائش سے لے کر آخری آرام گاہ تک فوٹو گرافی سے مزین کیا۔ اور تیسری گیلری میں ان ملکی و غیر ملکی مفکرین کی تصاویر آویزاں کیں جن سے شاعر مشرق متاثر ہوئے۔

یہ کام کرنے کے بعد اسلم صاحب کو اقبال کے درج ذیل شعر کی صورت خیال آیا:

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

چنانچہ انھوں نے افکار تازہ کا سامان پیدا کرنے کی خاطر "بزم اقبال" قائم کر دی۔ یہ تنظیم اسکولوں کے بچوں اور اساتذہ کو بلواتی تھی۔ پھر انھیں علامہ اقبال کے کلام و افکار سے متعلق لیکچر دیے جاتے۔ مدعا یہ تھا کہ پیغام اقبال کو گھر گھر پہنچایا جائے۔

لیکن اس اثنا میں اقبال کے نام لیوا کوشش کرنے لگے کہ وہ ایوان اقبال کا انتظام سنبھال لیں۔ نتیجتاً وہ اسلم صاحب سے کہنے لگے کہ بزم چلانا ان کی ذمے داری نہیں۔ یوں اسلم صاحب کے لیے ایوان اقبال میں آزادی سے کام کرنا مشکل ہو گیا۔ اسی باعث انھوں نے ادارے کو خیرباد کہہ دیا۔

تاہم اسلم صاحب کو مسرت ہے کہ ان کا لگایا پودا اب پھل پھول دے رہا ہے۔ بزم اقبال کی پہلی صدر، پروفیسر فاخرہ شیرازی تھیں۔ انھوں نے کلام اقبال سے متاثر ہو کر اقبالیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ فی الوقت ڈاکٹر نادرہ زیدی تنظیم کی صدر ہیں۔ ◆◆◆

آئیے.....! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

کتابوں کی کہکشاں

ابوالعرفان

کتابوں پر تبصرے کے روایتی کالم سے تھوڑا مختلف

زیرِ تبصرہ پہلی تین کتب نامور مصری صحافی اور مورخ جناب محمد حسین ہیکل کی عربی زبان میں تحریر کردہ ہیں۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے مصنف کا کام اور نام اہلِ علم کے لیے خاص احترام کا حامل ہے۔ جناب محمد حسین ہیکل نے سیرتِ نبوی ﷺ پر بھی ایک شاہکار کتاب "حیاتِ محمد" تصنیف فرمائی جو خاص و عام سے قبولیت کی سند حاصل کر چکی ہے۔

چوتھی کتاب بھی نامور مصری تاریخ داں جناب طٰہٰ حسین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جو عربی زبان و ادب پر اتھارٹی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا چاروں کتب میں خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کی حیات اور کارناموں کا نہایت تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہے۔ خلفائے راشدین کی ذاتی زندگی، علمی و دینی خدمات اور حکومتی طریقہ کار کو مستند تاریخی ماخذات سے لے کر قارئین کے لیے لکھا گیا ہے۔

جناب محمد حسین ہیکل نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "حیاتِ محمد ﷺ" کے بعد جب خلفائے راشدین پر سوانحی کام کرنے کا ارادہ کیا تو ان کی نظر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذاتِ گرامی پر ٹھہر گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تفصیلی سوانح حیات اور ان کی ذات کے شایانِ شان کوئی کام ابھی منظرِ عام پر نہ آیا تھا۔

رسالت مآب ﷺ کی رحلت کے بعد عہدِ صدیقیؓ میں جو واقعات پیش آئے۔ ان سے حضرت صدیق اکبرؓ کی فراست، معاملہ فہمی اور حسنِ بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا دور رشد و ہدایت اور اصلاحِ انسانیت کا تھا اور اس دور میں شریعت نازل ہو رہی تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلسل احکامات نازل ہو رہے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ خلافت نظم و نسق کا عہد تھا اور اس عہد میں سلطنتِ اسلامیہ کے اصول و ضوابط متعین کیے جا رہے تھے اور ریاست کا انتظام و انصرام بہتر کیا جا رہا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عہد ان

دونوں ادوار کی درمیانی کڑی ہے۔ آپؓ کے دورِ خلافت کو فتوحات کے لحاظ سے خاص انفرادیت حاصل ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد مسلمانوں کی امارت حضرت عمرؓ کو اس وقت سونپی گئی جب حضرت ابوبکر صدیقؓ فتنہ ارتداد کا استیصال کر چکے تھے اور اسلامی فوجیں عراق اور شام کی سرحدوں پر ایران اور روم کی طاقتوں سے نبرد آزما تھیں۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو عراق اور شام کلیتاً اسلامی سلطنت کے زیرِ اقتدار آ چکے تھے بلکہ ایران اور مصر پر بھی اسلامی اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی حدود وسیع ہو چکی تھیں۔ دس سال کی مختصر مدت میں 22 لاکھ مربع میل پر اتنی عظیم الشان سلطنت کا قیام بلاشبہ ایک معجزہ ہے۔ یہ معجزہ حضرت عمرؓ کے عہد میں اور ان کی توجہ سے مکمل ہوا۔ جو ان کے ایک عظیم انسان ہونے کا بین ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان پر جب بار بار ان کا نام دہرائی اور ان کی اخلاقی اور ذہنی خوبیوں کا ذکر کرتی ہیں، جس سے ہمارے دل حیرت و احترام کے انتہائی جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی امارت کی ذمہ داریاں شہید مظلوم، داماد رسولؐ، کامل حیا و ایمان حضرت عثمان غنیؓ کے کندھوں پر آئیں۔ جناب محمد حسین ہیکل نے اپنی اس کتاب میں اپنے مخصوص اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت تفصیل سے اس عہد کے معاملات پر قلم اٹھایا ہے جس سے کئی مغالطوں کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

چوتھی کتاب معروف نابینا مصری ادیب، مورخ اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کاوش ہے جس میں خلیفہ رابع حضرت علی المرتضیٰؓ کی حیات مطہرہ کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ان کتب کے تراجم نہایت شستہ اور رواں اردو میں کیے گئے ہیں اور پڑھتے ہوئے کہیں احساس نہیں ہوتا کہ آپ ترجمہ پڑھ رہے ہیں یا طبع زاد تحریر۔ کتب کے آخر میں طلبا اور محقق حضرات کے لیے ماخذات کے حوالہ جات ان کتب کی علمی حیثیت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔

اگرچہ ان کتابوں کے اردو تراجم پہلے بھی ہو چکے ہیں، لیکن زیرِ نظر کتابیں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انھیں کمپیوٹرائزڈ کتابت کے ساتھ بہترین کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ جلد مضبوط اور خوبصورت ہے۔ چاروں کتب کے سرورق نہایت جاذب ہیں۔ اس کے علاوہ ان کتب کے آغاز میں نادر و نایاب تصاویر کو آرٹ پیپر پر چھاپ کر شامل کیا گیا ہے۔ اپنی علمی افادیت اور خوبصورتی کی وجہ سے یہ کتب اس قابل ہیں کہ آپ انھیں نہ صرف اپنی لائبریری کی زینت بنائیں بلکہ احباب کو تحفتاً بھی بھجوائیں تاکہ کتاب کے ساتھ ہمارا ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے بحال ہو سکے۔ بڑھتی عمر کے بچوں اور نوجوانوں کے لیے ان کتب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ یوں نوجوانوں کی تشکیلِ سیرت و کردار کے لیے ان کتب سے بڑھ کر کوئی شے ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتی۔

نام کتاب: حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ
مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: انجم سلطان شہباز
صفحات: 464، قیمت: 780 روپے

نام کتاب: حضرت سیدنا عمر فاروق اعظمؓ
مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: حبیب اشعر دہلوی
صفحات: 770، قیمت: 900 روپے

نام کتاب: حضرت سیدنا عثمان غنیؓ
مصنف: محمد حسین ہیکل، مترجم: پروفیسر حکیم مرزا مظفر بیگ
صفحات: 396، قیمت: 780 روپے

نام کتاب: حضرت سیدنا علی المرتضیٰ
مصنف: ڈاکٹر طٰہٰ حسین، مترجم: انجم سلطان شہباز
صفحات: 435، قیمت: 780 روپے
ناشر: بک کارنر شوروم، جہلم پاکستان

"گلزار"

سپورن سنگھ گلزار نہ صرف عظیم شاعر بلکہ نامور افسانہ نگار، فلمی ہدایت کار، سکرپٹ رائٹر اور مکالمہ نگار بھی ہیں۔ ان کی شاعری دل کو موہ لینے والی ہے۔ یہ نازکی سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ عہد جدید و قدیم کی عکاس بھی ہے۔

زیرنظر کتاب میں گلزار صاحب کی 43 نظمیں، 301 غزلیں، 373 گیت اور 447 تروینی شامل ہیں۔ ان کے کلام میں انسانی زندگی کی فطری جمالیات اور دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری افسانا و کیف سے متصف ہے۔ شاعری کا بڑا حصہ پاک و ہند کی تقسیم سے متعلق ہے۔ چنانچہ غزلیں، نظمیں پڑھتے ہوئے جابجا اجڑے ہوئے گھر، جلی بستیاں، ویران سڑکیں، بے گوروکفن لاشیں، بچھڑے ہوئے بچے، افسردہ، غمگین اور تنہا والدین نظر آتے ہیں۔ درحقیقت گلزار صاحب نے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ابھی وہ اپنے لڑکپن ہی میں تھے کہ انھیں "دینہ" سے ہجرت کر کے "ممبئی" جانا پڑا۔

گلزار صاحب کی شاعری بتاتی ہے کہ ان کے دل کی دھڑکنیں آج بھی "دینہ" سے وابستہ ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

"میں زیرو لائن پر آ کر کھڑا ہوں
میرے پیچھے میری پرچھائیں، آواز دیتی ہے
وہاں جب بستی چھوڑ گئے....
چلے آنا تمھارا گھر یہیں پر ہے
تمھاری جنم بھومی ہے! وطن ہے!!"

☆☆

میں سب سامان لے کر گیا اس پار سرحد کے
میری گردن کسی نے قتل کر کے اس طرف رکھ لی!"

اب شاعری کا دوسرا رخ دیکھیے جس میں پرکشش محبوب ہے۔ اس کی سادگی وخوبصورتی ہے اور سراپا دنیا سے جدا ہے۔ وہ محبوب جس کے لیے آپ نے بے شمار گیت لکھ ڈالے۔ گلزار صاحب کے گیت فلموں کی زینت بنتے چلے آ رہے ہیں۔ جگجیت سنگھ، لتا منگیشکر، راحت فتح علی خان، محمد رفیع، سریش واڈیکر اور آشا بھوسلے جیسے نامور گلوکاروں نے یہ گیت گا کر انھیں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ چند گیتوں کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گی:

"میرا کچھ سامان تمھارے پاس پڑا ہے
وہ بھجوا دو......
میرا وہ سامان لوٹا دو....." (فلم اجازت، گلوکارہ آشا بھوسلے)

نام نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو۔ (فلم خاموشی، گلوکارہ لتا منگیشکر)

کبھی انکھیوں والے، سنا ہے تیری انکھیوں ہے...." (فلم ویر، گلوکار راحت فتح علی خان)

یہ کتاب کی تنویر نے خلوص اور محنت سے مرتب کی ہے۔ کہیں مشکل اردو الفاظ یا انگریزی لفظ آئے تو ان کے معنی اسی صفحے پر موجود ہیں۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔ کاغذ بھی اعلیٰ استعمال ہوا ہے۔

نام کتاب: گلزار، شاعر: سپورن سنگھ گلزار، صفحات: 512، قیمت: 999۔
ملنے کا پتا: بک کارنر، بالمقابل اقبال لائبریری بک اسٹریٹ، جہلم پاکستان۔ تبصرہ نگار: فوزیہ راہو ♦♦♦
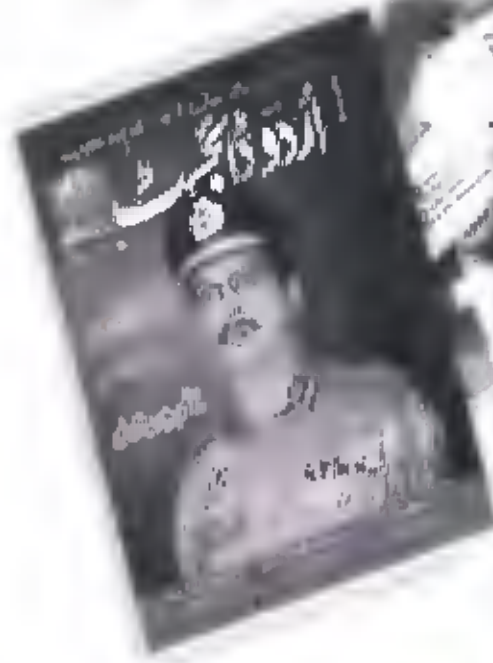
قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

پانچ ہزار روپے کا نوٹ

اردو ڈائجسٹ کے 262 صفحات میں دین و دنیا سے متعلق سب کچھ ہوتا ہے۔ بچے بوڑھے اور مرد و خواتین سب اپنی پسند اور دلچسپی کا مواد اس میں پاتے اور نہال ہوتے ہیں۔ طیب اعجاز قریشی صاحب کا ابتدائی نوٹ مجھے پانچ ہزار روپے کے پاکستانی نوٹ جیسا لگا۔ انھوں نے بہت مفید مشورہ دیا کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے معیاری کتب و رسائل سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔ اگر آپ اردو ڈائجسٹ کے قارئین کو دانا و بینا بنانا چاہتے ہیں اور ان کا تعلق کاغذ اور قلم سے جوڑنا چاہتے ہیں تو ترغیب کے طور پر انعامی خط کا سلسلہ ضرور شروع کریں۔ مئی کے شمارے کے سرورق پر جسونت سنگھ کے بجائے مجید امجد مرحوم کی تصویر اور گوشۂ مجید کا ذکر ہوتا تو دل باغ باغ ہو جاتا۔ محمد الیاس کی تحریر "اندھیر نگری کے جگنو" اور نیلم احمد بشیر کا افسانہ "ماں" بہترین تحریریں ہیں۔ اگر رسالے کے آخر کے صفحات سے اشتہارات کو اندر جگہ دے دی جائے تو ہزاروں قارئین خوش ہو جائیں گے۔

(خواجہ مظہر صدیقی، ملتان)

کردار ساز رسالہ

"اردو ڈائجسٹ" ایک مشن کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نسلوں کا پسندیدہ اور کردار ساز رسالہ ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہماری درخواست پر رسالہ کا اجرا ہماری "پبلک لائبریری" کے لیے کیا۔ اب رسالہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ لائبریری میں آنے والا ہر ممبر پڑھتا اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ آپ کی کتاب اور ادب دوستی اور کردار سازی کے جذبہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(اسٹاف پبلک لائبریری ہری پور)

میرا پسندیدہ اردو ڈائجسٹ

مئی کا خوبصورت تحریروں سے مرصع اردو ڈائجسٹ

زیر مطالعہ ہے۔ معلومات سے بھرپور ہے۔ جناب ذوالفقار چیمہ سے مکمل تعارف ہوا۔ یہ حقیقت اٹل ہے کہ اگر ہمارے یہاں جناب ذوالفقار چیمہ جیسے افسر وافر ہوتے تو آج ہمارے ملک اور معاشرے کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ مجید امجد کا کلام اور سوانح حیات پڑھ کر مکمل تعارف حاصل ہوا ہے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔
(ذاکر حسین ذکی امروہوی، کراچی)

اردو ڈائجسٹ کا اعلیٰ معیار

ہمیں اردو ڈائجسٹ کا بہت انتظار رہتا ہے اور اس مرتبہ یہ تاخیر سے ملا۔ خیر کوئی بات نہیں، ماہ اپریل کا اردو ڈائجسٹ بہت ہی اعلیٰ تھا اور اس میں پڑھنے کو بہت اعلیٰ تحریریں ملیں۔ خاص کر شداد کی جنت اور آخری حکمران کی تمیز بھا بیاری ہیں۔ عالمی دان اور اولیا مقبول جان کا مضمون ان کے علاوہ ایک پولیس رپورٹ گھر بیٹھو کا شکار اور حفاظتی ٹیکے یہ سب بہت ہی اعلیٰ تھا۔ تاہم بھارت میں انتخابی معرکہ جنت قلیم ہو اور سے وابستہ یادیں اور قصے سیاہی اہل حسین کے جناب میاں محمد افضل کی تحریر بے زوال بے سبب نہیں آتا اور شاہ افغانستان کی واپسی بڑے ہی پائے کے مضامین تھے۔

تاہم بو جھیں تو جانیں اور حسن خیال شامل کرنا شاید آپ بھول گئے۔ مشورہ حاضر ہے ضرور جاری رکھیں۔
(محمود منور خان بھلوال۔ سرگودھا)

اردو ڈائجسٹ سے دیرینہ تعلق

اس موقر جریدے کے لیے ایک تجویز سے آپ بھی بھیج رہا ہوں اگر معیاری ہو تو شائع کر دیجیے گا۔ ماشاءاللہ پرچہ بہترین جا رہا ہے میں تو اسے 1962ء سے پڑھ رہا ہوں جب میں لورالائی بلوچستان میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تعلیم کے بعد عملی زندگی برطانیہ (انگلینڈ) میں گزری وہاں بھی اردو ڈائجسٹ سے رابطہ نہیں ٹوٹا۔ بہت سی نیک خواہشات کے ساتھ پورے عملے کو خلوص بھرا سلام۔
(سلطان مسعود احمد بہاولپور)

ایک تجویز

ایک تجویز حاضر خدمت ہے کہ اردو ڈائجسٹ میں آنے والے صغیرہ بانو شیریں و دیگر کے علمی مشوروں اور اذکاروں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی جائے تاکہ ہر آدمی اس سے مستفید ہو سکے۔ رسالے میں حکیم عبدالوحید سلیمانی کے ساتھ صغیرہ بانو شیریں کے اذکاروں کا سلسلہ جاری رکھیے۔ (عاطف بن صادق کوٹ ادو)

پریشانیوں کا حل ذکر الٰہی

میں اردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری اور خریدار ہوں۔ اس میں بڑے اچھے اچھے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ماہ مجھے اردو ڈائجسٹ کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ میری اردو ڈائجسٹ سے وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ جب اس کی قیمت ڈیڑھ روپے تھی میں تب سے اس کا خریدار ہوں۔ بہرحال وقت بدلتا ہے ہر چیز بدل جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے اور ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ ہم ہر لحاظ سے تنزلی کی طرف رواں ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ اور رسول کو بھلا رکھا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ لوگ پریشان ہیں۔ خودکشیاں کرتے ہیں، کاروبار میں پریشان ہیں۔ دھوکہ، فریب غیبت جیسی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ بیمار پڑ گئے تو ڈاکٹروں کو دکھانے اور دوا لینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ یعنی جتنی بھی پریشانیاں ہیں ان سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمیں جس طرح اللہ تعالیٰ کو یاد

کرنا چاہیے ویسے نہیں کرتے۔ ہم مصیبت میں پریشانی میں اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت کریں ہر چیز آپ کے کنٹرول میں آ جائے گی۔

(آغا صادق حسین خان، اربیک مشن)

ناجائز تجاوزات

اردو ڈائجسٹ میرا پسندیدہ جریدہ ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو وقت کا تقاضا اور عام و خاص آدمی کی ضرورت ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ قریشی برادران کو تادیر اس ملک و معاشرے کی خدمت کی توفیق عنایت فرمائے۔ میں اس موقر جریدے کی وساطت سے ایک اہم مسئلے کے جانب صاحبِ اقتدار افسران کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ گلی کوچوں میں مکینوں نے ناجائز تجاوزات کی بھرمار کی ہوئی ہے۔ نفسانفسی کا عجب عالم ہے۔ مجموعی سوچ ناپید ہو چکی اور ہر کوئی اپنا گھر اور اپنی آسائش ہی دیکھتا ہے۔

ہمارے محلے میں ایک بوسیدہ مکان کی بالکونی جو کہ اپنی میعاد پوری کر چکی اور کسی بھی وقت زمین بوس ہو سکتی ہے۔ مکینوں نے اس کے نیچے ایک موٹی لکڑی کی ٹیک لگا کر بالکونی کو سہارا دے رکھا ہے جو کہ کسی بھی وقت جان لیوا حادثے کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ راقم نے ایک دو بار مکینوں کی توجہ اس جانب دلوائی تو انھوں نے ٹال مٹول کر دی۔ پھر کچھ دنوں بعد دیکھا تو لکڑی کی جگہ ڈیڑھ دو فٹ چوڑے اینٹوں کے دو ستون کھڑے تھے جو گلی کی چوڑائی میں کمی اور راہ گیروں کے لیے تنگی کا باعث ہیں۔ مالکان سے کہو تو وہ لڑنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ اسی طرح کے بے شمار مناظر ہر گلی کوچے میں نظر آتے ہیں جو مکینوں کے لیے فائدہ مند پڑوسیوں اور راہ گیروں کے لیے تکلیف کا باعث ہیں۔ لوگوں نے اپنی حدود پھلانگ کر ناجائز تھڑے اور سیڑھیاں بنا رکھی ہیں۔

اسی سے ملتا جلتا یہ مسئلہ بھی درپیش ہے کہ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں لوگوں نے رکشے اور گاڑیاں کھڑی کر رکھی ہیں۔ ایک صاحب تو کسی سرکاری محکمے کی جیپ روزانہ محلے میں لے آتے ہیں۔ وہ ہر وقت راہ گیروں کے لیے تنگی کا باعث ہے اور تو اور ایک صاحب مزدا ٹرک گلی میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ اگر اربابِ اختیار اس جانب توجہ دیں تو راقم نشاندہی کرنے کے لیے حاضر ہے۔

بعض لوگوں نے تھڑوں پر تندور بنا رکھے ہیں اور کوئی باورچی خانہ اور غسل خانہ بنائے بیٹھا ہے۔ بازاروں میں برائلر کا گوشت بیچنے والوں نے مرغیوں کے پنجرے اور سبزی والوں نے چھابڑیاں دکانوں کی حدود سے باہر سجا رکھی ہیں جو اکثر ٹریفک جام ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔

(ارباب محی الدین، لاہور)

نوٹ

شمارہ جون میں شائع مضمون "کھل گئے جنت کے دروازے" میں یہ غلط بیان کیا گیا کہ بھولے سے صحبت کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس بات پر بعض احباب کو وضاحت درکار ہے۔

اس ضمن میں جامعہ اشرفیہ سے سند یافتہ فاضل درس نظامی جناب مفتی مسعود احمد کا کہنا ہے "صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ مسلمانوں کے واسطے بھول چوک پر معافی کی نوید ہے۔ چناں چہ علمائے کرام نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خدانخواستہ انتہائی کم یاب صورت میں کسی جوڑے سے بھول ہو جائے تو روزہ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔"